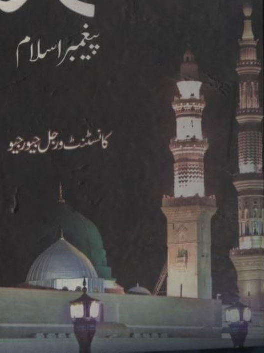
محمد ﷺ

پیغمبر اسلام

کانسٹنٹ ورجل جیورجیو



محمد ﷺ پیغمبر اسلام

کانسٹنٹ ورجل جیورجیو

محمد صلی اللہ علیہ وسلم
پیغمبرِ اسلام

کانسٹنٹ ورجل جیورجیو

ترجمہ

مشتاق حسین میر

برائے ایصال ثواب

والد محترم جناب محمد صدیق مرحوم

والدہ محترمہ ذکیہ بیگم مرحومہ

کانسٹنٹ ورجل جیورجیو

کانسٹنٹ ورجل جیورجیو: (۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء ویلیا البا رومانیہ ۔ ۲۲ جون ۱۹۹۲ء، پیرس، فرانس) ابتدائی زندگی مالڈیویا میں گزری۔ ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ نمبروں کے ساتھ ابتدائی تعلیم مکمل کی، بعد ازاں بخارسٹ یونی ورسٹی اور ہائیڈل برگ یونی ورسٹی سے فلسفے اور الٰہیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

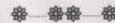
جنرل ایان انٹونیسکو کے دور حکمرانی (۴۳-۱۹۴۲ء) میں رومانیہ کی وزارت خارجہ میں بین الاقوامی اُمور کے ماہر کی حیثیت سے ذمہ داریاں ادا کیں، لیکن جب ۱۹۴۴ء میں روس کی کیمونسٹ فوجیں رومانیہ پر قابض ہو گئیں تو جیورجیو نے جلاوطنی اختیار کر لی اور جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر امریکی افواج نے اسے گرفتار کر لیا، تاہم رہائی کے بعد ۱۹۴۸ء سے فرانس میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۸ء میں اس کا مشہور ناول Ora25 شائع ہوا۔ فرانس میں قیام کے دوران تادمِ آخر مختلف علمی اور مذہبی سرگرمیوں سے وابستگی اختیار کی۔

ایک مشہور مصنف اور صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے جیورجیو کا نام اور مقام اہل مغرب کے ہاں مسلمہ حیثیت رکھتا ہے۔ سچائی کی تلاش میں اس نے سیرت پاک کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا اور ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود جب اس کے دل نے سیرت مطہرہ کی عظمت کو قبول کیا، تو اعتراف حق کے طور پر ایک جذب و مستی میں یہ کتاب تصنیف کی۔

ترتیب

- پیش لفظ ۷
- مقدمہ از علامہ محمد اسد ۹
- بچپن ۱۷
- اصحاب فیل ۲۲
- محمد ﷺ، امین ۳۳
- حلف الفضول: ایک رضا کارانہ تنظیم ۴۱
- ازدواج محمد ﷺ ۴۶
- گھریلو زندگی ۵۳
- غار حرا ۵۹
- آغاز رسالت ۶۸
- سابقین ۷۷
- عربوں کی عادات و روایات ۸۹
- اسلام کی راہ میں پہلی شہید عورت ۹۶
- عمر بن الخطاب کا قبول اسلام ۱۰۹
- مسلمانوں کی ہجرت اوّل ۱۲۲
- شعب ابی طالب ۱۳۳
- معراج کی علمی توضیح کیا ہے؟ ۱۴۵
- ایمان لانے والی مخلوق جو ظاہر نہ ہوئی ۱۵۵
- اسلام میں 'اُمت' کا مفہوم ۱۶۳
- ہجرت: تاریخ اسلام کا ایک فیصلہ کن واقعہ ۱۷۰
- محمد ﷺ کی عظیم ترین فداکاری ۱۸۰
- اسلام اور دنیا میں ہجرت کی اہمیت ۱۸۷
- قبا سے مدینہ میں آمد ۱۹۶
- اسلام کا پہلا اساسی قانون ۲۰۵
- اقتصادی اور تجارتی محاصرے کا جواب ۲۱۷
- عبداللہؓ بن جحش کا حملہ ۲۲۹
- جنگ بدر اور محمد ﷺ کی جنگی تکنیک ۲۳۵
- تاریخ میں پہلی بار جنگی قیدیوں پر رحم کیا گیا ۲۴۹
- مکّہ میں جنگ بدر کے اثرات ۲۵۷
- ایک یہودی گروہ کا مدینہ سے اخراج ۲۶۴
- جنگ اُحد میں مجاہدین اسلام کی شجاعت ۲۷۰
- جنگ اُحد اور فوجی نقطۂ نگاہ ۲۸۹
- پیغمبر اسلام ﷺ کی ازواج مطہرات ۲۹۶
- قریش کی نئی چال ۳۰۲
- جنگ خندق ۳۱۱
- عمرہ کے لیے روانگی ۳۳۰

○ جنگِ خیبر ۳۵۲
○ خالدؓ بن ولید کا اعتراف ۳۶۳
○ رُوم سے جنگ ۳۷۱
○ فتح مکہ - محمد ﷺ جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے ۳۷۸
○ درۂ حنین میں ۳۹۱
○ وفود کی پذیرائی کا سال ۳۹۸
○ رسول اللہ ﷺ مرض الموت میں ۴۱۰
○ ارتحال ۴۱۴



پیش لفظ

اخلاقی شان اور عدل و احسان کی جس روایت سے انسانی تاریخ بنتی اور نمو پاتی ہے، اس روایت کا تعلق ہدایتِ الٰہی اور سلسلۂ نبوت سے مربوط ہے۔ ہر چند کہ انسانوں کی سی شکلیں رکھنے والے لوگ اس کرہ ارضی پر سانس لے رہے ہیں، مگر انھیں جانوروں یا چیر پھاڑ کرنے والے درندوں کی سی خصلت سے الگ کرنے والی چیز انسانی اور اخلاقی حِس ہے۔ اس حس کو پروان چڑھانے اور بندگی کا قرینہ سکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور رسول بھیجے، بلکہ اوّلین انسان حضرت آدم علیہ السلام ہی کو نبی بنا کر بھیجا۔

انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ انھوں نے الٰہی ہدایت سے بار بار بغاوت کی۔ انھی گم کردہ راہ انسانوں کو خالقِ کائنات نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعے پے در پے رہنمائی دی۔ اس رہنمائی کی آخری، مکمل اور موثر شکل، محمد ﷺ کی صورت میں، انسانیت کے تمام ادوار پر سایہ فگن ہے۔ ہزاروں کتب آپؐ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر لکھی گئی ہیں، اور ان میں سے ہر کتاب کا اپنا رنگ، اپنا اُسلوب، اپنا آہنگ اور معلومات کا ذخیرہ ہے، اسی طرح زیرِ نظر کتاب بھی ایک منفرد انداز سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہ کتاب Vie De Mahomet رومانیہ کے دانش ور، ناول نگار اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہر کانسٹنٹ ورجل جیور جیو کے جذب دروں کی روشن دلیل ہے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے ایک مسیحی تھے۔ ۱۹۶۱ء میں اس کتاب کو لیویا لیمور (Livia Lamoure) نے رومانوی زبان سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

۱۹۷۹ء میں گجرات کی ایک علم دوست شخصیت جناب مشتاق حسین میر نے اسے اُردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔ فاضل مترجم نے کتاب کے بارے میں اپنا تاثر ان الفاظ میں

بیان کیا ہے: ''اس کتاب کو کھول کر جیسے ہی آپ مطالعہ کریں گے، آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ کتاب حیات طیبہؐ پر لکھی گئی کتب سے مختلف ہے، اور آپ جتنا آگے بڑھتے جائیں گے، آپ کے احساسات، تاثرات اور خیالات میں انقلاب آتا چلا جائے گا''۔ اس ترجمے کے لیے ہم جناب مشتاق حسین میر مرحوم کے شکرگزار ہیں اور اس کاوش کو بطور صدقہ جاریہ، بارگاہ ایزدی میں پیش ہونے کے لیے دست بہ دعا ہیں۔

اس ترجمے کی دوبارہ اشاعت سے قبل اس کی تسہیل اور پیش کاری کے لیے محترم ذوالقرنین صاحب اور سلیم منصور خالد صاحب نے ذمہ داری نبھائی۔ کتاب کے شایان شان نقشہ جات کی فراہمی کے لیے جناب محسن فارانی نے اپنے ذوق تحقیق سے تعاون کیا۔ میاں اخلاق الرحمٰن صاحب اور ڈاکٹر اظہار ہاشمی صاحب نے کتاب کی اشاعت کے لیے وسائل کی فراہمی کا بنیادی فریضہ ادا کیا۔ اللّٰہ تعالیٰ ان تمام احباب کے جذبۂ حب رسولؐ کو قبول فرمائے۔

دنیائے اسلام کے مایہ ناز اسکالر علامہ محمد اسد کی تحریر کو بطور مقدمہ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے جس میں سنتِ نبویؐ کی اہمیت کا ایک نئے انداز سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس اقتباس کا انتخاب ادارہ ترقی فکر نے کیا ہے۔

ادارۂ ترقی فکر پاکستان کے پیشِ نظر یہ ہے کہ اس نوعیت کی، معلومات افزا اور موثر کتابوں کی مطالعے کے لیے فراہمی کا ایک مربوط نظام تشکیل دیا جائے۔ الحمدللّٰہ اس منزل کی طرف بڑھنے کے لیے یہ پہلی کوشش ہے۔ امید ہے اہل حق مشوروں اور تعاون کی صورت میں مثبت جواب عطا فرمائیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

ڈاکٹر عاصم اللّٰہ بخش
dr.asim@yussra.com
042-35170120

سنت پر عمل، کامیابی کا راستہ

محمد اسد

میرے مطالعے اور علم کی حد تک رسول کریم ﷺ کی سنتِ مبارکہ کی اتباع کے کم از کم تین مختلف مقاصد یہ ہیں:

□ پہلا مقصد یہ ہے کہ فرد کی باضابطہ تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ وہ ہمہ وقت شعور اور بیداری کی حالت میں رہے اور ضبطِ نفس کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے۔

انسان کی روحانی ترقی کے نقطۂ نظر سے الل ٹپ سرزد ہونے والے افعال اور ان افعال سے جنم لینے والی عادات اُن رکاوٹوں کی مانند ہیں، جو رکاوٹوں والی دوڑ میں شریک گھوڑوں کی راہ میں کھڑی کی جاتی ہیں۔ یہ امر ضروری ہے کہ ایسے افعال اور عادات کو کم سے کم کیا جائے، جو طبیعت کے روحانی ارتکاز کو منتشر کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہم جو کچھ بھی کریں، وہ ہمارے اپنے ارادے اور ایک بہترین ضابطۂ اخلاق کے تابع ہو۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمہ وقت اپنی ذات کا مشاہدہ و محاسبہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اللّٰہ کا ذکر اور اس کی عبادت محاسبۂ نفس کا ذریعہ ہیں، جن سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اُعْبُدْ رَبَّکَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ [بخاری] ''اللّٰہ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو''۔

ایک مسلمان کے لیے ضبط نفس کی ضرورت بیان کرتے ہوئے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ کی یہ نصیحت قابل توجہ ہے:

حَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا ''تم خود اپنا محاسبہ کرو، قبل اس سے کہ تمھارا محاسبہ کیا جائے۔''

حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا اسلامی تصور صرف مذہبی فرائض تک محدود نہیں بلکہ فی الحقیقت

وہ ساری انسانی زندگی کو محیط ہے اور اس کا ہدف ہمارے روحانی وجود کو ہمارے مادی وجود سے جوڑ کر ایک وحدت میں سمونا ہے۔ لہٰذا، ہماری کوششوں کا حتی الامکان ہدف یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی زندگیوں میں سے خود فراموشی کی کیفیت اور ایسے عوامل کو جڑ سے اکھاڑ دیں جو انسان کے روحانی و مادی وجود میں یک جہتی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ مشاہدہ نفس اس راہ میں پہلا قدم ہے...... یہ وہ انتہائی یقینی طریقہ ہے جس کی مدد سے فرد اپنے نفس کے مشاہدے اور احتساب کی تربیت کر سکتا ہے اور اپنی عادات اور اپنی روزمرہ زندگی کے بظاہر غیر اہم افعال کو اپنے شعور کے تابع کر سکتا ہے۔ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں اور بظاہر غیر اہم افعال اور عادات ذہنی تربیت کے سیاق و سباق میں فی الحقیقت ہماری زندگی کے بڑے کاموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی باتیں اور عظیم کام اپنی بڑائی کی وجہ سے ہمیشہ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، لہٰذا وہ کم و بیش ہمیشہ ہمارے شعور میں رہتے ہیں۔ لیکن چھوٹی چھوٹی باتیں بآسانی نظر انداز ہو جاتی ہیں اور ہمارے کنٹرول سے بچ نکلتی ہیں، حالانکہ فی الحقیقت یہ کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، اور ان کی مدد سے ہم ضبط نفس کی صلاحیتوں کو کہیں زیادہ نتیجہ خیز اور اثر انگیز بنا سکتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بات بجائے خود اہم نہ ہو کہ کس ہاتھ کے ساتھ کھانا کھایا جانا چاہیے یا یہ کہ داڑھی کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن نفسیاتی اعتبار سے یہ بات انتہائی اہم ہے کہ زندگی کے معاملات کو محض الل ٹپ عادت کے طور پر نہیں، بلکہ باقاعدہ ارادے کے تحت انجام دیا جائے۔ اس لیے کہ اس طرح ہم اپنے آپ کو محاسبہ نفس اور اخلاقی پابندیوں پر عمل کرنے کے لیے تیار رکھ سکتے ہیں۔ بظاہر تصور کیا جائے تو یہ کوئی آسان کام دکھائی نہیں دیتا۔ ذہنی طور پر ست ہونا، جسمانی طور پر ست ہونے سے زیادہ نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ ایک ایسے شخص کو لمبی سیر کے لیے لے جائیں، جو اکثر بیٹھے رہنے کا عادی ہو، تو وہ جلد ہی تھک جائے گا اور پیدل چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔ لیکن اس کے برعکس وہ شخص نہیں تھکے گا جو عمر بھر پیدل چلنے کا عادی رہا ہو۔ اس کے لیے یہ سیر تھکن کا باعث نہیں ہوگی اور وہ اسے

ایک خوش گوار جسمانی ورزش محسوس کرے گا۔ اس سے یہ حکمت اور زندگی کی رمز مزید واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کے دائرے میں انسانی زندگی کے قریباً ہر پہلو کو کس لیے شامل رکھا گیا ہے۔ اگر ہم سے مسلسل اپنے تمام اعمال اور خطاؤں کو جانچنے پرکھنے کا تقاضا کیا جاتا رہے تو ہماری محاسبۂ نفس کی استعداد بھی مسلسل بڑھتی رہے گی، اور ایک خاص مدت کے بعد ہماری فطرت ثانیہ بن جائے گی۔ جب تک یہ تربیت جاری رہے گی، ہمارا اخلاقی تساہل بھی کم سے کم تر ہوتا چلا جائے گا۔

لفظ تربیت (training) کے استعمال سے قدرتی طور پر یہ مراد ہے کہ اس کا نتیجہ تربیتی عمل کے مقصد پر منحصر ہوگا۔ اگر سنت پر عمل زوال پذیر ہو کر محض حرکات و سکنات کا ایک معمول بن جائے تو اس کی تعلیمی و تربیتی قدر و قیمت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کا طرز عمل بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ جب رسول رحمت ﷺ کے صحابہؓ اور ان کے بعد آنے والی نسلوں نے اپنی زندگی کے ہر معاملے کو اپنے آقا کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی تو انھوں نے مکمل فہم و شعور کے ساتھ، ہدایت پر مبنی ہر اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، جو روح قرآن کے مطابق ان کی زندگیوں کی تشکیل میں معاون ہو سکتا تھا۔ اسی شعور اور ارادے کی بدولت وہ اتباع سنت سے پوری طرح فیض یاب ہو سکے۔ اگر بعد کے زمانوں میں آنے والے مسلمان ان نفسیاتی امکانات سے بھر پور فائدہ نہ اُٹھا سکے، جن کا دروازہ کھلتا ہی پیروی سنت سے ہے تو یہ نعوذ باللہ سنت کی ''خامی'' نہیں تھی۔

اس پورے گذشتہ عہد میں، مسلمانوں کے انحطاط اور فروگذاشت کا ایک سبب کسی نہ کسی حد تک تصوف بھی ثابت ہوا ہے، جو انسان کی فعال توانائیوں کو غیر اہم قرار دیتا ہے اور ان توانائیوں پر زیادہ زور دیتا ہے جو محض تاثرات و تصورات کے اِدراک میں معاون ہو سکتی ہیں۔ چونکہ سنت نبویؐ پر عمل اسلام کے ابتدائی ایام ہی سے اسلامی مذہبی زندگی کا حصہ بن چکا تھا، اس لیے دور اوّل سے متصل زمانے میں روبہ تشکیل صوفی ازم دین کی اس بنیاد کو زائل کرنے میں کامیاب تو نہ ہو سکا، لیکن وہ اس کی فعال قوت کا اثر کسی حد تک کم کرنے میں ضرور

کامیاب رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ صوفیوں کے نقطۂ نظر سے سنت ایک ایسی مجرد علامت بن کر رہ گئی، جس کی اہمیت نظریاتی و تصوراتی تو تھی، مگر عملی نہیں تھی۔ وہ اسے محض روحانی اور صوفیانہ تناظر میں دیکھتے تھے۔ دوسری جانب مذہبی علما اور فقہا کے نزدیک اسلام محض ایک فقہی یا قانونی نظام تھا۔

نتیجتاً عامۃ المسلمین کے لیے سنت اپنے حقیقی معانی کھو چکی تھی۔ لیکن اس بات کے باوجود کہ مسلمان قرآنی تعلیمات سے استفادہ کرنے اور سنت نبویؐ کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کی تعبیر اور ان کی تفہیم کے عمل سے محروم ہو چکے تھے، تعلیمات نبوی کے سیاق و سباق اور ان کی تعبیر کے پیچھے کارفرما تصور میں قطعاً کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی پوری طرح قابل اطلاق ہیں۔ چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ ایک بار پھر سنتِ نبوی کو عملی زندگی کا حصہ نہ بنایا جا سکے۔

دوسری جانب ناقدین کہتے ہیں: سنت کا مقصد محض علامتوں پہ اصرار، ظواہر پرستی اور رسوم کے پابند زاہد خشک تیار کرنا ہے۔ ان نقادوں [اور سنت کے منکروں] کا یہ تبصرہ جھوٹ پر مبنی طعن ہے۔ فی الحقیقت اتباع سنت کا مقصد باشعور، صاحب عزیمت اور حوصلہ مند مردان کار تیار کرنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ و صحابیاتؓ اسی طرح کے انسان تھے۔ وہ ہمہ دم متحرک، قلب بیدار کے مالک اور ہر قدم احساس ذمہ داری سے اٹھانے والے لوگ تھے۔ کردار کی یہی وہ خوبیاں ہیں، جن میں ان کی کرشماتی صلاحیت و استعداد کا راز پوشیدہ ہے اور انھی خوبیوں کی بدولت انہوں نے اپنی انسانیت ساز تاریخی کامیابیوں سے دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ بلاشبہ اتباع سنت ہی کا یہ اولین اور منفرد پہلو ہے۔

☐ اس کا دوسرا مقصد اس کی معاشرتی اہمیت و افادیت ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بالعموم معاشرتی کشمکش ایک دوسرے کے افعال و عزائم کے بارے میں غلط فہمیوں سے جنم لیتی ہے۔ معاشرے کے افراد کا بے شمار مزاجوں اور ذہنی رجحانات میں تقسیم ہونا ایسی غلط فہمیوں کا باعث بنتا ہے۔ مختلف مزاجوں سے مختلف عادات اور رویے پروان چڑھتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ پختہ تر ہو جاتے اور پھر وہ مختلف افراد کے درمیان دیوار بن کر

حائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے برعکس معاشرہ ایک ہی جیسی اقدار پر مبنی عادات کا حامل رہے تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ افراد ایک دوسرے کے ہمدرد و غم خوار ہوں گے اور ذہنی طور پر ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ لہٰذا اسلام، جو معاشرے اور فرد دونوں کی یکساں بھلائی اور بہبود کا خواہاں ہے، اس نکتے پر زور دیتا ہے کہ معاشرے میں شامل افراد کو منظم انداز میں یکساں عادات اور مجلسی آداب کی تربیت دی جائے، خواہ ان کا معاشرتی و معاشی مرتبہ ایک دوسرے سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

لیکن رسول کریم ﷺ سنت کی پیروی اس سے بڑھ کر معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرتی ہے۔ یہ معاشرے کو باہم مربوط اور مستحکم بناتی ہے اور ایسی باہمی منافرتوں کا سد باب کرتی ہے جیسی منافرتیں مغربی معاشرے میں 'معاشرتی سوالات و اعتراضات' کے نام پر پیدا کی گئیں، اور جن کی وجہ سے مغربی معاشرہ، فکر، نظر اور عمل کے بہت بڑے تضاد و فساد کا شکار ہوا۔ ایسے معاشرتی سوالات اس وقت سر اٹھاتے ہیں جب یہ محسوس کیا جانے لگے کہ بعض ادارے، روایات او ررسم و رواج بے بنیاد، خام اور ناقص ہیں، لہٰذا ان پر تنقید اور 'مثبت' تبدیلیوں کی اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن اہل مغرب کے اس المیے کے برعکس جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ اپنے آپ کو احکام قرآن کا پابند اور اس پابندی کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کے احکام کا پابند سمجھتے ہیں۔

مسلم معاشرے کی ظاہری شکل و صورت کے برقرار رہنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنے معاشرے کو تشکیل دینے والے عوامل کو الہامی اور ابدی سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ عقیدہ قائم ہے معاشرتی تشکیل کے بنیادی عوامل کو تبدیل کرنے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کی کوئی خواہش سر اٹھائے گی۔ انھی حقائق کی روشنی میں ہم قرآن کریم کے اس حکم کی حکمت اور منشا سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو 'بنیانِ مرصوص' یعنی سیسہ پلائی دیوار کی طرح متحد ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس اصول کا اطلاق اپنی اجتماعی زندگی پر کریں تو معلوم ہوگا کہ معاشرے کو ذیلی مسائل اور جزوی 'اصلاحات' کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں

کہ ان کی جو بھی قدر و قیمت ہے وہ محض وقتی و عارضی ہے۔ اسلامی معاشرے کو فکری و طبقاتی کشمکش کے الجھاؤ سے نکل کر قانون الٰہی اور اللہ کے آخری نبی ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے مادی و فکری مسائل کے حل کے لیے توانائیاں بروئے کار لانا چاہییں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے فرد کے روحانی ارتقا کے لیے کوششوں کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ یہی اسلامی معاشرتی تنظیم کا حقیقی نصب العین ہے۔

□ آیئے، اب اتباع سنت کے تیسرے پہلو کا جائزہ لیتے اور دیکھتے ہیں کہ اس پر پابندی سے عمل کرنا کتنا ضروری ہے۔ اس نظام حیات میں، ہماری روزمرہ زندگی کی متعدد جزئیات نبی کریم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر مبنی ہیں۔ ہم جو کچھ بھی کریں، ہمیں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ اس معاملے میں نبی کریم ﷺ کا عمل کیا تھا یا انھوں نے اس بارے میں کیا فرمایا۔ اور یوں بنی نوع انسان کی عظیم ترین شخصیت ہماری روزمرہ زندگی کے معمول میں رچ بس جاتی ہے، اس کا روحانی فیض حقیقی زندگی میں جاری و ساری رہتا اور ہمارے وجود کا مستقل اور فعال حصہ بن جاتا ہے۔ اس راستے کو منتخب کرنے کے بعد ہم شعوری طور پر زندگی کے ہر معاملے میں یہ معلوم کرتے رہتے ہیں کہ کس کس معاملے میں نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل کیا تھا۔ یہی ہے وہ صراط مستقیم کہ جس پر چلتے ہوئے ہم بتدریج یہ جان لیتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ صرف حاملِ وحی ہی نہیں بلکہ وہ ساری زندگی کے لیے ہمارے راہبر بھی ہیں۔

اس مرحلے پر ہمیں لازماً یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ: آیا ہمیں حضرت محمد کو دنیا کے دوسرے حکیم و دانا انسانوں کی طرح محض ایک حکیم و دانا انسان تصور کرنا چاہیے یا نوع انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری نبی اور رسول ماننا چاہیے کہ جن کا ہر ہر فعل وحی الٰہی کے تابع تھا؟

اس بارے میں قرآن مجید کا نقطۂ نظر بالکل صاف، واضح اور ہر شک و شبہ سے بالا ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیا اور رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا۔ ان کی رہنمائی اور احکام کے کسی حصے سے منہ موڑنا خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑنے یا اسے کم تر سمجھنے کے مترادف ہوگا۔ مزید برآں سنت پر عمل سے منہ موڑنے یا ایسا خیال رکھنے والا شخص اس سوچ کا حامل قرار

پائے گا کہ اسلام کا پیغام حتمی پیغام نہیں، بلکہ انسانی مسائل کے جو متعدد مختلف حل پیش کیے گئے، ان میں سے وہ ایک حل ہے، اور یہ فیصلہ اب فرد کی صواب دید پر ہے کہ ہم پیغام اسلام کو اختیار کریں یا کسی دوسرے حل کو جو غالباً یکساں طور پر سچا اور کارآمد حل ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ بظاہر ایک آسان راستہ ہے، کیونکہ اس پر چلتے ہوئے اخلاقی اور عملی طور پر کسی حکم یا ہدایت کی پابندی لازم نہیں رہتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ راستہ ہمیں کہیں بھی لے جا سکتا ہے مگر روح اسلام کی طرف ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدہ ۵:۳] آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین (نظام حیات) مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (ہدایت) تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین چن لیا۔

ہم اسلام کو تمام دینی نظاموں کے مقابلے میں برتر سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ ساری کی ساری زندگی کو اپنے دامن رحمت میں سمیٹ لیتا ہے۔ اسلام بیک وقت دنیا و آخرت، روح اور بدن، فرد اور معاشرے کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ وہ نہ صرف انسانی فطرت کے ارفع امکانات کو نگاہ میں رکھتا ہے بلکہ اس میں مضمر مجبوریوں اور کمزوریوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اسلام ہم پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ڈالتا جسے ادا کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔ وہ ہمیں اپنے ذاتی امکانات اور صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانے کے لیے رہنمائی عطا کرتا ہے اور فہم حق اور مشاہدہ حق کے اس اعلیٰ مقام پر لے جاتا ہے جہاں نظریے اور عمل میں کوئی تضاد اور خلیج حائل نہیں رہتی۔

لاریب اسلام دوسرے راستوں کی طرح ایک راستہ نہیں بلکہ واحد راستہ (الصراط المستقیم) ہے اور وہ انسان جس نے اس کی تعلیمات سے ہمیں روشناس کرایا، وہ انسانی تاریخ کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک رہنما نہیں ہے، بلکہ ہادی خاص ہے۔ اس ہادی برحق کے ہر حکم پر عمل کرنا اور ان کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا ہی اسلام ہے۔ اسی لیے محمد الرسول اللہ ﷺ کی سنت سے رُوگردانی یا اسے ترک کرنا فی الواقع حقیقتِ اسلام سے رُوگردانی ہوگا۔

(☆ انگریزی سے ترجمہ: ذوالقرنین)

بچپن

عبداللہ کے بیٹے محمد ﷺ نے بچپن میں بہت دُکھ اُٹھائے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ ماں اور باپ دونوں کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے اور رشتہ داروں کی سرپرستی میں بچپن گزارا۔ آغازِ جوانی میں بھی وہ غم اور مصیبتیں جھیلیں کہ کوئی انسان کیا برداشت کرے گا۔

محمد ﷺ بن عبداللہ نے بچپن کا دور یتیمی میں گزارا اور جوانی انتہائی تنگ دستی میں۔ جس وقت انھوں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی، اُن کے والد محترم عبداللہ بن عبدالمطلب رحلت فرما چکے تھے۔

محمد ﷺ قبیلہ قریش سے تھے۔ یہ قبیلہ مکّہ میں بہت احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کی والدہ اپنی تنگ دستی اور بیوگی کے باعث مجبور ہوئیں کہ محمد ﷺ کو لے کر مدینہ اپنے عزیزوں کے پاس چلی جائیں اور ان کی مدد سے اپنے یتیم بچے کی پرورش کریں۔

مدینہ میں اپنے عزیزوں کے پاس چلے آنے کے باوجود محمد ﷺ کی والدہ جن کا اسم مبارک آمنہ تھا، افسردہ رہتیں۔ وہ خود بھی ابھی جوان تھیں اور اپنے شوہر کی جوانی کی موت کو یاد کر کے غمزدہ رہتیں۔ عموماً تنہا بیٹھی رہتیں اور اشعار گنگنا کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان دنوں عربستان (جزیرہ نمائے عرب) میں اونچے طبقے کی کئی ایک عورتیں شعر کہتی تھیں۔

اسلامی مورخ سیوطی، ابن سعد اور حمید اللہ کہتے ہیں کہ جب محمد ﷺ اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ آئے تو پہلی بار انھوں نے وہاں کا حوض دیکھا، جس میں انھیں اپنے بدن کا عکس دکھائی دیا۔ یہ واقعہ ان کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہا۔ مکّہ میں پانی کم تھا۔ وہاں اسے اس طرح ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گرمیوں میں بچے اُس میں نہا سکیں، مگر مدینہ میں پانی کے تالاب تھے اور بچے اُن میں نہایا کرتے اور احساسِ خنکی سے لطف اندوز ہوتے۔ محمد ﷺ پہلی بار مدینہ میں

بچوں کے ساتھ تالاب میں نہائے۔ بی بی آمنہ کے رشتہ داروں نے مدینہ آنے پر اُن ماں بیٹے کی مدد کی۔ مگر افسوس کہ مدینہ میں آئے ابھی تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ بی بی آمنہ اپنے شوہر کے غم میں بیمار پڑ گئیں اور جلد ہی ان کی حالت اتنی دگرگوں ہو گئی کہ سب نے موت کی پرچھائیاں اُن کے چہرے پر دیکھ لیں۔ عربوں میں یہ رسم تھی کہ جب یہ دیکھتے تھے کہ بیمار اب قریب المرگ ہے تو اس کے اردگرد اکٹھے ہو جاتے اور مرنے والے سے مسلسل بات چیت کیے جاتے، تاکہ اس کو آخری وقت تنہائی کا احساس نہ ہو اور وہ کوئی خوف محسوس نہ کرے۔

لوگ بی بی آمنہ کے گرد جمع تھے اور متواتر باتیں کیے جا رہے تھے، تاکہ انھیں وحشتِ مرگ نہ ہو۔ بی بی آمنہ کسی کسی وقت زیرِ لب خودکلامی کرتی تھیں۔ کمسن محمد ﷺ نے جب یہ سب منظر دیکھا اور محسوس کیا کہ اُن کی والدہ کوئی جواب نہیں دے رہیں تو ماں کے سینے سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے کہا: ماں! ماں! آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ مگر تب ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔

رشتہ دار عورتوں نے بی بی آمنہ کی میت کو غسل دیا۔ محمد ﷺ نے دیکھا کہ والدہ کو کفن پہنا دیا گیا ہے اور پھر جنازہ لے جایا گیا اور اُن کے جسدِ خاکی کو قبرستان (ابوا) میں دفن کر دیا گیا۔

قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔ رشتہ دار احباب لوٹے تو دیکھتے ہیں کہ محمد ﷺ اُن کے ساتھ نہیں ہیں۔ فوری واپس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ محمد ﷺ قبر پر بیٹھے ہوئے قدرے بلند آواز میں والدہ کو پکار کر کہہ رہے ہیں: آپ گھر کیوں نہیں چلتیں...... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے؟ محمد ﷺ، ماں اور باپ دونوں کھو چکے تھے اور آپ کا ذہن اس المیہ سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ آپ ایک گوشے میں بیٹھے رہا کرتے، یہاں تک کہ بچے انھیں کھیلنے کی دعوت دیتے تو وہ کہتے: مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں تم سے کھیلنے کی خود میں ہمت نہیں پاتا۔

ماں کی جدائی سے اس قدر غمزدہ تھے کہ کھانا پینا ترک کر دیا تھا۔ عزیز و اقارب دیکھتے کہ یہ بچہ دن بدن لاغر ہوتا جا رہا ہے۔ عبدالمطلب، محمد ﷺ کے دادا تھے۔ وہ مکّہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی عمر اُس وقت ۱۰۸ سال تھی۔ بی بی آمنہ کے عزیزوں نے بچے کو دادا کے پاس مکّہ بھجوا دیا۔ عبدالمطلب نے جس وقت حضرت محمد ﷺ کو دیکھا تو دل میں محبت اس طرح عود کر

آئی کہ انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے حتیٰ کہ دارالندوہ میں بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتے۔

دارالندوہ اُس مجلسِ شوریٰ کو کہتے تھے، جس میں قبائل قریش کے چالیس سال یا اس سے زیادہ عمر کے مردوں کو شمولیت کی اجازت تھی۔ چالیس سال سے کم عمر والوں کو اجازت نہ تھی، مگر عبدالمطلب، محمد ﷺ کو ساتھ لے جایا کرتے۔ ابتدا میں چند افراد نے اعتراض کیا کہ آپ ایک بچے کو اس بڑی مجلس میں کیوں لے آئے ہیں؟ مگر وہ اپنے پوتے کے کچھ اس طرح دیوانے تھے کہ بزرگانِ قریش کو محمد ﷺ کی موجودگی سے صرف نظر کرنا پڑا۔ اب وہ ہر دفعہ دادا کے ساتھ دارالندوہ میں آتے۔ قریش کے سردار انھیں پیار کرتے۔ افسوس کہ دادا عبدالمطلب بھی دو سال بعد ۱۱۰ سال کی عمر میں جدائی کا داغ دے گئے اور محمد ﷺ ایک بار پھر اکیلے رہ گئے۔ اُس وقت پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی عمر ۸ سال تھی۔ اُن کے چچا ابوطالب نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ابوطالب، محمد ﷺ کے چچا کی کنیت تھی۔

عرب، طلوعِ اسلام سے قبل بیٹی سے نفرت کرتے تھے اور جیسا کہ معلوم ہے کہ کئی بدنصیب تو اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اُن کی پرورش کو وہ انتہائی مشکل کام تصور کرتے تھے۔ اس کے برعکس اولادِ نرینہ کے زیادہ ہونے پر بہت خوش ہوتے تھے، بلکہ ہر عرب اس پر فخر کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے نام کی نسبت سے اپنے آپ کو موسوم کرتے، اسے کنیت کہتے تھے۔ مثلاً ابوطالب یعنی طالب کا باپ۔ محمد ﷺ کے چچا کے لڑکے کا نام طالب تھا اور انھوں نے اپنے لڑکے کا نام اپنی طرف منسوب کر لیا تھا۔ خود محمدؐ بن عبداللہ کی کنیت ابوالقاسم تھی کہ آپ ﷺ کے بیٹے کا نام قاسم تھا، جو کہ بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ پیغمبر ﷺ کے چچا ابوطالب بہت شریف انسان تھے مگر ان کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ اس کم سن بچے کی کفالت کر سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ بچہ مجبور ہوا کہ ۸ سال کی عمر میں اپنی گزران کے لیے کام کاج کرے۔

محمد ﷺ بظاہر چچا کی سرپرستی میں تھے، مگر چچا ایک بڑے خاندان کی کفالت کے قابل نہ تھے۔ ان حالات میں جب کہ ان کی عمر کے بچے تمام وقت کھیل کود میں گزارا کرتے تھے، محمد ﷺ مجبور ہوئے کہ اپنا تمام وقت معاش کے حصول میں صرف کریں اور وہ بھی سخت ترین

ذریعہ معاش، یعنی عرب کے گرم ترین ریگ زاروں میں گلہ بانی۔ ان ایامِ طفولیت میں محمد ﷺ کی زندگی جس نہج پر چل نکلی، اسی سے یہ اسباب پیدا ہوئے کہ یہ یتیم بچہ بالآخر خدا کی طرف سے پیغمبری کے لیے چنا جائے۔ وہ جب بھی گرم ریگ زاروں میں اونٹوں کا ریوڑ لے کر جاتے، غور و فکر میں کھو جاتے۔ صحرا بہر حال غور و فکر اور خود میں گم ہونے کا بہترین مقام ہے۔

جب تک انسان عرب کے وسیع صحراؤں خاص کر مشرقی صحرا میں رہائش پذیر نہ ہو، وہ یہ نہیں جان سکتا کہ صحرا کی وسعت و سکوت تفکر کی حس کو کس قدر تیز کرتی ہے اور انسانی سوچ کو کیسی پختگی بخشتی ہے۔

صحرائے عرب کے برگ و گیاہ، یورپی ممالک کے نباتات سے بہت فرق رکھتے ہیں۔ گرم صحراؤں میں کوئی درخت یا پودا زندہ نہیں رہ سکتا، تاوقتیکہ اُس میں نمی کے بجائے عطر نہ ہو حتیٰ کہ عربستان کے خارِ مغیلاں سے بھی بہترین عطر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کے وہ پھول جو خاصیت عطر سے عاری ہیں، اگر عربستان لے جا کر صحرا میں کاشت کر دیے جائیں تو دو یا تین نسلوں کے بعد اُن میں خاصیتِ عطر پیدا ہو جائے گی اور یورپ کے یہ کوتاہ قد پودے صحرائے عرب میں کاشت کے بعد درخت کی طرح تناور ہو جائیں گے۔ اسی طرح صحرائے عرب میں زندگی گزارنے والے لوگ طبعاً دھوکے اور ریا سے دور تھے اور ان کی زندگی کے معمولات میں ان دو خصلتوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔

عرب کے گرم صحراؤں میں اگر ایک شخص ایک عقیدہ اپنا لیتا تھا تو اُس پر عمل کرنا خود پر لازم کر لیتا تھا۔ انسانی طبیعت میں تضاد اور منافقت اُس وقت شروع ہوئی، جب بڑے بڑے مذاہب صحرا کی حدود سے باہر نکل کر ارد گرد کی مملکتوں میں جو ریگستانی نہیں تھیں، پھیل گئے۔ اُس وقت جن لوگوں نے صحرا کی وسعتوں میں اپنے مذاہب کا ادراک کیا تھا، انھوں نے سخت گیری کی جس کے ردِعمل میں کئی قسم کے فرقے وجود میں آئے۔ بہر طور پیغمبرِ اسلام ۸ سال کی عمر میں مجبور ہوئے کہ صحرا میں گلہ بانی کریں۔ وہ منہ اندھیرے شہر سے نکل جاتے، شام تک تنہا صحرا میں رہتے اور اپنی نگاہیں لامحدود آسمان کی پہنائیوں میں اور وسیع اُفق پر گاڑ

دیتے اور اس سے پہلے کہ آفتاب غروب ہو، گلہ آبادی میں لے آتے اور چچا ابو طالب کے گھر میں جا کر سو رہتے۔

یہ ایک مسلمہ اُصول ہے کہ یتیم بچے دوسرے بچوں کی نسبت عقلی اور ذہنی طور پر جلد ہی بالغ ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی ان سے پیار اور محبت کا اظہار نہ بھی کرے تو بھی اُن کے چہروں پر ملال نہیں آتا۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ یتیم کو گلے لگائے اور اس کا منہ چومے یا اسے لباس اور جوتا خرید کر دے۔

یہ فطری اندازِ تربیت تھا کہ وہ بچہ جس کی نہ ماں ہو نہ باپ، ۸ سال کی عمر میں مجبور ہو جائے کہ خود کما کر روٹی کھائے اور یہ جانتا ہو کہ کسی پر تکیہ نہیں کرنا اور جو بھی مشکلات ہیں اُن کا خود ہی سامنا کرنا ہے۔ بہت زیادہ مشکلات، تنہائی اور احساسِ ذمہ داری نے محمد ﷺ کو قبل از وقت متحمل مزاج اور متین بنا دیا۔



اصحابِ فیل

محمد ﷺ، قبیلۂ قریش سے تھے اور قریش دس قبیلوں میں منقسم تھے ان دس قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ داخلی اُمور میں آزاد تھا۔ کسی دوسرے قبیلے کے داخلی اُمور میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ قریشی قبائل میں سے ایک کا نام بنو ہاشم تھا۔ محمد ﷺ کے دادا عبد المطلب اُس کے رئیس تھے اور مکّہ میں رہتے تھے۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مکّہ کا رقبہ ۲۰۰ مربع کلومیٹر تھا۔ وہاں کوئی زراعت نہ تھی جب کہ ایک درخت بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ اہلِ مکّہ کی معاش کے دو ذرائع تھے: ایک تجارت اور دوسرے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کی پرورش۔ ان ذرائع معاش میں سے اونٹ پالنے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اونٹوں کی پرورش نہ صرف اقتصادی حیثیت کی مظہر تھی بلکہ قریش کے ان دس قبیلوں اور دوسرے عرب قبائل میں بھی اُسے شرافت اور نجابت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

بیابان میں اونٹ پالنے والا ایک بدوی عرب معاشرے میں شرافت کا مرقع سمجھا جاتا اور قابلِ احترام شمار ہوتا تھا۔ وہی عرب جب اونٹوں کی پرورش چھوڑ کر بھیڑ بکریوں کو پالنا شروع کر دیتا تو اُسے متوسط طبقے میں جگہ دی جاتی تھی۔

ایک عرب صحرا میں رہتا اور اونٹ پالتا اور کسی نہ کسی قبیلے سے منسوب ہوتا تھا، کیوں کہ عربوں کے لیے انفرادی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ایٹم (Atom) اکیلا نہیں رہ سکتا اور مجبور ہوتا ہے کہ کسی دوسرے ایٹم سے مل کر "مالیکیول" (Molcule) کو تشکیل دے اور زندگی کی ہماہمی وجود میں لائے۔ اسی طرح ایک عرب کے لیے بھی لازم تھا کہ وہ ضرور کسی قبیلے سے منسلک ہو۔ اس بدوی معاشرے میں کوئی فرد قتل ہو

جاتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کے قبیلے سے قصاص لیتا تھا، نہ کہ اس قاتل فرد سے۔ قبیلے کا رئیس اپنے قبیلے میں مثل بادشاہ کے ہوتا تھا، ایسا بادشاہ جس کی شان و شوکت کا مظہر بس اونٹ ہی تھے۔ یہ اونٹ ہی ذریعۂ سواری و بار برداری ہوتے تھے۔

عبد المطلب رئیس قبیلۂ ہاشم کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ اُس نے خدا سے دُعا کی کہ اے خدا، اگر تو نے مجھے دس فرزند عطا فرمائے تو میں دسویں لڑکے کو تیری راہ میں قربان کروں گا۔ خدا نے دعا قبول فرمائی اور اُس کے ہاں دس لڑکے پیدا ہوئے۔ دسویں لڑکے کا نام عبد اللّٰہ تھا، جو کہ بھائیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھا۔

عبد اللّٰہ جوان ہوا تو اُس کے والد کو اس بات کی فکر ہوئی کہ اب قربانی کا وعدہ پورا کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ عرب، قبائل قریش سے ہو یا کسی اور قبیلے سے، اپنے عہد کو ہمیشہ اور بہر طور نبھاتا تھا۔ وہ اگر کبھی قرض لیتے تھے تو وعدے کے مطابق ادا کرتے تھے اور وعدہ کرتے تھے تو اُسے بلا تاخیر نبھاتے تھے۔ بدوی عرب کے جو دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر لاتا تھا۔

عبد المطلب خود کو مکلف سمجھتے تھے کہ اپنا وعدہ وفا کریں، اس لیے بھی کہ وہ ایک حنیف شمار ہوتے تھے۔ حنیف وہ شخص ہوتا تھا جو خداوند خالقِ ارض و سما کی جستجو میں رہتا تھا۔ اُس وقت چند افراد ہی مکّہ میں حنیف گنے جاتے تھے، جن کے نام تاریخ میں ثبت ہیں۔ اُن میں سے ایک عبد المطلب تھے۔ عبد المطلب گو حنیف تھے لیکن اپنے اجداد کے خداؤں کے منکر نہ تھے اور اُن خداؤں کا، جو بتوں کی شکل میں کعبہ میں رکھے ہوئے تھے، احترام کرتے تھے۔

بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ کعبہ میں ٣٦٠ بت تھے، حالانکہ کعبہ میں بتوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ تمام قوموں اور قبیلوں کے مذہبی آثار کعبہ میں رکھے ہوئے تھے تاکہ زائرین کعبہ آ کر اپنے اپنے خدا کی پرستش کر سکیں، حتیٰ کہ حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی تصویریں کعبہ میں آویزاں تھیں۔ حرم یعنی حدودِ کعبہ محترم جگہ تھی، اس لیے اسے حرم کہا جاتا تھا۔ حرم کے اندر کسی شخص کو جرأت نہ تھی کہ تنازع یا جھگڑا کرے۔ دو خونی دشمن جب حدودِ حرم میں داخل ہو جاتے تو مجبوراً دشمنی کو وقتی طور پر بھول جاتے۔ کارواں جو اطراف سے آتے

واقعۂ اصحابِ فیل

الم تر کیف فعل ربک باصحب الفیل ۝ الم یجعل کیدھم فی تضلیل ۝ وارسل علیھم طیرا ابابیل ۝ ترمیھم بحجارۃ من سجیل ۝ فجعلھم کعصف ماکول ۝

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی چال ناکام نہیں بنا دی؟ اور ان پر ابابیل پرندے بھیجے جو سخت پتھر کی کنکریاں انھیں مارتے تھے۔ پھر (اللہ نے) انھیں کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا۔" (سورۃ الفیل: ۱۔۵)

تھے، جب حدودِ حرم میں داخل ہوتے تو انھیں آزادی ہوتی تھی کہ اپنے اپنے خدا کی پرستش کریں۔ انتہا یہ تھی کہ ہر قوم اور ہر قبیلے نے اپنے خدا کے بُت کو رکھنے کے لیے ایک حجرہ یا احاطہ مخصوص کر رکھا تھا۔

جس وقت جنوبی عربستان (موجودہ یمن) میں شاہ حبشہ کے نائب سلطنت ابرہہ نے ارادہ کیا کہ کعبہ کو ویران کرے اور اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے وہ ایک طویل راہ طے کرتا ہوا مکہ کے نزدیک شہر طائف میں داخل ہوا (یہ مقام آج بھی اسی نام سے موسوم ہے)۔ طائف کے لوگوں نے اس کا استقبال کرتے ہوئے یہ عرض گزاری کہ وہ بے شک کعبہ کو مسمار کر دے مگر طائف والوں کے خدا کے حجرے کو تباہ نہ کرے، تاہم روایت میں آتا ہے کہ ابرہہ نے اُن کی یہ درخواست رد کر دی تھی۔

طائف سطح سمندر سے ۲۵۰۰ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں پانی کی بہتات تھی۔ جنگلات اور زراعت کی کوئی کمی نہ تھی۔ آج بھی یہ علاقہ ویسے ہی سرسبز و شاداب ہے۔

طائف والے اہلِ مکہ کے مقابلے میں اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ وہ گندم کی روٹی کھاتے ہیں اور یہ صحیح بھی تھا۔ مکہ والوں کو گندم کی روٹی میسر نہیں تھی۔ جب بھی قرب و جوار کے شہروں سے گندم درآمد ہوتی، وہ بھی گندم کی روٹی کھا لیتے وگرنہ کھجوریں، اونٹ کا دودھ، اور خشک مچھلی سے پیٹ بھر لیتے۔ مچھلی بحیرہ احمر سے لائی جاتی جو مکہ سے زیادہ دور نہیں۔ سمندر سے نزدیک ہونے کی وجہ سے اہلِ مکہ سمندری جانوروں سے بھی آشنا تھے اور ان جانوروں کے ناموں پر اپنے نام رکھتے، مثلاً قریش یعنی "چھوٹا مگرمچھ"۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ابرہہ کا کعبہ پر حملہ اقتصادی اور تجارتی وجوہ کی بنا پر تھا۔ ابرہہ شاہ حبشہ کی طرف سے یمن میں حبشہ کے لشکر کا سردار تھا۔ بغاوت کر کے اُس نے نائب السلطنت کو قتل کر دیا اور خود نائب السلطنت بن بیٹھا۔ نجاشی (شاہ حبشہ) نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے ہی نائب السلطنت مقرر کر دیا۔ ابرہہ ایک جاہ طلب انسان تھا۔ وہ قدیم کتبے جو جنوبی عربستان سے حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں، اس کا ثبوت ہیں۔ ان کتبوں کو میں نے خود

دیکھا ہے۔ تمام کتبوں میں اُس نے خود کو بڑے بڑے القابات اور عنوانوں سے نوازا ہوا ہے۔

ابرہہ جو مذہبی اعتبار سے مسیحی تھا، اس نے ارادہ کیا کہ مکّہ کی بین الاقوامی تجارتی حیثیت ختم کر کے بین الاقوامی تجارت کا رُخ صنعا (یمن) کی طرف موڑ دے۔ اسی نیت سے اُس نے ایک کلیسا نما کعبہ صنعا میں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ کچھ مدت بعد ابرہہ کے کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی اور اس کے سنگ تراشوں نے انجینئروں اور معماروں کے نام کتبوں میں کندہ کر دیے۔ ابرہہ کے کعبہ کی تکمیل کے باوجود اس کی توقعات کے خلاف بین الاقوامی تجارت کا رُخ مکّہ ہی کی طرف رہا تو اُس نے مکّہ شہر کو ویران کرنے کی ٹھانی، تاکہ تجارتی مرکز صنعا قرار پائے۔ کعبۃ اللہ کو ویران کرنے کے ارادے کی علت اقتصادی تھی نہ کہ مذہبی، یا کم از کم یہ کہیے کہ اُس کے اقدام کی ایک بڑی وجہ اقتصادی ضرور تھی۔

ابرہہ چونکہ ہاتھیوں کے ساتھ مکّہ کی طرف روانہ ہوا تھا، لہٰذا جس راستے سے وہ آیا تھا، عربوں نے اُسے ”صراط الفیل“ کا نام دیا اور جو چشمے اس راہ پر واقع تھے، اُنھیں ”عین الفیل“ کہنے لگے اور جس سمت سے وہ مکّہ میں وارد ہوا تھا، اُسے ”باب الفیل“ کا نام دیا گیا۔ جس سال یہ واقعہ ہوا، اسے ”عام الفیل“ کہتے ہیں۔ رسولِ خدا اسی سال پیدا ہوئے۔

آمدم برسرِ مطلب عبد المطلب کے لیے قربانی سے گریز ممکن نہ تھا۔ وہ سوچتا کہ وہ خداوند جس کی میں نے منت مانی ہے اور جس کی مجھے تلاش ہے، نہایت بزرگ و برتر ہستی ہے۔ اس کے برعکس میں بہت حقیر و ناچیز ہوں اور قرض (قربانی) کی ادائگی میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ جس نے زمین و آسمان بنائے ہیں اپنے قرض سے صرفِ نظر کر دے؟ لیکن عبد المطلب کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ یہ جان لے کہ قربانی معاف کر دی گئی ہے یا نہیں۔ پس اُس نے تہیہ کیا کہ کسی ”عراف“[1] سے رجوع کرے۔ ان دنوں ایک ”عراف“ یثرب میں رہتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ آسمانی احکام کی علت کو سمجھ سکتا ہے۔ عبد المطلب ایک نر شتر پر سوار ہو کر یثرب کی طرف

۱۔ عراف یعنی کاہن ایسے شخص کو کہتے تھے جو غیب کی باتیں جانتا ہو۔

چل پڑا۔ وہ اس لیے نرشتر (اونٹ) پر سوار ہوا کہ اعراب بادیہ کے نزدیک مادہ شتر (اونٹنی) شان وشوکت ظاہر کرنے کا جانور تھا۔ اُس کو وہ فقط دوڑوں کے مقابلے کے لیے رکھتے تھے۔ بھورے رنگ کی اونٹنی کو ایک قیمتی جانور گنا جاتا تھا۔

عبدالمطلب گیارہ دن کے سفر کے بعد یثرب پہنچ گیا۔ سیدھا عراف کے پاس آیا۔ عراف نے ستاروں کا مطالعہ کرنے کے بعد بتایا کہ خدا تمھارے فرزند کی قربانی سے صرف نظر کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ تو اُس کے عوض کوئی دوسری قربانی دے۔[۲]

عرب میں انسان کا خون بہا شتر تھا۔ لہٰذا عبدالمطلب نے عراف سے پوچھا: اگر میں دس شتر قربانی کروں تو خدا راضی ہو جائے گا؟

عراف نے ستاروں پر نگاہ کی اور کہا: نہیں!

عبدالمطلب نے کہا: اگر پندرہ اُونٹ قربانی کروں تو پھر کیسا ہے؟

عراف نے پھر آسمان کی طرف نگاہ کی اور جواب نفی میں دیا۔

حتیٰ کہ عبدالمطلب نے اونٹوں کی تعداد ایک سو تک بڑھا دی تو عراف نے کہا کہ خداوند نے یہ قبول کر لیا ہے۔

عبدالمطلب نے مکہ واپس آ کر ایک سو اونٹوں کی قربانی دی۔

اونٹوں کی قربانی کے بعد عبداللہ کی شادی ایک لڑکی ''آمنہ'' سے کر دی گئی اور اس بی بی آمنہ کے بطن سے حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، مگر ان کی پیدائش سے قبل ہی عبداللہ اس جہان سے کوچ کر گئے۔

یوحنا کی انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

اگر تم مجھے دوست رکھو اور میرے احکامات کو مانو تو میں تمھارے لیے دعائے خیر کروں گا۔ اور وہ (خداوند) تمھارے لیے میرے بعد پاراکلت بھیجے گا اور میں نہیں چاہتا کہ تم یتیم رہ جاؤ اور تمھارا کوئی سرپرست نہ ہو۔

۲- کاہن اور عبدالمطلب کے درمیان یہ باتیں اس وقت کے عقائد کے مطابق تھیں۔

لفظ پاراکلت یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں ''تسلی دینے والا، طاقت دینے والا، حمایت کرنے والا''۔[۳] یوحنا کے قول کے مطابق حضرت مسیحؑ نے پیش تر اس سے کہ اس جہان سے تشریف لے جاتے، اپنے پیروؤں سے کہا کہ: میرے بعد ایک شخص آئے گا جو تمھارے لیے باعثِ تقویت وحمایت ہو گا۔ اب عیسائی اس کی تفسیر کچھ یوں کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کا مقصود یہ تھا کہ یہ شخص ''پاراکلت'' عیسائیوں اور خداوند کے درمیان واسطے کا کام دے گا، تاکہ عیسائی تنہا نہ رہیں پھر عیسائیوں کے قول کے مطابق حضرت مسیحؑ کی رحلت کے پچاس دن بعد ''پاراکلت'' (کہ وہی ان کے نزدیک روح القدس ہے) ظہور میں آ گیا تھا اور اُس دن سے آج تک عیسائیوں اور خداوند کے درمیان واسطہ ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ عیسائیوں نے فرمودۂ حضرت مسیحؑ کو تبدیل کر دیا ہے، حالانکہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ''پاراکلت'' آئے گا۔ ''پاراکلت'' کے معنی ''احمد'' کے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہودی بھی اس روایت کے مطابق اسے ''پریکل ٹوس'' پڑھتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ''احمد'' آئے گا۔ عرب میں ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار اور دوسری روایت کے مطابق ایک لاکھ اور تیسری روایت کے مطابق چالیس ہزار پیغمبر اس جہان میں رشد وہدایت کے لیے تشریف لائے اور تین بڑے مذاہب توحید یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا آغاز سرزمین عرب[۴] سے ہوا (بشرطیکہ بحیرہ روم کے مشرقی علاقے کو عرب کا حصہ تصور کیا جائے)۔ ہم اس بڑی تعداد میں سے چند صد پیغمبروں کو جانتے ہیں، جن کے متعلق کم وبیش تاریخ نے بذریعہ روایات روشنی ڈالی ہے۔

عرب ابتدا میں جنوب میں آباد تھے۔ عربستان کا جنوبی منطقہ آباد اور سرسبز تھا۔ اسی لحاظ سے اس کا نام عربستان خصیب پڑ گیا اور یونانی اُسے عربیا فلیکس (Arabia Flex) یعنی

۳- پاراکلت کو عربی میں بائبل میں فارقلیط لکھا گیا ہے۔

۴- جزیرہ نمائے عرب کے تقریباً تیس لاکھ مربع کلومیٹر رقبے میں سے تقریباً بیس لاکھ مربع کلومیٹر سعودی عرب میں شامل ہے جب کہ باقی رقبہ یمن، عمان، متحدہ عرب امارات، قطر، کویت، اُردن میں بٹا ہوا ہے۔

بارونق اور معمور عربستان کا نام دیتے تھے۔[5]

عرب مختلف ادوار میں جنگ و جدل، خشک سالی اور دریاؤں پر بندوں (Dams) کے تباہ ہو جانے کے باعث جنوبی منطقے سے ہجرت کرتے گئے۔[6] جنوب میں چونکہ سمندر کی وجہ سے راہ مسدود تھی، لہٰذا انھوں نے شمال کا رُخ کیا جہاں صحراؤں میں وسائل زندگی تلاش کرتے کرتے خانہ بدوش یا بدوی بنتے گئے۔ شمال کی طرف صحرا کا ایک لامحدود سفر شروع ہو جاتا اور انھیں مجبوراً اس وسیع صحرا میں محدود اور مخصوص وسائل سے اپنی زندگی کی کفالت کرنا پڑتی۔ یہ چیز انھیں سخت کوش زندگی کی عادی بنا دیتی۔ صحرانوردی کے اس دور میں بہت سے مر جاتے مگر جو زندہ بچ نکلتے وہ اس سخت دَور سے گزر کر نئے انسان بن جاتے۔ پروفیسر چارلس ڈارون اپنے نظریہ میں کہتا ہے: دنیا میں وہ جانور باقی رہتے اور پرورش پاتے ہیں جو بیشتر صالح ہوں اور وہ حیوانات جو ناتواں اور بے شعور ہوں ختم ہو جاتے ہیں۔ صحرائے عربستان میں بھی وہی شخص زندہ رہ سکتا تھا جو نہ صرف جسمانی لحاظ سے بلکہ روح اور صالحیت کے اعتبار سے بھی قوی تر ثابت ہو۔

عرب کے دشت ہائے غیر ذی زرع میں جہاں فقط خار مغیلاں نظر آتے ہیں، زندگی کی حفاظت بغیر اس کے ممکن ہی نہ تھی کہ انسان روحانی اور جسمانی طور پر پائیدار ہو، نیز قبیلہ و طائفہ کے نظم و ضبط کی پابندی کرے، حتیٰ کہ آج جب کہ عربستان میں موٹر کاریں اور ہوائی جہاز تک میسر ہیں، کوئی شخص ان صحراؤں میں تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ آج بھی وہاں بھوک، پیاس اور کسمپرسی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

لیکن اگر افراد قبیلے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوں اور اس کے نظم و ضبط کے پابند ہوں تو وہ قبیلہ افراد کی مدد کرتا ہے۔ قبیلے کے افراد کی اجتماعی کوشش ان بہت سی مشکلات کو دور

۵- عربیا فلیکس جزیرہ نمائے عرب کے صرف اس حصے کا نام تھا جو زرخیز تھا، مثلاً یمن وغیرہ، جبکہ باقی تمام صحرائی عرب کو یونانی ''عربیا ڈیزرٹا'' (ریگستانی عرب) کہتے تھے۔

۶- قرآن کی سورۃ سبا میں سَیل العرم (بند کا سیلاب) سے آنے والی تباہی کا ذکر ہے۔

کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے جن سے ایک فرد عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے صحرائے عربستان میں قبیلے سے فرد کی وابستگی اتنی اہمیت حاصل کر گئی کہ ایک فرد کو اگر قبیلہ اپنے ہاں سے نکال باہر کرتا تو اور کوئی قبیلہ اُسے قبول نہیں کرتا تھا۔ عرب کے کسی صحرانشین قبیلے کے ساتھ منسلک ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ معاش کے لیے جدوجہد سے آزادی حاصل ہو گئی، بلکہ یہ کہ صرف مشکلات میں کمی ہو جاتی تھی۔

ایک بدوی عرب بھوک اور پیاس کا اس قدر خوگر ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں اس کی فطرت کا جزو بن جاتی تھیں۔ تمام مرد و عورت لباس کے نیچے ایک کمر بند خوب کس کر باندھتے تھے کہ اس کے دباؤ سے بھوک کا احساس نہ ہو اور بعض حالات میں جب یہ تجربہ کامیاب نہ ہوتا تو اسی کمر بند سے پیٹ پر پتھر باندھتے تھے تاکہ اس کا وزن پیٹ پر محسوس ہو اور فریب میں مبتلا رہیں کہ معدہ غذا سے پُر ہے۔

شنفرہ، دورِ جاہلیت کا ایک عرب شاعر اپنے اشعار میں کہتا ہے! ''میں اپنی بھوک کو فریب دے سکتا ہوں، معدے کی آوازوں کو ختم کر سکتا ہوں اور پھر بھی اگر بھوک کی شدت کم نہ ہو تو میں معدے کو اس طرح پیچ و تاب دوں گا کہ روئی دھنکنے والا بھی اپنے پاؤں سے روئی کو اس طرح نہیں دباتا''۔

بدوی عرب میں بھوک اور پیاس کی برداشت اس قدر زیادہ تھی اور اب بھی ہے کہ دوسرے ملکوں کے رہنے والے لوگ اُس کا صحیح ادراک نہ اُس وقت کر سکتے تھے اور نہ اب کر سکتے ہیں۔ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ اونٹ نے بھوک کی شدت سے اپنے بدن کی تمام پشم (اُون) کھالی، یہاں تک کہ ایک بال بھی بدن پر نہ رہا۔

عربستان میں موسمِ بہار بقولِ اعراب ''فصل ربیع'' صرف تین ہفتہ کا ہوتا ہے اور صرف ان ہی تین ہفتوں میں صحرا میں بارش ہوتی ہے۔ اس دوران جہاں زمین ریت سے ڈھکی ہوئی نہ ہو، سرسبز ہو جاتی ہے۔ یہی سبزہ گرمیوں میں خاردار جھاڑیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فصلِ بہار میں جب صحرا سبز ہو جاتا ہے تو بعض اوقات ہرن خوراک کی تلاش میں صحرا میں آ

جاتے ہیں۔ اُس وقت بدوی عرب اُن کا شکار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سال بھر شکار میسر نہیں آتا کیوں کہ صحرا خشک ہو جاتا ہے۔

بدوی عرب اگر شہروں میں رہائش پذیر ہو جائے تو بھی اپنی مخصوص بدوی بودوباش کو محفوظ رکھتا ہے۔ اور صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ خیمے کے بجائے مکان میں سکونت اختیار کرتا ہے۔ مکہ، مدینہ اور طائف باوجودیکہ عربستان کے شہر ہیں، ان شہروں میں سکونت اختیار کرنے والا ہر قبیلہ اپنی اپنی صحرائی بودوباش کو شہری مکان میں بھی قائم رکھتا اور کسی دوسرے کی تہذیب کی اپنی تہذیب میں آمیزش گوارا نہ کرتا تھا۔ بدو عرب ہمیشہ نقل مکانی کرتے رہتے ہیں۔ فقط شتر ان کا وسیلۂ بار برداری ہے۔ اس لحاظ سے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں زحمت کم سے کم ہو، ایک بدو بھاری اشیا کو ساتھ نہیں رکھتا اور اس کے گھر کا اثاثہ کم از کم ضروریات زندگی پر مشتمل ہوتا ہے۔

مکہ میں قریشی بزرگ اسی نوع کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے ہاں زینت کی شے صرف اونٹ ہی تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب تک رسول ﷺ زندہ رہے، ہم گھر میں ایک چھلنی بھی نہیں رکھتے تھے کہ اگر کسی روز روٹی پکانی ہو تو آٹا ہی چھان لیں۔ بدوی عرب چھلنی کو ایک غیر ضروری چیز سمجھتے تھے۔

قریش کے قبائل نے باوجودیکہ مکہ میں بودوباش رکھتے تھے بدویانہ خصوصیات کو ترک نہیں کیا تھا۔ اپنے بچوں کو بعد از ولادت بدوی عورتوں کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ بچہ صحرا میں پرورش پائے۔ اس رسم میں دو اور وجوہ کو بھی دخل تھا:

پہلی یہ کہ عربوں کا خیال تھا کہ مکہ کی ہوا مضر ہے۔ شیر خوار جو مکہ میں پرورش پائے ایامِ طفولیت میں فوت ہو جاتا۔ مکہ میں متعدی امراض بچوں کی موت کا باعث ہوتے تھے مگر صحرا کی ہوا صاف اور جراثیم سے پاک ہوتی تھی۔

دوم یہ کہ جب کوئی بچہ کسی بدوی عورت کو دیا جاتا تھا تو ہر دو قبیلوں میں قریبی تعلقات استوار ہو جاتے تھے۔ دایہ کا اپنا بچہ اور دوسرا بچہ برادرِ رضاعی قرار پاتے تھے۔ اَعراب میں

اس طرح کے رضاعی بھائیوں کو حقیقی بھائیوں کا سا درجہ دیا جاتا اور ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ جب محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو ان کے سر کے بال ترشوا کر اُن بالوں کے وزن کے برابر سونا خیرات کیا گیا۔ ایک نوزائیدہ بچہ کے بالوں کا وزن تو کچھ بھی نہیں ہوتا مگر قریش اس رسم کو نبھاتے تھے اور پھر یہ رسم ان کی تقلید میں ہر جگہ پھیل گئی۔

بال ترشوانے کی رسم کے بعد محمد ﷺ کو دایہ کے سپرد کر دیا گیا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دو دایہ تھیں۔ تواریخ اسلام میں ان دو میں سے ایک کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ شاید ایک دایہ کا ذکر اس لیے کم کیا ہے کہ وہ ابولہب کی کنیز تھی جو کہ محمد ﷺ کا چچا تھا۔ وہ مسلمانوں کے نزدیک قابلِ نفرت تھا، اس لیے کہ اس نے پیغمبر محمد ﷺ کو بہت زیادہ اذیتیں پہنچائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے قرآن پاک میں ابدی ملعون قرار دیا اور فرمایا:

﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ ''یعنی ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔'' [لہب ۱۱۱:۱]

وجہ یہ کہ جب محمد ﷺ نے اپنی بعثت کا اعلان کیا تو ابولہب، محمد ﷺ کو پتھر مارا کرتا تھا، اُن کے چہرہ اور سینہ کو زخمی کر دیا کرتا تھا۔ محمد ﷺ اپنے زخمی چہرہ اور جسم کو اپنے دامن سے صاف کرتے اور خدا سے دُعا کرتے: یا اللہ! ابولہب کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما۔ ابولہب کی بیوی بھی جس کا نام اُم جمیل تھا پیغمبر ﷺ کو اذیت پہنچایا کرتی۔ راتوں کو محمد ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتی جن کی وجہ سے ہر شب آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہو جایا کرتے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اس پر بھی اُس کے شوہر کی طرح ابدی لعنت بھیجی اور قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ ''یعنی وہ عورت جو ایندھن اُٹھاتی ہے۔'' [لہب ۱۱۱:۴]

اس معنی میں کہ جب (ابولہب) واصلِ جہنم ہو گا اُس کی بیوی اُمِ جمیل جو خاردار جھاڑیاں بطور ایندھن اکٹھی کرتی تھی، شوہر سے جا ملے گی۔

بہر طور پیغمبرؐ کی پہلی دایہ ابولہب کی کنیز تھی۔ محمد ﷺ جب بڑے ہوئے، آپ نے اُس کنیز کو ابولہب سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے عرب عورتیں بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلایا کرتی تھیں بلکہ دایاؤں کے سپرد کر دیتیں کہ وہ ان کو صحرا میں لے جا کر پرورش کریں۔

میں نے عرب میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ آج عربستان میں اگرچہ بودو باش خاصی تبدیل ہو چکی ہے اور ان کے کھاتے پیتے لوگ کاریں استعمال کرتے ہیں، لیکن پھر بھی بعض شرفا اپنے بچوں کو دایہ کے سپرد کرتے ہیں کہ وہ ان کو صحرا میں لے جائیں اور وہ مکّہ سے باہر پرورش پائیں۔ یہ رسم ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔

قبیلہ بنوسعد کی عورتیں چند گھنٹوں میں بچوں کو گود لے کر واپس چلی گئیں، مگر اُن میں سے کسی ایک نے بھی محمد ﷺ کو گود نہ لیا، اس لیے کہ وہ ایک یتیم اور غریب بچہ ہے۔ بالآخر ایک عورت نے جس کا نام حلیمہ تھا، انھیں گود لیا اور اپنے تاثرات یوں بیان کیے:

اس سال فصلِ ربیع میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ میں نے شوہر سے کہا کہ ہماری معاشی حالت اچھی نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو ہم بھی مکّہ جا کر کسی بچے کو صحرا میں لے آئیں اور پرورش کریں تا کہ اس سے کچھ گزر اوقات کا وسیلہ ہاتھ آئے۔ شوہر نے میری تائید کی۔ میں نے اپنے شیر خوار بچے کو اپنے دامن میں لیا اور اونٹنی پر سوار ہو گئی۔ میرے شوہر نے اونٹنی کی نکیل پکڑی اور ہم مکّہ کی طرف چل پڑے۔

میرا اپنا بچہ بھوک سے بلکتا رہتا کیوں کہ میرے دودھ کم تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے تقریباً خشک ہو چکا تھا۔ ہماری اونٹنی بھی خشک سالی کی وجہ سے بہت لاغر ہو چکی تھی اور دودھ نہیں دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اور میرا شوہر دونوں فاقہ سے تھے۔

جب ہم مکّہ پہنچے، ہمارے قبیلے کی عورتیں ثروت مند گھرانوں کے بچوں کو گود لے کر واپسی کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔ اُن میں سے ہر ایک نے بچوں کے والدین سے خاصی رقم پیشگی وصول کر لی تھی۔ میرے حصہ میں کسی ثروت مند کا بیٹا نہ آیا۔ بلکہ محمد ﷺ نامی ایک یتیم بچے کی پرورش کے لیے مجھ سے درخواست کی گئی اور وہ بھی بغیر کسی پیشگی معاوضہ کے۔ میں نے شوہر سے کہا: ”خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے ہم اس بچے کو ساتھ لے چلیں۔ چلو ہے تو یہ قریش میں سے۔ جب بڑا ہو گا تو بزرگانِ قریش میں سے ہو گا اور ہم اس سے یقیناً فائدہ اُٹھا سکیں گے“۔ میرا شوہر مان گیا اور ہم محمد ﷺ کو

گود میں لے کر دوسری عورتوں کے ساتھ ہی واپس ہو لیے۔ ابھی مکّہ سے آدھی منزل بھی دور نہ ہوئے تھے کہ مجھے اپنے سینے میں دودھ کا احساس ہوا اور وہ بھی اس قدر کہ دونوں بچوں نے پیٹ بھر کر پیا۔ جب پہلی منزل پر پہنچے تو میرے شوہر نے میری توجہ اونٹنی کی طرف دلائی اور کہا حلیمہ دیکھو اونٹنی کے تھنوں میں کتنا دودھ بھرا ہوا ہے۔

ہم دونوں بھوکے تھے، دودھ کو دوہا، پیا اور خوب سیر ہو کر رات کو سو گئے۔ صبح میں نے شوہر سے کہا: ”یہ سب برکت صرف اور صرف اس قریشی بچے کی وجہ سے ہے۔ یہ بچہ ہمیں یقیناً سعادت مند کرے گا“۔



محمد ﷺ امین

محمد ﷺ کا دودھ چھڑانے کے بعد حلیمہ انھیں اُن کی والدہ بی بی آمنہ کے پاس واپس چھوڑ گئیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، محمد ﷺ کی واپسی کے تھوڑی مدت بعد ہی اُن کی والدہ ماجدہ اور پھر دادا عبدالمطلب یکے بعد دیگرے اس جہان سے کوچ کر گئے۔ تب اُن کے چچا ابوطالب نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا، اور جب محمد ﷺ بارہ سال کے تھے، ابوطالب اُنھیں اپنے ہمراہ شام کے سفر پر لے گئے۔

شام کے سفر سے واپسی پر دوبارہ آپ ﷺ نے گلہ بانی کا کام شروع کر دیا، لہٰذا پھر وہی گرم ریگستان اور آفتاب کی جھلسا دینے والی گرمی تھی اور محمد ﷺ تھے۔

جن دنوں بھیڑوں کے دودھ ہوتا، آپ ﷺ اس دودھ کو غذا کے طور پر استعمال کرتے اور جب بھیڑوں کا دودھ خشک ہو جاتا تو آپ ﷺ صحرا کی جڑی بوٹیاں کھا کر گزارا کیا کرتے تھے۔ جب پیغمبر ﷺ بڑھاپے کو پہنچے تو اکثر دوستوں کو اپنے ہمراہ مکّہ کے پہاڑوں میں لے جاتے اور مختلف جگہوں کی نشان دہی کیا کرتے اور فرمایا کرتے: میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا اور یہ جڑی بوٹیاں بطور غذا استعمال کیا کرتا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، اعراب سال میں چار ماہ جنگ و جدل نہیں کیا کرتے تھے۔ حج کے دنوں میں راہزن لوٹ مار سے ہاتھ روک لیا کرتے تھے۔ حجاج اور تاجروں کے قافلوں پر حملے نہیں کیا کرتے تھے۔ حج کے ایام میں مکّہ کے نزدیک ایک بازار لگا کرتا تھا جیسے ہمارے ہاں عوامی میلے لگتے ہیں۔ تمام اعراب اُس بازار میں خرید و فروخت کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ بازار خود مکّہ شہر میں نہیں شہر سے باہر لگا کرتا تھا۔ محمد ﷺ ابھی بچے تھے جب اُس بازار میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ عربستان میں سب سے قیمتی چیز

سونا ہے، اس کے بعد چاندی، اور عربوں کا ایک مقولہ بھی اسی کی تائید کرتا تھا، لیکن بازارِ عکاظ میں محمد ﷺ کے علم میں یہ بات آئی کہ عرب میں ہر چیز سے مرتبہ میں بڑھ کر سخن [شاعری] ہے جو سونے سے بھی گراں تر ہے۔

عرب کا ایک شاعر کعب بن زہیر کہتا ہے: ''انسان کی وقعت و حرمت اُس کے دل اور زبان سے ہے۔ باقی سب خون آلود گوشت کا بیکار ڈھانچا''۔

شاعر نے ایک بدو عرب کی سی سوچ سے ٹھیک ہی کہا ہے کیوں کہ عربستان میں سخنوری صدیوں سے ایک بہترین ہنر شمار ہوتا تھا۔

عربستان ایک بڑی وسیع سرزمین ہے جس کا بیش تر حصہ ریت سے ڈھکا ہوا ہے۔ ان ریگ زاروں میں جہاں گرم ریت کے جھکڑ چلتے ہیں، ایک عرب کا سرمایہ حیات تین چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک خیمہ جو اُسے آفتاب کی حرارت سے پناہ دیتا، ایک اونٹ سواری کے لیے اور اونٹنی کا دودھ غذا کے طور پر استعمال کے لیے اور ایک تلوار جس سے وہ اپنا دفاع کرتا۔ ان اشیا کے علاوہ اُس کے پاس اپنے ذوق و روح کی تسکین کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ارنسٹ رنان ایک فرانسیسی فلسفی کہتا ہے: ''دوسری قوموں کے علوم خصوصاً ایران کے علوم جو طلوعِ اسلام کے بعد عرب میں درآمد ہوئے، اگر عربوں سے واپس لے لیے جائیں تو باقی رہ جائے گا عرب اور اُس کا اونٹ'' مگر میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے عمیق مطالعہ کیے بغیر ہی یہ بات کہہ دی ہے وگرنہ تمام علوم، بالخصوص ایرانی علوم اگر عربوں سے واپس لے لیے جائیں تب بھی عربوں کے پاس قابلِ فخر صنفِ سخن باقی رہ جاتی ہے۔

عرب مجسمہ سازی، معماری و نقاشی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہ ان سے متعلقہ لوازمات وہاں پیدا نہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے سخن میں ان تمام اصناف کا احاطہ کیا ہے۔ سخنوری (شاعری) عربوں کا واحد ملی سرمایہ تھا جس میں انھوں نے اپنی تاریخ، ادب اور ہنر و فن کو مرتکز کر دیا تھا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ علم الانساب، تاریخ، ہنر اور دوسرے عربی علوم سے واقفیت حاصل

کرے تو اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ شعرائے عرب کے اشعار کو زیر مطالعہ لائے۔

دوسرے علاقوں میں شاعر ایک ادیب ہوتا ہے مگر عرب میں وہ ایک ڈاکٹر، ایک روحانی پیشوا اور ایک دانش ور شمار کیا جاتا تھا۔ شاعر اپنے آتشیں کلام سے دشمن کو قتل کرتا اور بیمار کے لیے اُس کا کلام موجب تسلی و شفا ہوتا تھا۔ محمد ﷺ جب پیغمبری کے رُتبہ پر مبعوث ہو گئے تو ایک جنگ میں اپنے لشکر کے ایک شاعر حسان بن ثابت سے فرمایا: "ان دشمنوں کی ہجو کہو کہ تیرا عتاب دشمن پر شبخون سے بہتر ہے۔ جبرئیل تمھاری مدد کریں گے"۔

عرب قبائل کی زندگی میں شعر ہوا و آفتاب کی سی لازمی حیثیت رکھتا تھا اور اقوام عرب کے خوشی یا غمی، نیک بختی یا بدبختی، شادی یا مرگ اور صلح یا جنگ کے مخصوص اشعار ہوتے تھے۔ عرب جب کسی سے متاثر ہوتا، زہیر کے اشعار گنگناتا تھا۔ وحشت کی حالت میں نابغہ کے اشعار پڑھتا۔ غصہ و انتقام کے وقت اعشی کے اشعار زبان پر ہوتے اور جب دشمن پر حملہ آور ہوتا تو عنترہ کے رجزیہ شعر پڑھتا۔ ہر شخص شاعر نہیں ہو سکتا۔ یہ استعداد خدا کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے: "عقاب نے پنجوں سے میرا سینہ اُدھیڑا اور شاعری کی استعداد میرے سینہ میں رکھ دی"۔ ایک دوسرا شاعر کہتا ہے: "جس وقت ایک ذہن میں شاعری کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک دیو اُس کے وجود میں حلول کر گیا ہو اور پھر اُسے قرار نہیں آ پاتا۔ اُس کے لیے کوئی چارہ نہیں رہتا سوائے اس کے، کہ تمام اُصول و قیود کو پاؤں کی ٹھوکر پر لے لے"۔

اس شاعر نے دورِ جاہلیت (قبل از اسلام) کی عرب شاعری کی خوب حقیقت بیان کی ہے اور صرف اس ایک ہی جملے میں خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

عرب کے شعرا استعداد اور ذوق کے علاوہ آزاد منش ہوتے تھے۔ اُن کی فکر اور سوچ کا انداز قبیلے کے افکار کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر قدم پر شعائر قبیلہ اور رسوم و قیود سے ٹکرا جاتے تھے۔ یہی آزادروی اور لاابالی پن انھیں قبیلے کے شعائر و رسوم کے تابع نہیں رہنے دیتا تھا۔ لہٰذا وہ صحراؤں میں آوارہ گرد ہو جایا کرتے تھے۔ بہت سے شاعر صحرا میں بھوک اور

پیاس سے مر جاتے۔ عرب میں ہر وہ شخص جو قبیلہ سے دور ہو کر تنہائی کی زندگی اپنا لیتا، موت سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اسی لیے زیادہ تر عرب شعرا، رہزنی کو ذریعہ معاش بنا لیتے تھے۔

ہر سال مکّہ کے بازار عمومی عکاظ[1] میں عرب شعرا کے مشاعرے ہوا کرتے اور جو شاعر اپنے کلام میں دوسرے ہم عصروں پر سبقت لے جاتا، اُسے عرب عوام بہت زیادہ نوازتے اور اُسے قومی شاعر قرار دیا جاتا تھا۔ اُس کے شعروں کو ایک ریشمی پارچے پر سنہری حروف میں لکھ کر دیوار کعبہ سے لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ تمام قبائل جو مکّہ میں آئیں، اُس کلام کو پڑھیں۔ یہ کلام ایک سال کے لیے وہاں آویزاں رہتا تھا۔ اسی بنا پر کلام مذکور کو "اشعار معلقہ" کہا جاتا تھا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ جب بازار عکاظ میں سخن کی یہ تاثیر اور قدر دانی دیکھتے تو بعض اوقات وہاں شعرا کا کلام سننے چلے جاتے۔ ایک روز جب کعب بن زہیر اپنا کلام سنا رہا تھا، محمد ﷺ نے اپنا جبہ مبارک اُتار کر اُس کو انعام میں دے دیا۔

بازار عکاظ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہاں ہمسایہ مملکتوں کے سلاطین اپنے ہاں کی گراں بہا اشیا مثلاً شمشیر یا زربفت کا کپڑا فروخت کے لیے بھجوایا کرتے تھے اور ان اشیا کو خریدنے کے متعلق عربوں کا یہ اُصول تھا کہ خود کو سخنوری میں سب سے برتر ثابت کر دیں۔ متوقع خریدار مخصوص نشستوں پر علیحدہ علیحدہ بیٹھ جایا کرتے اور اشعار میں اپنا قصیدہ کہتے۔ ان اشعار میں اپنی شجاعت کے قصے اور حسب نسب بیان کیا کرتے۔ جو حضرات خود شاعر نہ ہوتے وہ کسی شاعر کی خدمت حاصل کرتے اور شاعر اُن کے بیان کو اشعار میں ڈھالتا۔ قاضی کا فیصلہ جسے برتر قرار دیتا اُسے وہ چیز خریدنے کی اجازت ہوتی۔

سخن وری اعراب میں اس قدر اہمیت حاصل کر گئی تھی کہ ہر رئیس قبیلہ کو شعر گوئی کرنا ہوتی تھی۔ عربی میں اسی لیے امیر و سعید وغیرہ الفاظ سخن وروں کے لیے مخصوص تھے۔ عربوں کا ایک معروف شاعر امرؤ القیس ہے۔ مسلمان اُسے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ امرؤ القیس عرب کے

۱۔ بازار عکاظ عرفات کے قریب لگتا تھا۔ اصمعی کے بقول کھجوروں کے جھنڈ کا نام عکاظ تھا۔ جنگ فجار یہیں برپا ہوئی تھی۔ یہ میلہ ذی قعد کے آخری نصف میں لگتا تھا۔

اُن سات نامی گرامی شاعروں میں سے تھا جن کے قصائد دیوارِ کعبہ پر آویزاں ہوئے۔ وہ ان سب سے زیادہ برجستہ شعر کہتا تھا۔ یہ سات قصائد اس قدر فصیح و بلیغ ہیں کہ انسان کو حیرت ہوتی ہے۔ میں نے ان سے زیادہ برجستہ کلام عربی زبان میں نہیں پڑھا، بجز قرآن پاک کے۔ یہ سات قصائد جو دورِ جاہلیت کی نشانی ہیں، انتہا کی لطافت و فصاحت رکھتے ہیں۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ بھی بقول حضرت عائشہؓ امرؤالقیس کے کلام کو پسند فرماتے تھے۔

آج بھی ناخواندہ افراد (بدوی) بعض شاعروں کا کلام حفظ کیے ہوتے ہیں۔ ابن ہشام، ابوداؤد، ابنِ حنبل، حمید اللہ اور ابنِ سعد نے جو سیرت النبی کے محققین میں شمار ہوتے ہیں، تصدیق کی ہے کہ محمد ﷺ شعر کو پسند فرماتے تھے اور گاہے عرب شاعروں کا کلام پڑھا کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو باعثِ حیرت ہوتا کیوں کہ اُس دور میں شعر عربوں کے لیے ہوا اور پانی کی طرح زندگی کے لازمہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ محمد ﷺ میں ایک بدوی عرب کی تمام اچھی صفات موجود تھیں۔ اگر آپ کی بعثت کے بعد لوگ انھیں اچھا کہتے تو ممکن تھا کہ اُس میں جذبہ وعقیدت شامل ہوتا۔ مگر ۲۵ سال قبل از بعثت ہی لوگ انھیں امین اور صادق کے لقب دے چکے تھے۔

ہم لفظ ''امین'' کو ایک ہی معنی میں لیتے ہیں یعنی امانت دار، مگر عرب ''امانت'' کو دو معنوں میں لیتے ہیں، درستکاری اور وفاداری۔ امانت کی صفت کی طرح محمد ﷺ کا صبر بعثت سے بہت پہلے مشہور ہو چکا تھا اور شاید اسی لیے کہ یہ صفت محمد ﷺ تھی۔ خداوند کریم نے قرآن پاک میں صبر کے متعلق بار بار فرمایا۔ صبر ویسے بھی عربوں کے لیے ایک بہت بڑی تعریف تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ''دنیاوی مال کا چلا جانا اور مفلس ہو جانا کوئی عیب نہیں ہے لیکن اس موقع پر بے صبری اور بے قراری کا اظہار کرنا بہت بُرا ہے''۔

پیغمبرِ اسلام کی صفات صدق، صبر، امانت داری اور وفاداری بعثت سے بہت پہلے ہی قریش میں مشہور ہو چکی تھیں۔ امام ابوداؤد اپنی کتاب سنن میں لکھتے ہیں: رسولِ خدا ﷺ تیس سال کے تھے کہ ایک سوداگر آپ ﷺ سے ایک جگہ ملاقات کا وعدہ کر گیا کہ واپس آ کر

آپ سے تجارت کے متعلق بات چیت کروں گا۔ وہ شخص اپنا وعدہ بھول گیا اور اُس روز واپس نہ آیا۔ تین روز بعد اتفاقاً اس کا گزر اُس جگہ سے ہوا تو حیرت سے کیا دیکھتا ہے کہ محمد ﷺ وہیں بیٹھے ہوئے تین روز سے اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔

اس زمانے میں سونا عربستان اور ساری دنیا میں کم یاب تھا۔ ۵ گرام کا ایک طلائی سکہ غریب آدمی کے لیے ایک جہان کی دولت ہوتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ ایامِ جوانی میں ایک تاجر بنام قیس بن زید کے پاس کام کرتے تھے۔ وہ اپنی اشیا محمد ﷺ کو دے کر فروخت کے لیے لمبے سفر پر بھیج دیا کرتا تھا۔ محمد ﷺ مالِ تجارت کو فروخت کر کے تقریباً پندرہ سو سے دو ہزار تک سکہ طلائی اُسے لا کر دیا کرتے تھے۔ ایسا بھی تو ممکن تھا کہ آپ اتنی بڑی رقم لے کر کسی اور مملکت میں چلے جاتے اور عیش وعشرت سے زندگی بسر کرتے لیکن آپ کی امانت داری کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپ کے حساب میں فرق نہیں آیا کرتا تھا۔ جب آپ نے قیس کی ملازمت چھوڑی تو اس نے کہا تھا: ''اے محمد ﷺ! میں تم پر قربان جاؤں۔ اس کے بعد مجھے تم جیسا امانت دار اور نجیب آدمی نہیں ملے گا''۔

جب بھی محمد ﷺ تجارت کی غرض سے سفر کا ارادہ فرماتے، کئی ایک تاجر اُن کی امانت داری کی وجہ سے اُن سے خواہش کرتے کہ اُن کی اشیا بھی ساتھ لیتے جائیں اور وہ اس کام کا صلہ دینے کو کہتے مگر محمد ﷺ ان کی اشیا ہمراہ لے جا کر بیچ تو دیتے مگر جیسا کہ قیس بن زید کہتا ہے، اُس کام کا صلہ نہیں لیا کرتے تھے۔

امام ابنِ حنبل اپنی مرتب کردہ کتاب المسند میں لکھتے ہیں: ''محمد ﷺ جب مسافرت سے لوٹتے تو تمام دوستوں کا فرداً فرداً حال معلوم کرتے اور جیسے ہی محسوس کرتے کہ اُن کی مالی حالت اچھی نہیں تو اپنی مزدوری میں سے کچھ اُن میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ یہ کام ایک سوداگر کے لیے توجہ کا باعث ہے''۔

پہلی جنگ جس میں حضرت محمد ﷺ نے شرکت کی وہ قریش کے دس قبیلوں اور جنوبی صحرا کے ایک قبیلے کے درمیان ہوئی تھی۔ اُس قبیلے نے ماہ ہائے حرام میں جنگ کی پابندی کو توڑا تھا۔ حرام مہینوں میں عرب جنگ نہیں کیا کرتے تھے اور نہ کاروانوں پر حملہ کرتے تھے۔

مکہ کے لوگ حرام مہینوں کی پابندی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے یہ جنگ نہ کرنے کی پابندی ختم ہو جاتی تو لوگ زیارت کعبہ کے لیے مکہ کا سفر چھوڑ دیتے اور مکہ کے بازاروں میں کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔ حرام مہینوں کے سوا دوسرے تمام مہینوں میں جو کاروان سفر کرتے اور صحرا کو عبور کرتے، وہ باج ادا کیا کرتے تھے تاکہ راہزن انھیں نہ لوٹیں، لیکن حرام مہینوں میں کسی کو حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ کاروانوں سے باج لے یا لوٹے۔ اگر کوئی راہزن یا قبیلہ کسی کاروان کو لوٹتا تو قریش کے قبائل اُس سے جنگ کیا کرتے تھے۔ عربستان میں اگر ایک فرد جرم کرتا تو اُس کا وبال اُس کے قبیلے پر آتا تھا۔ دوسرے قبیلے اُس مجرم کے قبیلے سے انتقام لیتے تھے۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ جنگ، جو قبائل قریش اور حرام مہینوں کی خلاف ورزی کرنے والے قبیلے کے درمیان ہوئی، کس سال اور کس تاریخ کو ہوئی۔ عرب مؤرخین نے دقیق نگاہی سے ان وقائع کو رقم نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

مگر یہ ثابت ہے کہ خدا کے رسول محمد ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب اور دوسرے افراد قبیلہ کے ہمراہ اس جنگ میں شرکت فرمائی تھی۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ اُس موقع پر خردسال تھے۔ وہ اپنے چچا ابو طالب کا ترکش اُٹھاتے اور انھیں کمان میں چڑھانے کے لیے تیر پکڑاتے تھے۔

بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمد ﷺ نے باقاعدہ تلوار سے جنگ کی تھی اور عہد شکن قبیلے کے رئیس (بوبرہ) کو زخمی کیا تھا۔



حلف الفضول: ایک رضا کارانہ تنظیم

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ محمد ﷺ کس سن و سال میں اس چھوٹی سی سپاہیانہ تنظیم میں شامل ہوئے یا اُس کی تشکیل کب اور کس سن میں فرمائی۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ مورخین نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بعثت سے قبل کے حالات زندگی کو تفصیل کے ساتھ قلمبند نہیں کیا۔ بعض کتب میں کچھ واقعات مذکور ہیں مگر دوسری کتابیں خاموش ہیں۔

حلف الفضول دراصل ایک رضا کارانہ تنظیم کا معاہدہ تھا جو مکہ کے جوانوں پر مشتمل تھی۔ اس تنظیم کا واحد مقصد مظلوم کی دادرسی اور دفاع تھا۔ اس میں شامل جوان رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے اور کوئی حقِ خدمت وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اس تنظیم کی تشکیل کی وجوہ ذرا وضاحت طلب ہیں: بدوی عرب انفرادی حیثیت میں اپنے کسی عمل کا جوابدہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی قبیلے کا ایک فرد کسی دوسرے قبیلے کے فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کے قبیلے سے انتقام لیتا تھا نہ کہ اُس قاتل فرد سے۔ صحراؤں میں ہر نوع کے جرم کا الزام مجرم کے قبیلے پر لگایا جاتا تھا نہ کہ اُس شخص پر جس نے جرم کیا ہو۔

جب بدوی عرب شہر نشین ہوئے اور مکہ میں سکونت اختیار کر لی تو عدل کا حصول ذرا مشکل ہو گیا، اس لیے کہ کوئی بھی ایک قبیلہ قریش کے دس قبیلوں سے انتقام لینے کی سکت نہیں رکھتا تھا جو مکہ میں مقیم تھے۔ مکہ میں ان دنوں نہ پولیس تھی اور نہ عدالت۔ ہر قبیلہ اپنے اختلافات اپنے بزرگوں کے سامنے پیش کرتا اور کسی قسم کا اندرونی اختلاف قبیلے سے باہر نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ ان حالات میں جب کوئی خارجی دشمن مکہ پر حملہ آور ہوتا تو قریش کے قبائل اکٹھے ہو کر دفاع کرتے اور اُسے بھگا دیتے تھے۔

ان حالات میں اگر کسی بدوی عرب پر مکہ آنے کے بعد ظلم ہوتا تو اُس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ واپس صحرا میں جا کر اپنے قبیلے کو لائے اور ظلم کرنے

والے قبیلے سے جنگ کر کے طاقت کے بل پر اپنا حق وصول کرے یا تسلیم کرائے۔ لہٰذا جب کبھی کوئی قبیلہ اپنے حق کو تسلیم کروانے کے لیے مکّہ پر چڑھائی کرتا تو اُسے قریش مکّہ کی متحدہ قوت کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب بھی باہر سے آیا ہوا کوئی شخص مکّہ میں ظلم و زیادتی کا نشانہ بنتا تو اُس کے لیے اپنے حق کی بازیابی مشکل ہو جاتی۔ ''سہیلی'' ایک عربی مؤرخ لکھتا ہے: حج کے موقع پر جنوبی صحرا سے ایک عربی اپنی جوان بیٹی کے ساتھ مکّہ زیارت کے لیے آیا۔ مکّہ میں ایک ثروت مند تاجر نے اُس کی لڑکی کو اغوا کر لیا۔ اب باپ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ صحرا میں واپس جا کے اپنے قبیلے کو جنگ کے لیے تیار کرے اور اس کے ہمراہ واپس مکّہ آ کر تاجر (اغوا کنندہ) کے قبیلے سے جنگ کرے۔ اغوا کنندہ تاجر جانتا تھا کہ اُس عرب کا قبیلہ چھوٹا سا ہے اور اُن میں یہ جرأت نہیں کہ قبیلہ قریش کو دعوتِ مبارزت دیں۔

قریش کے رضا کار جوان مظلوم کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور خانہ کعبہ کے اردگرد اکٹھے ہو کر مندرجہ ذیل قسم کھائی:

> ہم عہد کرتے ہیں کہ مظلوم کی اس حد تک حمایت کریں گے کہ ظالم مجبور ہو کر مظلوم کا حق واپس کر دے۔ اس راہ میں ہم کسی قسم کے لالچ اور حرص کو آڑے نہیں آنے دیں گے۔ یہ حمایت بلا تفریق امیر و غریب ہوگی۔

یہ عہد کر کے قریشی جوانوں (بشمول محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے حجر الاسود کو آبِ زمزم سے غسل دے کر اُس پانی کو پیا تاکہ عہد پختہ ہو جائے۔ بعد ازیں جوانانِ قریش اُس تاجر کے گھر کی طرف چل دیے۔ گھر کا محاصرہ کیا اور تاجر کو دھمکی دی کہ اغوا شدہ لڑکی کو، جس حالت میں کہ وہ اغوا کی گئی تھی، اُس کے باپ کو فوری واپس کر دے۔ دولت مند تاجر نے ایک رات کی مہلت مانگی اور کہا کہ صبح وہ لڑکی کو واپس کر دے گا۔ مگر قریشی رضا کاروں نے اُس کی درخواست رد کر دی اور کہا لڑکی فوراً اُس کے باپ کو لوٹا دو۔ تاجر مجبور ہو گیا کہ لڑکی کو واپس کرے۔

ایک اور موقع پر ابو جہل نے مکّہ سے باہر کے ایک تاجر سے کچھ اشیا خریدیں، مگر ان کی قیمت ادا نہ کی۔ تاجر کو اس رضا کار تنظیم (حلف الفضول) کا علم نہیں تھا۔ لہٰذا وہ صحرا جا کر اپنے

قبیلے کو مکّہ لے آیا مگر وہ چھوٹا سا قبیلہ قریش کا مقابلہ نہ کر سکا۔ حضرت محمد ﷺ کو جب ان سب حالات کا علم ہوا، آپ ﷺ ابو جہل کے پاس گئے اور اُسے رقم ادا کرنے کو کہا۔ ابو جہل نے تاجر مذکور کو رقم ادا کر دی۔ ان واقعات کے بعد جب بھی باہر کے کسی فرد پر کوئی ظلم ہوتا تو یہ رضا کار سپاہ (حلف الفضول) اُس کی حمایت کو پہنچ جاتی۔

بعثت کے بعد رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں رضا کار سپاہ میں اپنی شمولیت پر بہت خوش اور سرفراز تھا، حتیٰ کہ اگر کوئی مجھے ایک سو اونٹ سُرخ بالوں والے دے کر تنظیم کو چھوڑ دینے کے لیے کہتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔

اس تنظیم (حلف الفضول) کو استوار کرنا قبل اس کے کہ آپ ﷺ رسالت پر مبعوث ہوں، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ محمد ﷺ کی اس رضا کار تنظیم کی کارکردگی کے باعث عرب قبائل میں تحفظِ حقوق کی بابت ایک انقلاب آ گیا۔ انتقام لینے کی اصل متزلزل ہو گئی۔

یہ رضا کار تنظیم جو مظلوموں کی حمایت کے لیے وجود میں آئی تھی، اسے ایک چھوٹا سے واقعہ تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔

اس تنظیم کے اجرا سے پہلے کسی فرد کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ کسی گناہ گار سے باز پرس بھی کی جا سکتی ہے یا ایک مظلوم کا جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی اس طرح بھی ہو سکتی ہے۔ اگر مظلوم کسی طاقت ور قبیلے سے ہوتا اور وہ قبیلہ اُس کے حق کی بازیابی کے لیے تیار ہوتا تو ٹھیک، وگرنہ اُس کا حق ضائع ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ایک مقتول کا قبیلہ اگر مصلحتاً جانبازی سے گریز کر جاتا تو اُس کا خون رائیگاں چلا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ مظلوم جو ظالم سے اپنا حق واپس چھین لینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے وہ اس عار کو برداشت کر جاتے اور تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی ان اجتماعی قبائلی قوانین میں تغیر آ سکتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی قابلِ ستائش اخلاقی صفات سے قطع نظر آپ پیشتر اس کے کہ درجۂ رسالت پر پہنچتے، یکتائے روزگار تھے۔ بعثت سے پہلے حضرت محمد ﷺ کے عمل و فکر کا ایک حصہ ایسا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک عظیم انسان تھے اور بلا شک و شبہ دوسروں

سے اعلیٰ تر استعداد کے مالک تھے۔ آپ کا ذہن اجتماعی، سیاسی و معاشرتی مسائل کا اس طرح احاطہ کرتا تھا کہ دوسروں کے ذہن اُن بلندیوں کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ کے چچا ابو طالب، آپ ﷺ کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر اپنی مفلسی کی وجہ سے بھتیجے کی وابستگی یا اُن کی صلاحیتوں سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتے تھے، حالانکہ تاجرانِ مکّہ میں اُن کی امانت داری کی بہت شہرت تھی اور وہ ہمیشہ خواہش مند رہتے کہ محمد ﷺ اُن کے تجارتی کام انجام دیں۔

مکّہ میں ایک تاجر عورت تھی جس کا نام خدیجہؓ تھا۔ خدیجہؓ کی عمر اس وقت چالیس سال تھی جب کہ محمد ﷺ پچیس سال کے تھے۔ خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو دعوت دی کہ وہ اُن کے تجارتی قافلوں کے ساتھ تشریف لے جایا کریں۔ آپ ﷺ نے اس پیشکش کے متعلق اپنے چچا ابو طالب سے ذکر کیا اور مشورہ مانگا کہ آیا وہ اس پیشکش کو قبول کریں یا نہ؟ ابو طالب نے کہا کہ میرا مشورہ ہے کہ تم اُس کی پیشکش قبول کر لو۔

محمد ﷺ نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا آپ میرے تجارتی قافلہ کے ہمراہ ملک شام کو جائیں گے۔ اس سفر میں میرے خاندان کے دو افراد آپ کا ساتھ دیں گے۔ ایک تو میرے برادر زادہ (خزیمہ) ہوں گے اور دوسرا میرا غلام (میسرہ)

محمد ﷺ کی سرپرستی میں اس کاروان نے سفر شروع کیا اور ملک شام سے ہوتا ہوا یہ کارواں بُصریٰ[1] جا پہنچا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، بُصریٰ میں ایک مانوی زاہد بحیرا کی خانقاہ تھی، لیکن اس سفر میں جب محمد ﷺ وہاں پہنچے تو وہ وفات پا چکا تھا۔ اُس کی جگہ اُس کا ایک پیروکار جس کا نام نسطوریوس تھا، اب وہاں رہ رہا تھا۔ نسطوریوس بحیرا کے پائے کا عالم تھا یا نہیں، تاریخ اس سلسلے میں خاموش ہے، پھر بھی نسطوریوس نے جب محمد ﷺ کو دیکھا تو بحیرا کے الفاظ دہرائے کہ خداوند کا کسی ایک دین یا ملت پر انحصار نہیں۔ یہودی جو کہتے ہیں کہ خداوند نے ملتِ یہود کو تمام ملتوں سے برگزیدہ کیا ہے اور خدا پرستی ملتِ یہود کے لیے مخصوص

۱- بُصریٰ، شام کا ایک شہر ہے جو دمشق کے جنوب میں تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسے بُصری الشام بھی کہتے تھے۔ اِدھر بصرہ جنوبی عراق کی مشہور بندرگاہ ہے جو شط العرب کے کنارے واقع ہے۔

کر دی گئی ہے، یہ یہودیوں کی خود پسندی ہے وگرنہ تمام ملت ہائے جہاں خداوند کی پرستش کر سکتی ہیں خواہ وہ یہودی ہوں یا عرب۔

نسطوریوس نے محمد ﷺ سے کہا کہ عربوں میں ایک پیغمبر آئے گا جو ان کے بیش تر عقائد کو تبدیل کر دے گا۔ شام کے سفر سے واپسی پر حضرت خدیجہؓ نے حضرت محمد ﷺ کو ایک اونٹ نر بطور معاوضہ دیا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ایک سرخ اونٹ کی قیمت کیا تھی۔ اُس کی قیمت ہم دوسری اشیا کی مقدار سے متعین کریں گے۔

اُس زمانے میں ایک نر اونٹ کی قیمت چار صد درہم ہوتی تھی، جب کہ ایک غلام کی قیمت ایک سو پچاس تا آٹھ سو درہم ہوتی تھی۔ غلام کی قیمت کا تعین اُس کی جوانی، بڑھاپے، اور ظاہری صورت کو سامنے رکھ کر کیا جاتا تھا۔ مکّہ میں ایک بکری کی قیمت چالیس درہم اور ایک بھیڑ کی قیمت پچیس درہم سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ ایک نیزے کی قیمت چار درہم اور اونٹ کا ایک کجاوہ تیرہ درہم میں ملتا تھا۔ ایک مٹی کھودنے والی گینتی کی قیمت چھ درہم اور ایک نان (روٹی) کی قیمت ۶/ا درہم تھی۔ مکّہ میں نان کی قیمت انتہائی طور پر بہت زیادہ تھی۔ صرف مالدار لوگ نان کھاتے تھے۔ دوسرے تمام لوگ نان نہیں کھا سکتے تھے اور عوام کی غذا کھجوریں اور اونٹ کا دودھ تھی۔

محمد ﷺ شام سے واپسی پر خدیجہؓ کے دیے گئے معاوضہ سے خوش تھے اور خدیجہؓ آپ ﷺ کی کارکردگی سے بہت خوش، لہٰذا آپ کو دوبارہ قافلے کے ساتھ سفر پر روانہ کر دیا گیا۔



ازدواجِ محمد ﷺ

حضرت محمد ﷺ جب دوسرے سفر سے لوٹے تو سفر کے حالات بتانے اور حساب کتاب دینے کے لیے حضرت خدیجہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ محمد ﷺ ایک زیبا جوان تھے۔ اُن کی آنکھیں اور بال سیاہ چمکدار اور لمبے تھے جو دونوں شانوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ عربوں کی رسم کے مطابق بالوں کے درمیان مانگ نکالتے تھے۔ بات چیت میں زیادہ تر تبسم فرماتے تھے اس طرح کہ دانتوں کی سفیدی نمایاں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کا دہن مبارک خوش ترکیب تھا۔ زیبائی و خوب صورتی کے علاوہ آپ کے بدن سے جو خوشبو آتی، لوگوں کو آپ سے میل جول کا خواہاں بناتی۔ اُن دنوں عرب میں عطر کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ مکہ و مدینہ میں بدن کو معطر کرنا نیز خانہ کعبہ اور رہائشی مکانات کو معطر رکھنے کا عام رواج تھا۔

حضرت محمد ﷺ سج سج سے گفتگو کرتے تھے یعنی کلمات کو اس طرح ادا کیا کرتے تھے کہ ہر لفظ ذہن میں اترتا چلا جاتا تھا اور الفاظ کو شمار کیا جا سکتا تھا۔ آپ ﷺ کا یہ طرزِ تکلم نہایت درجہ پُر تاثیر تھا۔ آپ ﷺ جو کچھ ارشاد فرمایا کرتے، سننے والے کے ذہن میں ایسا بیٹھ جاتا کہ وہ اُسے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ جب محمد ﷺ نے حساب کتاب سمجھا دیا تو خدیجہؓ نے آپ ﷺ سے بلا واسطہ چند سوال کیے، تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ یہ امانت دار نوجوان شادی کی فکر میں ہے یا نہیں، مگر جو جواب محمد ﷺ نے دیے، اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ شادی کا خیال ابھی اُن کے ذہن میں نہیں ہے۔

تاہم خدیجہؓ حوصلہ نہ کر سکیں کہ براہِ راست شادی کی درخواست کریں۔ خدیجہؓ نے اس وقت تک دو شادیاں کی تھیں۔ اُن کی اولاد میں ایک لڑکا بنام ہند اور ایک لڑکی بہ اسم ہندہ تھیں۔ خدیجہؓ مکہ میں ایک تاجرہ کی حیثیت سے ہی معروف تھیں اور ایک بہترین مکان میں رہتی تھیں۔ حضرت محمد ﷺ سے نکاح میں تین چیزیں مانع تھیں:

اوّل: حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔ اولاد میں ایک جوان لڑکا اور ایک لڑکی۔ محمد ﷺ کی عمر اُس وقت پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

دوم: خدیجہؓ بہت مالدار تھیں اور محمد ﷺ اُسی نسبت معاشی اعتبار سے کم زور تھے۔

سوم: عربوں کے رسم و رواج کے مطابق حضرت محمد ﷺ اور خدیجہؓ کے قبیلوں کی رضامندی و منظوری کا مسئلہ تھا۔ خدیجہؓ کا قبیلہ اس نکاح کی موافقت میں نہیں تھا۔

خدیجہؓ خود تو محمد ﷺ سے براہِ راست شادی کی بات نہ کر سکیں لیکن یہ کام اپنے غلام میسرہ کے سپرد کیا کہ وہ محمد ﷺ سے اس موضوع پر بات کرے۔ میسرہ نے محمد ﷺ سے کہا: خدیجہؓ بیوہ ہیں۔ کیا آپ اُن سے شادی کر لینے پر آمادہ ہیں؟ آپ کو میسرہ کے اس سوال پر بہت حیرت ہوئی اور فرمایا: خدیجہؓ ایک دولت مند عورت ہے اور میں غریب۔ لہٰذا یہ شادی غیر موزوں ہے۔ دوسرے میں نے سنا ہے کہ مکہ کے کئی ایک ثروت مند تاجر خدیجہؓ کے خواستگار ہیں۔ خدیجہؓ نے اُن میں سے کسی کو قبول نہیں کیا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ عورت مجھ جیسے غریب مرد (ﷺ) سے شادی کرے گی۔

میسرہ نے حضرت محمد ﷺ کے خیالات خدیجہؓ تک پہنچا دیے اور کہا: میں نہیں سمجھ سکا آیا وہ تجھ سے شادی کرے گا یا نہیں؟ خدیجہؓ نے ایک عورت بنام نفیسہ کی خدمات حاصل کیں اور اُسے مامور کیا کہ وہ محمد ﷺ سے بغیر کسی ابہام کے بات کرے۔

نفیسہ طبقہ مولدہ سے تھی یعنی پیدائشی طور پر عرب نہ تھی، اس لیے وہ بات چیت میں عربی رسم و رواج کی پابندی کو کم ہی ملحوظ رکھا کرتی تھی۔ یعنی وہ بغیر اشارہ و کنایہ کے براہِ راست بات کرتی تھی۔ نفیسہ نے محمد ﷺ سے مل کر کہا: آپ جوانِ زیبا ہیں، شادی کیوں نہیں کرتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری مالی حالت اچھی نہیں کہ میں بیوی اور اولاد کا بوجھ اُٹھا سکوں۔ نفیسہ نے کہا: آپ محنتی جوان ہیں، اپنے ہونے والے خانوادے کی کفالت کر سکتے ہیں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: میرے چچا ابو طالب بوڑھے ہو گئے ہیں اور وہ تنگدست بھی ہیں۔ میں جب بچہ تھا انھوں نے میری سرپرستی فرمائی۔ اب جب کہ میں جوان ہو گیا ہوں، انھیں

اوران کے خانوادے کوعسرت میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اُن کی مدد کرنی چاہیے۔

نفیسہ نے کہا: آپ ایسی عورت سے شادی کر سکتے ہیں، کہ خانوادے کی کفالت سے بے فکری ہو جائے۔

محمد ﷺ نے کہا: ایک امیر عورت ایک امیر مرد کو پسند کرے گی نہ کہ مجھ جیسے غریب کو۔

نفیسہ نے کہا: خدیجہؓ آپ ﷺ سے شادی کرنے پر مائل ہیں۔ اب اگر آپ راضی ہو جائیں تو یہ شادی ہو سکتی ہے۔ آپ ﷺ گہری سوچ میں چلے گئے۔

آپ ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا کہ خدیجہؓ خود شادی پر آمادہ ہیں تو فرمایا: میں اس موضوع پر خدیجہؓ سے خود بات کروں گا۔ ایک روز بعد حضرت محمد ﷺ خدیجہؓ سے ملے اور شادی کی بابت اُن سے معلوم کیا۔ خدیجہؓ نے نفیسہ کی تصدیق فرمائی اور اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

چونکہ خدیجہؓ ایک چالیس سالہ بیوہ تھیں اور اولاد میں دو بچے بھی تھے، عربوں کی رسم کے مطابق اُس کے قبیلہ (بنی اسد) کی اس رشتے میں موافقت ضروری تھی۔ خدیجہؓ کے قبیلے کے رئیس عمرو بن اسد نے کہا: بلاشبہ محمد ﷺ امین و صابر ہیں مگر غریب ہیں اور جب دوسرے قبائل کو معلوم ہوگا کہ خدیجہؓ نے ایک غریب مرد سے شادی کی ہے تو وہ ہمیں طعن کریں گے کہ کیا مردوں کا قحط تھا کہ خدیجہؓ نے محمد ﷺ کی زوجیت اختیار کی۔ ابوطالب نے جب دیکھا کہ محمد ﷺ کے لیے یہ شادی سودمند ثابت ہوگی تو انھوں نے رئیس قبیلہ بنو اسد اور چند دوسرے سرکردہ افراد کو ایک دعوت میں شرکت کے لیے بُلا بھیجا۔ کھانے کے بعد ابوطالب یوں گویا ہوئے:

محمد ﷺ امیر نہیں ہے لیکن ایک نیک نام مرد اور خانوادۂ ہاشمی سے ہے۔ حسب ونسب میں اگر وہ بنو اسد سے بڑھ کر نہیں تو کمتر بھی نہیں ہے۔ اس بات کو بھی چھوڑیے۔ خوب صورت جوان ہے۔ جوانی اور رعنائی بھی ایک دولت ہے۔ اگر تم اس کی شادی کی مخالفت کرو گے تو فقط محمد ﷺ ہی نہیں خدیجہؓ بھی دلگیر ہوگی۔ خدیجہؓ کو ممکن ہے ایک مالدار شوہر مل جائے مگر قبیلہ ہاشمی کے محمد ﷺ جیسا زیبا اور نیک نام جوان نہیں ملے گا"۔

ابوطالب کی باتوں سے عمرو بن اسد بہت متاثر ہوا اور وہ اس شادی پر رضامند ہو گیا۔

عربوں میں رسم تھی کہ شادی کے موقع پر شوہر مہر ادا کرتا تھا۔ محمد ﷺ نے خدیجہؓ کو جو مہر ادا کیا وہ پانچ سو درہم تھا۔ اس رقم سے دو اونٹ بھی نہیں خریدے جا سکتے تھے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ عرب کے وقائع نگاروں نے حق مہر میں اونٹ کیوں لکھا ہے جب کہ صحیح یہی ہے کہ حق مہر پانچ سو درہم ادا ہوا تھا۔

شادی کے موقع پر حضرت محمد ﷺ کی دایہ بی بی حلیمہ صحرا سے آئیں اور حضرت خدیجہؓ نے انھیں پانچ اونٹ دیے۔ اس کے بعد بی بی حلیمہ کئی بار آئیں اور اپنے رضاعی بیٹے سے چالیس بھیڑیں اور ایک اونٹ حاصل کیا۔ جب تک بی بی حلیمہ زندہ رہیں محمد ﷺ انھیں بھولے نہیں بلکہ قدردان رہے اور اپنی دایہ کی مدد فرماتے رہے۔

شادی کے بعد سب سے پہلے محمد ﷺ نے جو کام کیے وہ یہ تھے کہ علی بن ابو طالب کو اپنی سرپرستی میں لے کر اُس کی معاش کا بندوبست کیا اور ایک عیسائی غلام زید بن حارثہ جو کہ شام کا رہنے والا تھا اور حضرت خدیجہؓ نے محمد ﷺ کی خدمت میں دیا تھا، اس کو آزاد کر دیا۔ آزاد ہو جانے کے باوجود وہ محمد ﷺ ہی کی خدمت میں رہا۔

زید بن حارثہ کے والدین کو علم نہیں تھا کہ اُن کا لڑکا زندہ ہے۔ جب انھیں اطلاع ہوئی کہ اُن کا لڑکا زندہ ہے تو وہ مکہ آئے کہ اپنے لڑکے کو اپنے ساتھ شام واپس لے جائیں مگر زید نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا: محمد ﷺ میرے لیے میرے والدین سے بہتر ہیں۔

محمد ﷺ نے خدیجہؓ سے شادی کے بعد تنگ دستی سے نجات پائی اور جب تک زندہ رہے آپ ﷺ کی یہی کوشش رہی کہ تہی دستوں کی مدد کریں اور اُن کو مسکینی سے نجات دلائیں۔ قرآن پاک سے زیادہ کسی اور آسمانی کتاب میں محتاجوں اور تہی دستوں کی مدد کرنے کی نصیحت نہیں کی گئی۔

خداوند کریم، قرآن کی سورۃ والضُّحیٰ میں محمد ﷺ سے فرماتے ہیں:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ٥ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ٥ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ٥ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ٥ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ٥ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ٥

کیا اُس نے تم کو یتیم نہیں پایا، پھر ٹھکانا فراہم کیا؟ اور تمھیں ناواقفِ راہ پایا، پھر ہدایت بخشی۔ اور تمھیں نادار پایا، پھر مالدار کر دیا۔ لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے رب کی نعمت بیان کرو۔ [والضحیٰ ۹۳:۶-۱۱]

حضرت محمد ﷺ کا زندگی کے آخری لمحے تک یہ شعار رہا کہ کوئی انسان سرگرداں اور بھوکا نہ رہے۔ مغرب کے مؤرخین نے جو اسلام سے قبل عربوں کی زندگی کے متعلق نہیں جانتے تھے، لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد محمد ﷺ کی زندگی میں شان و شکوہ آ گیا تھا، حالانکہ محمد ﷺ نے زندگی کے آخری سانس تک شان و شکوہ کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی اور آنحضرت ﷺ کی تقلید میں خلفائے راشدین نے بھی انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔ ہاں بنی اُمیہ جب اقتدار میں آئے تو انھوں نے شان و شوکت کو اپنایا اور اُس کا اظہار کیا۔

حضرت محمد ﷺ بدوی عرب تھے اور دوسرے بدوی عربوں کی طرح قناعت پسند تھے۔ کھانے پینے کا فطری تقاضا پورا کرنے کے لیے انھیں جو کچھ بیابان میں میسر آتا اُسی پر قناعت کرتے تھے۔ صرف ایک چیز میں وہ شان و شکوہ کا خیال رکھتے تھے اور وہ اُس عہد کی رسم کے مطابق عطر کا استعمال تھا۔ عرب پینے کے پانی تک کو بھی معطر کر لیتے تھے۔ اسی بنا پر قرآن پاک کی سورۃ ۷۶ میں خداوند نے فرمایا:

''بہشت میں طبیعت کو بھانے والا پانی ہے جسے مشک و کافور سے معطر کیا گیا ہے''۔

بدوی عرب اپنی غذا اونٹ سے حاصل کرتے تھے یعنی اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ۔ عربستان کے صحراؤں میں اگر اونٹ نہ ہوتا تو وہاں زندگی کے آثار ناپید ہوتے۔

اونٹ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی استقامت اور استطاعت بخشی ہوئی ہے کہ وہ صحرا کی سختیوں کے مقابلے میں زندہ رہ سکتا ہے اور مالک کی زندگی کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ اونٹ ایک ایسا جانور ہے جو موسمِ گرما کی شدت میں دس دن تک عرب کے گرم صحراؤں میں بغیر کچھ کھائے پیے زندہ رہ سکتا ہے اور اس میں کمزوری کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔

ہم انسانوں کو ایک گھنٹے میں چالیس گرام پسینہ آتا ہے اور ایک یورپی باشندہ جو صحرا میں

زندگی بسر کرنے کا عادی نہ ہو، گرمیوں کے موسم میں (صحرائے عرب میں) راہ چلتے ہوئے ۱۲۰۰ گرام یعنی ایک لٹر پسینہ خارج کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم یورپی صحرائی سفر میں بے حال ہو جاتے ہیں اور جلد ہی ہمارے بدن سے پانی کی بہت زیادہ مقدار پسینے کی صورت میں خارج ہو جاتی ہے۔

اُصولاً اگر پانچ فی صد پانی اس طرح بدن سے خارج ہو جائے تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے اور اگر یہ مقدار دس فی صد تک پہنچ جائے تو انسان ہذیان اور تپ شدید سے دوچار ہو جاتا ہے اور اگر یہ مقدار بارہ فی صد تک پہنچ جائے تو انسان کو بے ہوشی آ لیتی ہے، پھر کوئی چارہ زندہ رہنے کے لیے کارگر نہیں ہوتا اور موت یقینی ہو جاتی ہے۔

لیکن اونٹ صحرا کی شدید گرمی میں اپنے جسم کا پچیس فیصد تک پانی بھی اگر پسینے کی صورت میں خارج کر دے، پھر بھی اُس میں ضعف کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اور وزن اُٹھانے میں اُسے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اونٹ میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بغیر پانی پیے دس دن اور دس راتوں تک مالک کو پیٹھ پر اُٹھا کر صحرا میں سفر کر سکتا ہے۔ اس دوران بس اتنا ہی کافی ہے کہ اُسے دن میں دو دفعہ تھوڑی دیر کو کھلا چھوڑ دے تاکہ وہ کانٹے دار جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر لے۔

دس روز کے سفر کے بعد اونٹ سوتا نہیں صرف بیٹھتا ہے۔ جب تک اُسے اُٹھایا نہ جائے، وہ خود بخود نہیں اُٹھتا الا یہ کہ وہ بھوک اور پیاس محسوس کرے۔

بدوی عرب اونٹ کی اِس خُو سے اس قدر بہرہ ور ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ صبر و تحمل اور بردباری میں اونٹ بڑھ کر ہے یا وہ عرب جو صحرا میں رہتا اور اونٹوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے تمام عہدِ طفولیت اور جوانی کا ابتدائی حصہ دوسرے عربوں کی طرح صحرا میں بسر کیا تھا جہاں روٹی اور کھجور میسر نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے وہاں صرف دودھ کو بطورِ غذا استعمال کیا تھا۔ اس تمام مدت میں روٹی اور کھجور نہیں کھائی تھی مگر شہر لوٹ آنے کے بعد۔

یہاں یہ وضاحت کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے تصور کے برعکس صحرا میں کھجوروں کی فراوانی نہیں ہے، اس لیے کہ نخلستان زیادہ نہیں ہیں۔ صحرا کا بہت زیادہ علاقہ نخلستانوں

سے خالی ہے۔ کھجور کے درخت کو بار آور ہونے کے لیے دو چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ ایک دھوپ، دوسرے پانی۔ یہی وجہ ہے کہ ساحلی پٹی کو چھوڑ کر اگر آپ صحرا کے داخلی حصہ میں جائیں تو آپ کو کھجوروں کے درخت نہیں ملیں گے۔ ویسے بھی صحرائے عرب کے اندرونی حصے میں بارش نہیں ہوتی۔

آج سعودی عرب میں تیل کے پائپ خلیج فارس سے لے کر بحیرۂ روم تک صحرا کے وسط میں سے گزارے گئے ہیں۔ آپ پائپ لائن کے کناروں پر کہیں کہیں کھجوروں کے جھنڈ دیکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ تیل کی پائپ لائن کے ساتھ ساتھ پانی کا پائپ بھی بچھایا گیا ہے۔ امریکیوں نے یہ پائپ لائن بچھائی تو پائپ لائن کے ساتھ ساتھ رہنے والے لوگوں کو بھی پانی مہیا کیا تاکہ ان ویرانوں میں وہ بہتر طور پر زندگی گزار سکیں۔ آج اگر آپ اس پائپ لائن سے دور ہو جائیں تو کھجور کے درخت آپ کو نہیں ملیں گے، سوائے اس جگہ کے جہاں کہیں پانی میسر آ گیا ہو۔ قصہ مختصر عرب کے بیابانوں میں ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ اور بعض دوسرے مقامات پر سطح سمندر سے بلندی کی مناسبت سے بارش ہوتی ہے۔ ساحلی پٹی اور مذکورہ مقامات کے سوا عربوں کی خوراک اونٹ کا دودھ ہی ہے۔

محمد ﷺ جتنی دیر صحرا میں رہے، اُن کی خوراک اونٹنی کا دودھ ہی ہوتی تھی۔ جب کبھی مکہ آتے تو نان وخرما کھا لیا کرتے تھے۔ لیکن کبھی نان وخرما اکٹھے تناول نہیں فرمایا کرتے تھے یعنی آپ ایک وقت میں یا روٹی کھاتے یا خرما۔ فرمایا کرتے تھے: پیٹ بھرنے کے لیے ان میں سے ایک ہی کافی ہے۔ دونوں کا باہم کھایا جانا اسراف ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں ہمیشہ ایک ہی غذا کھائی ہے۔ کھانا کھانے کے لیے آپ زمین پر بیٹھا کرتے تھے۔ دسترخوان کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی کا ہوتا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، حضرت عائشہؓ کے گھر میں جب تک آپ ﷺ زندہ تھے، ایک چھلنی بھی نہیں تھی کہ آٹے سے گندم کا چھلکا (بھوسی) علیحدہ کر سکیں۔ نان وخرما کے علاوہ ایک اور غذا بھی آپ ﷺ کے گھر میں پکا کرتی تھی اور وہ تھی گندم اور مسور کا ملا جلا پکوان۔ گندم اور مسور کو

باہم جوش دے کر ایک قسم کا حلیم تیار کیا جاتا تھا۔ جس دن گھر میں یہ غذا تیار ہوتی آپ نان و خرما تناول نہیں فرماتے تھے۔

گوشت محمد ﷺ کی زندگی میں ایک استثنائی غذا تھی کہ سال میں ایک بار کھائی جاتی تھی۔ مکہ میں اعراب کی رسم تھی کہ حج کے موقع پر قربانی کیا کرتے تھے تو گوشت بھی کھایا کرتے تھے اور پھر دوسرے سال اسی موقع پر گوشت میسر آتا تھا۔ آپ ﷺ اس طرح کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور گوشت جو گراں ہوتا تھا استعمال میں نہیں لاتے تھے۔

آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی ایسے ہی زندگی بسر کی۔ کھانے میں ہمیشہ ایک ہی قسم کی غذا پر اکتفا کیا اور یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں نے دس سال کی مدت میں تین بڑی سلطنتوں کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ یہ بڑی سلطنتیں ایران، شام[1] اور مصر تھیں۔ حضرت محمد ﷺ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی سفر پر جاتے رہے۔ اس لیے آپ ﷺ کو تمام عرب قبائل کی بڑی اچھی شناخت تھی۔ کسی جگہ کا نام لیا جاتا، آپ ﷺ اس جگہ کے حالات واطلاعات کی مکمل معلومات رکھتے تھے۔



۱۔ ان دنوں شام کوئی سلطنت نہیں تھا، بلکہ یہ سلطنتِ روم کا ایک صوبہ تھا، جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔ اس دور کے شام میں آج کے اردن، فلسطین اور لبنان بھی شامل تھے جبکہ رومی سلطنت شام سے لے کر افریقہ میں مصر وسوڈان، طرابلس (لیبیا)، تیونس اور الجزائر ومراکش تک پھیلی ہوئی تھی، تاہم مصر کی بادشاہت رومی سلطنت کے ماتحت نیم خودمختار تھی۔ اسی طرح بُصریٰ (شام) اور حیرہ (عراق) کی بادشاہتیں بھی علی الترتیب رومی اور ایرانی سلطنتوں کے ماتحت تھیں۔

گھریلو زندگی

حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تین فرزند پیدا ہوئے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے پہلے فرزند کا نام قاسم رکھا اور اسی مناسبت سے آپ کی کنیت "ابوالقاسم" تھی۔ قاسم ابھی بچے ہی تھے کہ وفات پا گئے اور دوسرے دونوں فرزند طیب اور ابراہیم بھی خردسال ہی تھے کہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

مذکورہ بالا اولادِ نرینہ کے علاوہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے نام بالترتیب رقیہؓ، زینبؓ، اُمّ کلثومؓ اور فاطمہؓ ہیں۔ پہلی تین صاحبزادیوں کے ہاں بھی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ فقط فاطمہؓ کے ہاں اولادِ نرینہ پیدا ہوئی۔

یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ جب آپ ﷺ نے خدیجہؓ سے شادی کی تو آپ ﷺ کے مراسم اس خاندان سے گہرے ہو گئے اور اسی مناسبت سے حضرت خدیجہؓ کے قبیلہ بنواسد کے افراد سے شناسائی ہوئی۔

قبیلہ بنواسد کے مرد علم و معرفت میں ممتاز تھے اور حنیف کہلاتے تھے۔ حنیف ان افراد کو کہا جاتا تھا جو گرچہ بُت پرست تھے، مگر ان پر مضبوط اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت کی جستجو میں سرگرداں رہتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی کسی واحد معبودِ حقیقی کی پرستش کی جائے۔

بنواسد میں ایک مرد بنام ورقہ بن نوفل تھا جو حضرت خدیجہؓ کا عم زاد تھا۔ آپ ﷺ کی خدیجہؓ سے شادی کے بعد وہ محمد ﷺ کا دوست ہو گیا تھا۔ دوسرا ایک مرد بنام عبداللہ بن جحش، تیسرا عثمان فرزند حواریہ اور چوتھا زید بن عمرو۔ قبیلہ کے یہ افراد دوسرے افراد کے برعکس جب کبھی نبی ﷺ سے ملتے آپ ﷺ سے مذہبی معاملات پر بحث کرتے اور آپ ﷺ کو حنیف بن جانے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

یہ مذاکرات جو بیوی کے خاندان سے ہوئے ایک مؤرخ کی نظر میں توجہ طلب ہیں۔

افسوس کہ ان مذاکرات کا مکمل علم نہیں ہو سکا مگر بہت اختصار کے ساتھ، بعض عرب مؤرخوں مثلاً ابنِ سعد اور عیسیٰ نے محمد ﷺ کے ان چند جملوں کو جو آپ ﷺ نے بحث کے دوران ادا فرمائے رقم کیا ہے۔ اگر ہمیں ان مذاکرات کی تفصیل اور نوعیت معلوم ہو جاتی تو یہ مذاکرات جو دس سال کے طویل عرصے میں ہوتے رہے اور جو محمد ﷺ کی پچیس سالہ عمر سے پینتیس سال کی عمر تک پھیلے ہوئے ہیں، ان سے ہمیں یہ جاننے میں بڑی آسانی ہوتی کہ آپ ﷺ کی طرزِ فکر میں اس وقت کیا تغیر آیا کہ جب آپ ﷺ پیغمبر ہوئے۔

آپ ﷺ کے شادی سے بعثت تک کے افکار تاریخی تدریج کے لحاظ سے ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ مباحث جو حنیفوں سے ہوتے رہے ہمارے لیے توجہ طلب ہیں مگر افسوس کہ چند جملوں کے سوا جو ابنِ سعد اور عیسیٰ نے نقل کیے ہیں، ہمارے ہاتھ میں اور کچھ نہیں۔ ان دونوں مؤرخوں نے روایات کے توسط سے نقل کیا ہے کہ جب بھی حنیف آپ ﷺ سے کشفِ حقیقت کی کوشش کرنے کو کہتے تو آپ جواباً فرماتے: لا الٰہ الا اللہ۔ ایک اور جگہ آپ نے حنیفوں سے فرمایا: حقیقت اپنے وقت پر خود بخود آشکار ہوگی اور قریش میں سے جو کوئی بھی مائل ہوگا اس کے لیے نشانِ راہ بنے گی۔ حضرت محمد ﷺ چونکہ خدیجہؓ کی نسبت غریب تھے لہٰذا خدیجہؓ اپنے شوہر کی ہر طرح خدمت اور دلجوئی فرمایا کرتی تھیں۔

٦٠٥ سن عیسوی میں جب کہ محمد ﷺ کی عمر پینتیس سال تھی، مکّہ میں دو بڑے ہی ناگوار واقعات رونما ہوئے۔ ایک یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو آگ لگ گئی تھی جس سے وہ جل گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ سیلاب نے اس کا کچھ حصہ تباہ کر دیا۔ مکّہ میں شاذ و نادر ہی بارش ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی بڑا سیلاب آ جاتا ہے۔ اس سال بھی سیلاب زیادہ آیا اور خانہ کعبہ کی عمارت کو خاصا نقصان پہنچا۔ قریش کے سبھی قبیلوں نے مرمت کے لیے سامان جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ ابھی مرمت کے لیے سامان جمع کیا جا رہا تھا کہ ایک کشتی رومۃ الصغریٰ[1] سے یمن جاتی ہوئی شعیبہ

١- رومۃ الصغریٰ سے مراد مشرقی رومی سلطنت (بازنطینی سلطنت) ہے، جو ٣٩٥ء میں رومی سلطنت (رومۃ الکبریٰ) کے دو حصوں میں تقسیم ہونے پر وجود میں آئی۔ اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا۔ اسی کو قرآن میں الروم کہا گیا ہے۔

کی بندرگاہ میں (جو مکّہ سے نزدیک ہے) تباہ ہوگئی، اس طرح کہ پانی میں پوری طرح نہ ڈوبی تھی۔ کشتی کا نچلا حصہ کیچڑ میں پھنس گیا تھا اور اس حالت میں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، آہستہ آہستہ کیچڑ میں دھنستی جارہی تھی۔ کشتی یمن میں ایک کلیسا کی تعمیر کے لیے سامان لے کر جارہی تھی۔ یہ سامان سنگِ مرمر، ٹائلوں، لکڑی، لوہا اور دوسرے تعمیراتی مصالحہ جات پر مشتمل تھا۔ تعمیراتی کام کی انجام دہی کے لیے ایک مسیحی معمار (بکوم) بھی سامان کے ہمراہ جا رہا تھا۔ عربوں نے جب یہ دیکھا تو بکوم سے کہا ہمیں کعبہ کی مرمت کے لیے دے دو۔ دوسرے تم انجینئر بھی ہو کعبہ کی تعمیر کے کام کی سرپرستی بھی کرو۔ بکوم رومۃ الصغریٰ کا رہنے والا تھا جس کا پایۂ تخت اس وقت قسطنطنیہ (استنبول) تھا۔ بہرحال اس نے عربوں کا مشورہ قبول کیا۔ کشتی سے تمام سامان اُتار کر مکّہ لایا گیا۔ بکوم نے کعبہ کی تباہ شدہ عمارت کا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ کعبہ کی عمارت کو مکمل طور پر مسمار کر کے اس کی تعمیرِ نو کی جائے۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ رومی معمار تمام عمارت کو مسمار کرنا چاہتا ہے تو وہ مانع ہوئے اور اس کی اجازت نہ دی اور خدشہ ظاہر کیا کہ اگر کعبہ کی عمارت مسمار کی گئی تو ہم پر بلائیں نازل ہوں گی اور ہم سب تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

بکوم نے کہا موجودہ عمارت ایک بار آتشزدگی سے خراب ہو چکی ہے۔ دوسرے سیلاب اس کا ایک حصہ بہا کر لے گیا ہے۔ اس کی کسی قسم کی مرمت لاحاصل ہوگی۔ اسے مسمار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارا ارادہ اسے گرا کر دوبارہ تعمیر کرنے کا ہے۔ لہٰذا کوئی بلا نازل نہیں ہوگی۔ لیکن قریش عمارت کے گرانے پر کسی طور راضی نہ ہوئے۔ روایت ہے کہ کعبہ کے نزدیک ایک کنواں ہوا کرتا تھا۔ گاہے ایک اژدہا اُس کنویں سے باہر آ کر دھوپ سینکا کرتا تھا۔ مکّہ کے لوگ اُس سے ڈرتے تھے اور اژدہے کو مارتے نہیں تھے۔ اس تمام قضیے کے بعد رومی معمار نے کام بند کر دیا۔ ایک دن یہ اژدہا حسبِ معمول کنویں سے باہر نکل کر دھوپ تاپ رہا تھا کہ ایک عقاب اُس پر حملہ آور ہوا اور اژدہے کو اپنے طاقت ور پنجوں میں پکڑا اور اُٹھا لے گیا۔ اس واقعے کے بعد مکّہ والوں نے اس اژدہے کو کبھی نہیں دیکھا۔

اس واقعہ کے بعد یہ خیال کیا جانے لگا کہ عقاب کا اژدہا کو اُٹھا لے جانا اور ہمیں اس کے شر سے نجات ملنا دلیل ہے اس بات کی کہ خداوندِ کعبہ نے عمارت کو مسمار کر کے دوبارہ تعمیر کی اجازت دے دی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جو واقعہ تاریخ سے انطباق نہیں کرے گا، ہم اُسے محض ایک روایت کہیں گے۔ اس لیے یہ واقعہ بھی ایک روایت ہے، تاریخ نہیں۔

احتمال یہی ہے کہ قریش نے بالآخر کعبہ کو مسمار کرنے کی اجازت دے دی ہو گی کہ بہرحال اس کا گرانا تعمیری مقاصد کے لیے ہے۔ بہر طور قریش رضامند ہو گئے اور رومی معمار نے کام شروع کر دیا۔

جب بنیادوں کا کام تمام ہوا تو سنگِ اسود کو اُس کی جگہ نصب کرنے کا مرحلہ آیا۔ اس پر قریشی قبائل میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ سعادت اُسے نصیب ہو۔ قریب تھا کہ اس نزاع پر قریشی قبیلوں کی آپس میں جنگ شروع ہو جائے کہ حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ جب قریشی قبائل کے سرداروں نے اُنھیں دیکھا تو آپس میں مشورہ کر کے حضرت محمد ﷺ کو ثالث مقرر کیا کہ وہ امین ہیں، اس لیے فیصلہ دیں کہ کون سا قبیلہ حجرالاسود کو اُٹھا کر اُس کی جگہ لے جائے اور نصب کرے۔

آپ ﷺ نے ایک چادر لانے کو فرمایا۔ وہ لوگ خیمے کا ایک ٹکڑا لے آئے۔ محمد ﷺ نے فرمایا اس کو بچھا کر اس پر حجرالاسود رکھیں۔ پھر تمام مل کر اس پارچہ کو اطراف سے پکڑ کر حجرالاسود کو اُس کی جگہ تک لے جائیں۔ خود محمد ﷺ نے بھی ایک کونہ پکڑا اور ان تمام اشخاص کی معیت میں حجرالاسود کو اُٹھا کر کعبے کے مطلوبہ کونے میں نصب کر دیا۔

یہ حکیمانہ حل سب کی رضامندی کا باعث ہوا اور محمد ﷺ کی شخصیت ان قبائل میں اور زیادہ قدآور ہو گئی۔ تمام قبائل محمد ﷺ کو تحسین کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی نمایاں واقعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا حتیٰ کہ ۶۱۰ سن عیسوی میں آپ چالیس سال کے ہو گئے اور نبوت عطا ہونے پر لوگوں کو دعوتِ اسلام دینی شروع کی۔

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ۶۰۵ء سے ۶۱۰ء تک آپ کی مصروفیات کیا تھیں اور زندگی کے یہ پانچ سال آپ ﷺ نے کیسے بسر کیے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر تو سابقہ شکل پر ہی ہوئی۔ تمام مذہبوں کے متعلقہ بت اور تصویریں حسبِ سابق نصب اور آویزاں رہیں۔ بازارِ عمومی عکاظ بھی ہر سال لگتا تھا۔ شعرا اپنا کلام بھی سناتے تھے لیکن یہ پانچ سال آپ ﷺ کے ذکر سے خالی ہیں۔ البتہ یہ تذکرہ ملتا ہے کہ آپ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں قیام فرماتے تھے اور غور و فکر کرتے تھے۔



غارِ حرا

مکّہ شہر کے باسیوں کے لیے غاروں میں جا کر تنہائی میں قیام کرنا کوئی غیر عادی امر نہیں تھا۔ مکّہ میں بھی بعض اشخاص جب صاحب اولاد ہو جاتے تو سال میں ایک ماہ کے لیے اپنے گھر والوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیا کرتے اور اطرافِ مکّہ کے کسی غار میں چلے جاتے اور یہ ایک ماہ تنہائی میں بسر کیا کرتے تھے۔

ایک ماہ کی مدت بدوی زندگی میں قمری حساب سے شمار ہوتی تھی یعنی ہلال سے ہلال تک۔ مکّہ کے لوگ غار میں گوشہ نشینی کی مدت کا شمار قمری حساب سے ہی کیا کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ سے پہلے آپ ﷺ کے جدِ امجد حضرت عبد المطلب بھی ہر سال ایک ماہ کی مدت اسی غارِ حرا میں بسر کیا کرتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی جب عمر کے اس حصے میں پہنچتے تو سال میں ایک ماہ کا عرصہ اطرافِ مکّہ کے غاروں میں گزارتے تھے۔

آپ ﷺ کی یہ عادت تھی کہ آپ ہر سال ماہِ رمضان غارِ حرا میں گزارتے۔ اس ماہ کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا عقیدہ تھا کہ شب قدر ماہِ رمضان میں واقع ہوئی ہے۔ اس شب کوئی شخص بھی جو تمنا کرے وہ پوری ہوتی ہے۔ نیز اس رات کوئی اعجاز رُونما ہونا ممکن ہے۔ اسد بک ایک عربی محقق نے محمد ﷺ کی زندگی پر تحقیق کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ شبِ قدر میں طبیعت استراحت کرتی یا سو جاتی ہے۔ دریاؤں کی روانی اور ہواؤں کی حرکت تھم جاتی ہے۔ تمام جہان اس طرح ساکت ہو جاتا ہے کہ انسان غنچے کے کھلنے کی آواز بھی سن سکتا ہے۔ جنھیں اس شب کا علم ہو جائے اور وہ شب بیداری میں رہیں تو ان کی ہر تمنا کو شرفِ قبولیت حاصل ہوتا ہے۔

میں نے غارِ حرا کو دیکھا ہے۔ مکّہ شہر کے اطراف میں متعدد ٹیلے ہیں۔ عرب ان ٹیلوں کو

جبل یعنی پہاڑ کہتے ہیں۔ ان ٹیلوں میں سے ایک کا نام "جبل النور" ہے۔ غارِ حرا اسی ٹیلے میں واقع ہے۔ غارِ حرا سے محمد ﷺ کے گھر کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر ہے۔ غارِ حرا پتھریلی سلوں کے بیٹھ جانے سے وجود میں آیا ہے۔ اس کی سہ اطراف اور چھت پتھریلی سلوں کی ہے۔ چھت کی بلندی اس قدر ہے کہ انسان اُس میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ غار کا دہانہ کعبہ رُخ ہے۔ اُس میں بیٹھا ہوا آدمی کعبے کو دیکھ سکتا ہے۔ غار کا فرش دیواروں اور چھتوں کی نسبت زیادہ ہموار ہے۔ آدمی فرش پر آسانی سے بیٹھ اور لیٹ سکتا ہے۔

غار کا دہانہ کچھ اس طرح واقع ہے کہ غار تک پہنچنے کے لیے کچھ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں جو کہ پتھروں کو اُکھاڑ کر بنائی گئی ہیں۔ عربوں کا کہنا ہے کہ پہلے وقتوں میں یہاں سیڑھیاں نہیں تھیں۔ غارِ حرا میں آدمی بیٹھ سکتا ہے اور لیٹ بھی سکتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں خانہ کعبہ اور محمد ﷺ کا گھر نظر آتا رہتا ہے۔

کوئی شخص نہیں جانتا کہ غارِ حرا میں محمد ﷺ کس بابت غور و فکر کیا کرتے تھے، لیکن جیسا کہ آپ ﷺ کے قول کے مطابق ابنِ ہشام نے لکھا ہے: کہ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: "غار میں میرے پیشِ نظر اُمورِ دنیوی نہیں ہوتے"۔

ایک رات محمد ﷺ غارِ حرا کے اندر کمبل میں لپٹے لیٹے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی حالت میں تھے۔ ایک شخص[1] نے آ کر آپ ﷺ کو بیدار کیا اور بقول ابن ہشام ایک کپڑے کا ٹکڑا آپ ﷺ کو دکھایا۔ ابنِ ہشام لکھتے ہیں: کہ وہ کپڑا ریشم کا تھا اور اُس پر سنہری حرف بھی نظر آتے تھے۔

جب محمد ﷺ پوری طرح بیدار ہو گئے تو اُس شخص نے ریشمی کپڑا انھیں دکھا کر کہا: "اقرأ" یعنی پڑھیے۔ محمد ﷺ نے فرمایا میں پڑھ نہیں سکتا۔

اُس شخص نے شانۂ مبارک پر ہاتھ رکھا اور پھر کہا: "اقراء" (پڑھیے)

۱۔ یہ شخص اللہ کا برگزیدہ فرشتہ جبرائیل تھا، جیسا کہ اگلے صفحات میں واضح ہوتا ہے۔

دوبارہ محمد ﷺ نے فرمایا میں پڑھ نہیں سکتا۔

ابنِ ہشام نے لکھا ہے: اُس شخص نے دونوں ہاتھوں سے آپ ﷺ کا شانۂ مبارک دبایا اور کہا: "پڑھیے"۔

اس شخص کے ہاتھوں کا دباؤ اس قدر شدید تھا کہ محمد ﷺ اپنی حالت برقرار نہ رکھ سکے اور پوچھا "کیا پڑھوں"؟

محمد ﷺ کو بیدار کرنے والے شخص نے کہا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ (پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا)

• لازم نہیں کہ محمد ﷺ کی جگہ کوئی اور انسان ہوتا تو اس کلام سے متاثر نہ ہوتا۔

اس کلام کا اثر اس قدر زیادہ ہے کہ انسان ہر دور اور ہر جگہ اس کلام کو پڑھ کر متاثر ہوگا، بشرطیکہ اُسے عربی زبان پر عبور حاصل ہو۔ عربی زبان پر عبور حاصل کیے بغیر ممکن ہی نہیں کہ اس آیت اور قرآن کی دوسری آیات کی حقیقت اور معنوی وسعت کا ادراک کیا جا سکے۔

اسی لیے وہ تراجم جو مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں، پڑھنے والے کو اُس درجہ متاثر نہیں کرتے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح عربوں نے ان آیات کو سننے کے بعد بھی محمد ﷺ کو پیغمبر تسلیم نہ کیا۔ قرآن کا خاصہ، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح، اس کی ادائیگی کا مخصوص انداز ہے اور وہ انداز بعض کلمات اور جملوں کی تکرار ہے۔ اور تکرار ایک ترجمہ پڑھنے والے شخص پر کم ہی اثر انداز ہوتی ہے۔

لیکن ایک شخص جسے عربی زبان پر عبور حاصل ہو، جب وہ اُس جملہ (مذکورہ بالا آیت) کو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے بعد (جو کہ سورۃ علق کی پہلی آیت ہے) پڑھے گا تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کا پڑھنا یا سننا کتنا متاثر کن ہے۔ جو الفاظ وہ شخص زبان پر لایا، محمد ﷺ نے جب سنے اور دہرائے تو یہ کلمات اُن کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ اسی حالت میں اُنھوں نے تکرار فرمائی۔

تمام مسلمان دانش ور اس بات پر متفق ہیں کہ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ سے مقصود یہ تھا کہ محمد ﷺ جب بھی کلامِ خدا کو زبان پر لائیں، آغاز میں خدا کا نام لیں۔ اسی لیے تمام سورتوں کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ آیا ہے۔ سورۃ العلق کی ۱۹ آیات ہیں۔ تمام محققین اسلام نے تصدیق کی ہے کہ یہ قرآن کی اولین سورۃ ہے جو غارِ حرا میں محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور معنی کے لحاظ سے قرآن کی برجستہ ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔

اس سورۃ کی تیسری آیت (اگر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو پہلی آیت شمار کیا جائے) میں فرمایا گیا: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ یعنی "اس نے جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کو تخلیق کیا" ("علق" کے معنی ہیں خون کی پھٹکی جو عورت کے بطن میں بنتی ہے) اور پانچویں آیت میں فرمایا: ﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ یعنی "جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا"۔

اسی سورۃ کی چھٹی آیت میں فرمایا: ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ یعنی "(خداوند نے) انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا"۔

محمد ﷺ نے اس سورۃ کی اُنیس آیات کو (جن میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ شامل نہیں) اُس شخص سے سننے کے بعد حفظ فرما لیا۔

محمد ﷺ کے ذہنِ رسا کے لیے ان آیات کو حفظ کرنے کے لیے ایک دفعہ ہی ان آیات کو سن لینا کافی تھا۔ محمد ﷺ اُمی تھے، لکھنا نہیں جانتے تھے۔ یعنی آپ ﷺ تھوڑا بہت پڑھ سکتے تھے، تحریر نہیں کر سکتے تھے۔

اس بات کے باوجود کہ محمد ﷺ رسول اللہ اُمّی تھے، اولین آیات جو نازل ہوئیں وہ قلم و علم، یاد رکھنے اور تعلیم دینے کی بابت تھیں۔ تمام بڑے دین لانے والے بزرگوں میں سے کوئی بھی اس قدر معرفت کی اہمیت کا قائل نہیں ہوا۔ کوئی اور دین ایسا نہیں تھا جس میں علم کو اس قدر ارزش و اہمیت حاصل ہو۔

اگر محمد ﷺ ایک دانش مند فلسفی ہوتے تو غارِ حرا میں ان آیات کے نزول کے وقت اس قدر حیران نہ ہوتے، کیوں کہ دانش ور علم کی اقدار کو سمجھتا ہے لیکن آپ ﷺ کوئی باقاعدہ علم

نہیں رکھتے تھے اور آپ نے کسی اُستاد سے درس نہیں لیا تھا۔ فقط ایک بدوِ عرب کی طرح کلام کی فصاحت اور خوب صورتی کو سمجھتے تھے اور فصاحت کا ادراک کرنا عربوں کی فطرت کا جزو تھا۔ میں مسلمانوں کو مبارک کہتا ہوں کہ اُن کے دین میں حصولِ علم کی اس قدر تلقین کی گئی ہے۔ مسلمان علما کے ایک سابقہ گروہ نے اسی سورۃ کی بنا پر حصولِ علم کو واجباتِ دین میں سے سمجھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ جس طرح ایک مسلمان نماز پڑھتا اور روزے رکھتا ہے، اسی طرح اُسے تحصیلِ علم بھی کرنی چاہیے۔

وہ شخص جس نے محمد ﷺ کو غارِ حرا میں بیدار کیا تھا، سورۃ علق کی ۱۹ آیات پڑھنے کے بعد غائب ہو گیا۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنی اہلیہ خدیجہؓ سے یہ حالات جس طرح بیان کیے، مورخ طبری نے ان کو یوں نقل کیا ہے:

جب وہ شخص چلا گیا۔ میں کھڑا ہوا تو میری ٹانگوں میں لرزہ تھا۔ مجھ سے زیادہ دیر کھڑا نہ رہا جا سکا۔ میں زمین پر دوزانو بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد میرے گھٹنوں میں دوبارہ طاقت عود کر آئی۔ میں کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا تو غار سے باہر آیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ لیکن ابھی میرے کندھوں پر لرزہ طاری تھا۔ میں ابھی ٹیلے کی آدھی راہ بھی طے نہیں کر سکا تھا کہ میرے کانوں میں آواز آئی "اے محمد ﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریلؑ ہوں"۔ یہ آواز آسمان سے آ رہی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک شخص جس کے رخسار انسانوں جیسے ہیں، آسمان کی وسعتوں میں ایستادہ ہے۔ اُس نے دوبارہ کہا "اے محمد ﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریلؑ ہوں"۔ مَیں ساکت کھڑا اُس کو دیکھ رہا تھا۔ آگے پیچھے حرکت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ آخر اُسی طرح کھڑے کھڑے اپنی توجہ دوسری طرف کی تو دیکھا کہ جبریلؑ اُس سمت بھی اُسی وضع میں کھڑے ہیں، پھر اور سمت نگاہ کی تو اُنھیں کھڑا پایا۔ جس سمت بھی دیکھتا تھا انھیں کھڑا پاتا حتیٰ کہ وہ غائب ہو گئے۔ اُس وقت مجھے زیادہ خستگی کا احساس ہوا اور بہت مشکل سے میں گھر پہنچا۔

حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں جس وقت آپ ﷺ گھر پہنچے تو آپ ﷺ کا رنگ فق تھا اور بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں سے وہ میری طرف آئے۔ یہ رات ماہِ رمضان کی ایک رات تھی۔ آپ ﷺ کا اس قدر تھک جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ ایک انسان کا اللہ تعالیٰ کے فرشتے کی آواز سُننا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ جب انسان بہت زیادہ دباؤ محسوس کرتا ہے تو یہی دباؤ خستگی کا باعث بنتا ہے۔

ہر چیز جو آدمی کی استعداد سے باہر ہو اُسے تھکا دیتی ہے، چاہے وہ خدا کی آواز ہو یا زیادہ سرعت جیسے ایک گھوڑا دوڑ رہا ہو۔

طبعی طور پر انسان کی حدود متعین ہیں۔ انسان کے عضلات اور ہڈیاں اُس دباؤ کو برداشت نہیں کرتے جو اُس کی استطاعت سے باہر ہو۔

آج ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ایسی مشینیں بنا سکتے ہیں جو ہمیں پرندوں سے بھی زیادہ سرعت سے اُٹھا لے جا سکتی ہے لیکن ہمارے عضلات آج بھی یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ ہم ایک گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑ سکیں یا ایک پرندے سے تیز تر اُڑ سکیں۔

خداوند تعالیٰ کی آواز سُننا ایک انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ نہ اُس کی ابتدا ہے، نہ انتہا اور نہ وہ ہماری قوتِ جاذبہ کی مطیع ہے، بلکہ خود قوتِ جاذبہ ہے اور مادے کو وجود میں لائی ہے۔

ہم جب زلزلہ کی آواز یا بجلی کڑکنے کی آواز سُنتے ہیں تو لرز جاتے ہیں جب کہ یہ طبعی آوازیں ہیں اور ہم ان سے آشنا ہیں حتیٰ کہ ان آوازوں کے معرضِ وجود میں آنے کے طبعی قوانین اور علتوں تک سے واقفیت رکھتے ہیں۔ پس ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ محمد ﷺ نے جبریلؑ کی آواز سُننے کے بعد تکان محسوس کی اور اُن کے چلے جانے کے بعد آپ ﷺ کو شدید خستگی کا احساس ہوا۔

جب حضرت خدیجہؓ نے محمد ﷺ کو اس حالت میں دیکھا تو ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا کہ آپ پر کیا گزری ہے کہ اس قدر تھکے ہوئے ہیں۔ محمد ﷺ نے تفصیلاً ان کو واقعہ سنایا اور فرمایا کہ میں بہت خوفزدہ ہوں۔ حضرت خدیجہؓ نے واقعہ سُننے کے بعد کہا: آپ کیوں ڈر رہے

ہیں؟ یہاں دو طرح کی روایات ہیں۔

کچھ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ نے خدیجہؓ سے فرمایا کہ "میں خدا کے خوف سے ڈر رہا ہوں اور یہ آواز جو میرے کانوں نے سنی ہے کچھ اس طرح تھی کہ مجھے قرار نہیں آ رہا۔ مجھے چھپا لو اور میرے اوپر کچھ ڈال دو"۔

ابنِ ہشام و سہیلی وغیرہ نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ ایک مدت تک غارِ حرا میں تنہا تھے اور غور و فکر کیا کرتے تھے، ان کو اندیشہ ہوا کہ یہ آواز شاید اُن کی اپنی ہے اور خدا کی آواز نہیں۔ لیکن اس گروہ نے بھی اتفاق کیا ہے کہ محمد ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے چھپا لو اور میرے اوپر کچھ ڈال دو۔ حضرت خدیجہؓ نے ایک کپڑا اُن پر ڈال دیا کہ وہ آرام فرمائیں یہاں تک کہ وحشت ختم ہو اور طبیعت میں سکون آ جائے۔

محمد ﷺ کپڑا اوڑھے لیٹے رہے مگر نہ نیند آئی اور نہ قرار ہی آیا۔ بعض عرب تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اُسی رات یا دُوسری شب جبریلؑ محمد ﷺ کے لیے دوبارہ پیام لائے۔

برغی کہتا ہے کہ اس واقعہ کے تین دن بعد جبریلؑ آپ کے لیے قرآن کی چوہترویں سورت لے کر آئے۔ اس سورۃ کی دوسری تیسری آیت (اگر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو پہلی آیت شمار کیا جائے) یہ ہیں: ﴿یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۝ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝﴾ (اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اُٹھو اور خبردار کرو) یا (اُٹھو اور لوگوں کو اس علم سے آگاہ کرو)۔ یہ آیات جبریلؑ پڑھتے جاتے جو محمد ﷺ کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی جاتیں اور اُس وقت آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ یہ آواز خدا کی ہے اور بجز خدا کے کوئی دوسرا ایسے الفاظ یا کلمات ادا نہیں کر سکتا۔

جبریلؑ کے اس ابلاغ کے کچھ ہی دیر بعد آپ ﷺ کی حالت میں تغیر پیدا ہوا۔ آپ کی طبیعت سنبھل گئی۔ اُس وقت حضرت خدیجہؓ محمد ﷺ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہؓ کے عم زاد بھائی اور عقیدہ کے لحاظ سے حنیف تھے۔[۲]

۲- صحیح بخاری کی روایت ہے ورقہ بن نوفل عہدِ جاہلیت میں عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ (باب بدء الوحی، ح۲)

جس وقت آپ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ ان کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ (ورقہ بن نوفل) اور اُن کی بہن انجیل پڑھنے میں مشغول تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے تمام واقعہ غارِ حرا اور نزولِ سورہ مدثر سے ورقہ کو آگاہ کیا۔ ورقہ نے تمام واقعہ سننے کے بعد بغیر کسی شک وتردّد کے کہا: یہ کلام (ناموس) ہم سب کے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ماضی میں موسیٰؑ پر بھی نازل ہوا تھا۔ مسلمان وقائع نگاروں کے ایک گروہ نے لکھا ہے کہ ورقہ نے کہا تھا تم وہی (ناموس) ہو جس کی عیسیٰؑ نے خبر دی تھی کہ ایک روز تم میں آئے گا۔

لغت میں ''ناموس'' کے معنی ''وہ قوانین الٰہی جو بشریت کے لیے وضع ہوتے ہیں'' کے ہیں اور انھی قوانین الٰہی کو ''ناموس'' کہا جاتا ہے۔

بعد ازیں ورقہ بن نوفل نے وضاحت کی کہ کوئی بھی تیری جگہ ہوتا تو جو تم لائے ہو وہ بھی یہی کچھ لاتا۔ ہر شخص تمھارا دشمن ہو جائے گا۔ خدا کرے میں اُس وقت تک زندہ رہوں اور دشمنوں کے مقابلے میں تمھاری مدد کر سکوں۔ نیز یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر تم نے تبلیغ شروع کی تو تم قبیلے سے طرد کر دیے جاؤ گے۔ ''طرد'' کے معنی قبیلہ سے نکال باہر کرنا ہیں۔ اس عرب معاشرے میں یہ انتہائی سزا تھی جو کسی شخص کو دی جا سکتی تھی۔

جس وقت ایک شخص کو ''طرد'' کیا جاتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ اُس شخص کے لیے اُس کے قبیلے کی حمایت بالکل ختم ہو گئی۔ اُس قبائلی زندگی میں وہ بے اہمیت ہو کر رہ جاتا۔ اُس کا خون ارزاں اور ہر ایک کے لیے مباح ہو جاتا تھا۔ کوئی بھی اُسے غلام یا بردہ بنا سکتا تھا۔ فرد ایک پتھر کا ٹکڑا ہو کر رہ جاتا کہ کوئی بھی اُسے ٹھوکر لگا سکتا یا اُٹھا کر دور پھینک سکتا تھا۔

دورِ جاہلیت کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا:

''مجھے خوف ہے کہ قضا وقدر مجھے ناسازگار لوگوں کے ہاتھوں میں دے دے''

''مجھے خوف ہے کہ ہر شخص جو مجھے دیکھے مثلِ سنگ اُٹھائے اور دور پھینک دے''

جو شخص قبیلہ سے طرد ہوتا اُس کی حالت اس شعر کے مصداق ہوتی تھی۔ واقعتاً اس کے وجود اور ناوجود میں کوئی فاصلہ اور فرق نہیں ہوتا تھا۔ ورقہ بن نوفل کو بھی یہی خدشہ لاحق ہوا کہ

محمد ﷺ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوں گے۔ لیکن محمد ﷺ جو خدا کی آواز سن چکے تھے، ان باتوں سے بالاتر ہو چکے تھے۔

سورۃ مدثر کے نزول کے بعد کی راتوں کو بھی محمد ﷺ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے رہے۔ مگر وہ جس نے انھیں پہلی رات بیدار کیا اور کلامِ خداوندی سنایا تھا یعنی جبریلؑ تشریف نہ لائے۔ محمد ﷺ غم واندوہ میں ڈوب گئے۔ ہر چند کہ خدیجہؓ دلجوئی فرماتیں اور ہر طرح سکون و آرام فراہم کرنے کی کوشش کرتیں مگر کوئی چارہ کارگر نہ ہوتا۔ بعض اوقات آپ ﷺ کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں غارِ حرا میں بسر فرماتے اور طویل انتظار کے بعد خستہ و ماندہ واپس گھر تشریف لاتے۔

ایک رات محمد ﷺ غم سے نڈھال غارِ حرا میں نیم خوابیدگی کی حالت میں تھے کہ وہی مانوس آواز گوشِ مبارک سے ٹکرائی ''اے محمد! آپ رسول اللہ ہیں اور میں جبریل ہوں''۔ محمد ﷺ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور منتظر ہوئے کہ جبریلؑ اس کے بعد کچھ اور کہیں گے مگر کوئی آواز پھر نہ آئی۔ صبح جب آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے تو حضرت خدیجہؓ نے محسوس کیا کہ آج آپ قدرے مسرور ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا گزشتہ شب میں نے جبریلؑ کی آواز سنی، وہ کہہ رہے تھے ''اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں''۔ میں مسرور و مطمئن ہوں کہ خداوند کی نظر سے گر نہیں گیا۔

اس کے بعد تین سال تک محمد ﷺ راتوں کو غارِ حرا میں تشریف لے جاتے رہے اور تمام وقت غور وفکر میں مشغول رہتے۔ ہمیشہ خداوند کی طرف دھیان لگائے رکھتے۔ کبھی کبھی جبرئیلؑ کی آواز سنائی دے جاتی: ''اے محمد! آپ رسول اللہ ہیں اور میں جبریل ہوں''۔ اس کے علاوہ جبریلؑ سے کچھ اور نہ سنا گیا۔ اس مدت میں کوئی رات ایسی نہ تھی کہ محمد ﷺ کا دھیان خدا کی طرف نہ رہا ہو۔ وہ نازل شدہ کلام کی تلاوت فرماتے رہتے۔ اس تین سالہ دور کو ''فترت'' کا نام دیا گیا یعنی وہ دور جس میں نزولِ قرآن موقوف رہا۔



آغازِ رسالت

تین سال بعد ایک رات جبریلؑ غارِ حرا میں تشریف لائے اور سورۃ "والضُّحٰی" جو آب قرآنِ پاک کی سورۃ نمبر ۹۳ ہے، آپ ﷺ کے لیے پڑھی۔ یہ سورۃ اگر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کو ایک آیت شمار کریں تو بارہ آیتوں پر مشتمل ہے۔ سورۃ "والضُّحٰی" دوسری سورۃ ہے جو اس تین سالہ دور میں نازل ہوئی۔

''فترت'' کے متعلق محققین اسلام کی آرا مختلف ہیں: بعض کہتے ہیں کہ دورِ فترت چند روز یا زیادہ سے زیادہ دس روز تھا۔ اور بعض نے دورِ فترت کو دس مہینے قرار دیا ہے۔ لیکن برخی، طبری، بیہقی و بخاری نے دورِ فترت کو تین سال لکھا ہے۔

'فترت' کے دوران محمد ﷺ ایک نبی تھے۔ اسی لیے مسلمان دورِ فترت کو دورِ نبوت شمار کرتے ہیں لیکن جب سورۃ 'والضُّحٰی' نازل ہوئی تو آپ کے دورِ رسالت کا آغاز ہوا۔

دورِ نبوت میں محمد ﷺ ایک پیغمبر تھے۔ سورۃ 'والضُّحٰی' نازل ہونے کے بعد 'رسول اللہ' یعنی 'نمائندۂ خدا' (پیغمبرِ خدا) ہوئے۔ نبی یعنی وہ جو اطلاع و بشارت دیتا ہے اور رسول وہ ہوتا ہے جو قانون کتابت شدہ (یعنی لکھا ہوا) نوعِ بشر کے لیے لاتا ہے۔ مغرب کے دانش ور حضرات نبوت اور رسالت کے فرق کو نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی معنی و مطلب میں لیتے ہیں، جب کہ اسلامی مفکرین ان دونوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہیں اور نبوت کو دورِ قبل از رسالت شمار کرتے ہیں جس میں کہ ایک شخص اطلاع و بشارت دینے پر مامور ہوتا ہے مگر جب وہ خدا کا نوشتہ (قانون) لوگوں کو پہنچاتا ہے تو وہ خدا کا فرستادہ یعنی رسول ﷺ کے درجے پر مامور ہو جاتا ہے۔ سورۃ ''والضُّحٰی'' جو کہ دورِ نبوت میں نازل ہوئی، محمد ﷺ کے لیے ایک خوشی و مسرت کا پیغام تھی جس میں اللہ جل شانہ نے پیغمبر ﷺ کی نسبت محبت کا اظہار کیا ہے۔ خداوند کو محمد ﷺ کی سہ سالہ افسردگی کا علم تھا۔ آپ ﷺ کے دل میں خدشات جگہ پکڑتے تھے،

یعنی یہ سوچتے کہ خداوند کی شاید مجھ پر توجہ نہیں رہی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں بڑی محبت اور نوازش کا اظہار کیا ہے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے بعد پہلی دو آیات "والضُّحٰی ○ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ○" میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کے لیے قسم کھائی۔ اس طرح کی قسم ماسوائے قدیم ادبیات کے جو کہ چار یا پانچ ہزار سال قبل مسیح کی بات ہے، اسلام سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس قسم کی قسمیں جو ہندوستان کی مذہبی کتابوں (ویدوں) میں پائی گئی ہیں، سادگی، فصاحت اور زیبائی میں قرآنی قسموں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں۔

اس سورۃ میں خداوند نے محمد ﷺ کے لیے دو چیزوں کی قسم کھائی ہے: ایک طلوعِ خورشید کی اور دوسرے رات کی آمد آمد کی۔ یہ دونوں قسمیں اپنے اندر بہت زیادہ لطافت رکھتی ہیں۔ انسان ان آیات کو پڑھ کر ایسے محسوس کرتا ہے جیسے طلوعِ خورشید ایک طرح کی بہار ہے جس میں تمام گل کھلے ہوئے ہیں اور زمین سبزہ و گل سے پُر ہے۔ سرزمین مغرب کا ایک قاری یا عجمی جو کہ عربی ادب کا ادراک نہیں کر سکتا ''والضُّحٰی'' کا ترجمہ طلوعِ خورشید کرے گا جب کہ عربی زبان میں اس کے فقط یہی معنی نہیں ہے بلکہ مجازی معنی بہت وسیع ہیں۔

عربی زبان میں ''والضُّحٰی'' کے معنی کچھ ایسے ہوں گے: ''قسم اس وقت کی جب آفتاب کی پہلی کرن افق پر ظاہر ہوتی ہے، پھر آہستہ آہستہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور ہر جگہ خورشید کے نور سے منور ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ جہان آفتاب کے نور سے اس طرح منور ہو جاتا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہونے لگتی ہیں۔

دوسری قسم ''وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی'' پہلی قسم کی طرح مجازی معنوں میں بہت وسیع ہے۔ وہ مفہوم جو عربی ذہن اس سے لیتا ہے ایک یورپی یا عجمی ذہن کبھی اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ایک عجمی یا یورپی ذہن اگر اس کا ترجمہ کرے گا تو وہ کہے گا ''اس شب کی قسم جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے''۔ حالانکہ اس کے معنی یہ ہیں ''قسم اس وقت کی جب تاریکی ہر سو پھیل جاتی ہے اور دنیا میں ہر جگہ سکوت ہو جاتا ہے۔ ایک مطلق سکوت کہ دُور کی ایک معمولی سی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے''۔

یہ ترجمہ بھی حقِ معنی ادا نہیں کرسکتا۔ جب ایک عرب اس کو پڑھتا ہے تو اس کی نگاہوں میں عرب کے بیابانوں کا رات کا منظر آموجود ہوتا ہے۔ بیابان کو تاریکی نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ آسمان نے چھت کی طرح صحرا کو ڈھانپ لیا ہے اور سب سمتیں افق پہ جا کر ختم ہوگئی ہیں۔ مگر افق روشن ہیں۔ ستارے آسمان میں چمک رہے ہیں۔ عرب کے بیابانوں میں آسمان کی پہنائیاں صاف اور شفاف ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے ستارے بہت زیادہ روشن نظر آتے ہیں۔ وہاں انسان محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ ہاتھ بڑھائے تو اس تاریک صحرا میں آسمان سے جھلمل کرتے ستاروں کو پکڑ لے گا۔ ہوا میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ ہر طرف سکوت وہُو کا عالم ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک دُور کی آواز جب کانوں سے ٹکراتی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے بہت ہی نزدیکی فاصلے سے سنائی دی ہو۔ اس بیابان میں احساس تنہائی کچھ اس طرح بڑھ جاتا ہے جیسے ابتدا سے آج تک بجز اس کی ذات اور بیابان کے کوئی تیسری چیز وجود نہیں رکھتی۔

یہ سب اور اس نوع کے دوسرے احساسات اگر بیان کروں تو ڈر ہے کہ قاری مجھے خیال پرور سمجھ لے گا۔ "وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَى" کے معنوں کو صحیح طور پر ایک بدوی عرب کا ذہن ہی محسوس کرسکتا ہے۔ دونوں قسموں کے جو معنی اوپر بیان کیے گئے ہیں، یہ فقط مطالب کی ابتدا تک رسائی ہے، نہ کہ اُس کی فصاحت تک۔ ان قسموں کی فصاحت کا ادراک ایک عرب کرسکتا ہے یا پھر ایک عربی زبان کو جاننے والا۔

اس سورہ کی تیسری آیت میں خداوند نے محمد ﷺ سے فرمایا "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى" اس کے بھی مجازی معنی پہلی آیت کے صوری معنوں کے مطابق ہیں۔

خداوند نے اس آیت میں محمد ﷺ کے اندیشوں کا جواب دیا ہے یعنی "تمھارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا" (مت سمجھو کہ خدا نے تمھیں اپنی پہچان کروانے اور تمھیں اپنی دوستی کے لیے منتخب کرنے کے بعد ترک کردیا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھیں دوست رکھے۔ ایسا نہیں ہے۔ خداوند نے تمھیں ترک نہیں کیا۔ تم خداوند کے اسی طرح دوست ہو)۔

اس آیت میں خدا نے محمد ﷺ کی تشویش کو دور کیا اور انھیں آسودگی بخشی کہ وہ خدا سے

دوستی کے بارے میں متردد نہ ہوں۔ اس سورۃ میں جو تنزیل کے لحاظ سے قرآن کی دوسری سورت ہے، خداوند "یتامیٰ" اور "فقرا" کی بات حسبِ حال کرتا ہے جب کہ خداوند جانتا ہے کہ محمد ﷺ خود یتیم تھے۔ بچپن میں ماں باپ کے سائے سے محروم رہے۔ بہت زیادہ رنج اُٹھائے۔ لڑکپن میں پاؤں میں جوتا تک نہیں ہوتا تھا۔ تپتے ہوئے بیابانوں میں جو ریت اور کانٹے دار جھاڑیوں سے پُر ہوتے تھے، آپ پاؤں سے ننگے اور پیٹ سے بھوکے ہوتے تھے۔

اگر محمد ﷺ یتیموں اور فقیروں کی خبر گیری نہ کرتے ہوتے تو خداوند "فترت" کے تین سال بعد دوسری سورۃ میں جو ان پر نازل ہوئی یہ توضیح نہ فرماتے کہ "یتیموں کے حال پر توجہ کیا کرو"۔ اسی سورۃ کی دسویں آیت میں خداوند محمد ﷺ کی زبان سے (بالواسطہ) دوسروں کو کہہ رہے ہیں "وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ" اور سائل کو نہ جھڑکو (یعنی اگر سائل تم سے رجوع کرے تو ماتھے پر شکنیں نہ ڈال لو اور قہر وغصہ سے مت پیش آؤ)۔

آج کے اخلاقی اُصولوں کے تحت ہم گدائی کو ننگ گردانتے ہیں اور مانگنے والے کو معاشرے کا ایک نالائق عضو سمجھتے ہیں۔ آج لوگوں کی یہ رائے ہوگئی ہے کہ جو شخص گدائی کرتا ہے وہ اس قدر نکما اور آرام طلب ہے کہ کام کی تلاش میں نہیں جاتا یا اس قدر کاہل ہوچکا ہے کہ کام کرنا ہی نہیں چاہتا اور کئی قسم کی اخلاقی برائیاں اس کے اندر جڑ پکڑ چکی ہیں۔

چودہ سو سال پیشتر عرب میں بھی گدائی باعث ننگ تھی اور کوئی شخص گدائی نہیں کیا کرتا تھا۔ باوجودیکہ غربت بہت زیادہ تھی، گدائی کا وجود نہیں تھا لیکن ایسے مواقع آہی جایا کرتے تھے کہ دوسروں سے مدد کا خواستگار ہونا ہی پڑتا تھا۔ جب راہزن کسی مسافر کو بیابان میں لوٹ لیتے تو اسے ناگزیر طور پر کسی کے آگے دست سوال دراز کرنا ہی پڑتا تھا۔ جب سیلاب کسی قریہ یا گاؤں کو تباہ و برباد کردیتا تو اس بیچارگی کے عالم میں اس کے سوا کوئی راہ نہ ہوتی کہ دوسروں سے مدد کی درخواست کریں۔ ان دنوں ایسے اداروں کا وجود بھی نہیں تھا جو ان آفت زدوں کو لباس و خوراک مہیا کریں۔

محمد ﷺ بعثت سے قبل بھی سائلوں کی مدد کیا کرتے اور کسی کو محروم نہ لوٹاتے تھے اور اگر

کسی وقت مدد نہ کر سکتے تو سائل سے اس طرح پیش آتے کہ وہ خوش خوش بغیر کسی رنجش کے لوٹتا۔ آپ ﷺ عادتاً خوش اور متبسم رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس سورۃ میں تاکید کی گئی ہے کہ "سائل سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ" محمد ﷺ نے رسالت کے آغاز میں ہی عربوں کو دعوت دی کہ خود کو پہچانیں اور فقر و خرافات سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے اقدام کریں۔

منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد محمد ﷺ کی نظر رسا ایک غیر جانب دار کے لیے توجہ طلب ہے۔ محمد ﷺ کی رسالت صرف مذہب تک محدود نہیں تھی بلکہ اجتماعیت اور اقتصادیات تک وسیع تھی۔ سرزمین عرب میں چودہ سو سال پہلے ان رسوم کی موجودگی میں جن کا مختصراً ذکر ہو چکا ہے، اجتماعیت اور اقتصادیات کو ایک نئی طرح دینا ایک فوق العادۃ کام تھا جو محمد ﷺ نے بعثتِ رسالت کے ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ محمد ﷺ کی رسالت ایک مذہب ہی نہ تھی بلکہ یہ رسالت اجتماعی اور اقتصادی پہلو میں بھی ہمہ گیر تھی، قرآن پاک کی ۶۲۱۹ آیتوں میں متعدد دلائل موجود ہیں۔ اگر میں یہ ذکر چھیڑوں تو اہل یورپ کے لیے اکتاہٹ کا باعث ہوگا کیوں کہ وہ مسلمانوں کی مانند قرآنی آیات سے آشنائی نہیں رکھتے۔

میں نے دو فرانسیسی دانشوروں سے جو کہ عربی زبان پر عبور رکھتے ہیں اور عربی کی تاریخ میں انھیں تخصص حاصل ہے، سنا: "محمد ﷺ کو جو قوانین خداوند کی طرف سے تفویض ہوئے ان کا فقط ایک ناشر تصور کرنا اشتباہ ہے۔ محمد ﷺ ایک بہت بڑے اجتماعی اور اقتصادی نظام سے متعلق قوانین کے ناشر، مبلغ اور مذہبی پیشوا تھے۔ اور ہر نوع کے قوانین جو خداوند کی طرف سے آپ ﷺ پر نازل ہوتے کہ ان کی تبلیغ کی جائے، بتدریج نازل ہوتے تھے۔

عرب اس موضوع پر حیرت زدہ تھے اس لیے کہ گزشتہ ادوار میں آسمانی قوانین ایک ہی مرتبہ نازل ہوا کرتے تھے نہ کہ بتدریج۔

محمد ﷺ کی بعثت سے قبل جو پیغمبر مامور ہوئے اپنے قوانین ایک ہی بار لائے لیکن وہ قوانین جو محمد ﷺ پر نازل ہوئے وہ ۶۱۰ میلادی سے لے کر تا رحلت رسول ﷺ یعنی ۲۳ سال تک مرحلہ وار نازل ہوتے رہے۔

قرآن پاک بتدریج نازل ہونے کی علت جیسا کہ قرآن کی پچیسویں سورہ (فرقان) کی بتیسویں آیت میں مذکور ہے، یہ تھی کہ محمد ﷺ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ آیاتِ قرآنی کو (بطریق حفظ) محفوظ کر لیں۔ دوسرے یہ کہ آیات قرآنی ہر دور میں اس کے تقاضوں کے مطابق جدید قوانین کی حامل ہوتی تھیں۔

محمد ﷺ سے پیش تر جن پیغمبروں پر کتابیں اُتاری گئیں وہ اَن پڑھ (اُمّی) نہیں تھے، لہٰذا آسمانی کتاب ایک ہی مرتبہ ان پر نازل کی جاتی تھی۔

محمد ﷺ چونکہ (امی) بھی تھے، اسی لحاظ سے اُن پر آیات بتدریج نازل ہوئیں تاکہ آپ ﷺ ان تمام کو (بطریق حفظ) محفوظ رکھ سکیں۔

اجتماعی و اقتصادی پروگرام جو محمد ﷺ کی پیشوائی میں برپا ہوا، اس طرح حرکت میں آیا کہ ابھی آدھی صدی نہ گزرنے پائی تھی کہ دنیا کی تین بڑی شہنشاہیتیں (ایران، مصر، روم) اس پروگرام (اسلام) کے سامنے سرنگوں ہوگئیں۔ ان ممالک کے عوام مسلمان ہوگئے۔ دنیا میں کوئی دین اس تیزی سے نہیں پھیلا۔ اگر محمد ﷺ کے قوانین بھی مذہب تک ہی محدود ہوتے تو اسلام بھی اس سرعت سے نہ پھیلتا۔

اسلام کے اس سرعت سے پھیلنے کی وجہ اس کا اجتماعی اور اقتصادی پروگرام ہی تھا۔ محمد ﷺ کے اجتماعی پروگرام کی اصل آج بھی زبانِ زدِ عام ہے یعنی "وحدتِ نوعِ بشر"۔

قرآن میں نوعِ بشر کو ایک ملتِ واحدہ کہا گیا ہے۔ اختلافات جو ملت ہائے جہان کے مابین پیدا ہوتے ہیں، وہ فقط ظلم، فساد اور بے انصافی کی پیداوار ہیں۔ خداوند نے قرآن کی سورۃ بقرہ کی آیت ۲۱۳ میں اس موضوع پر فرمایا:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ یعنی "تمام انسان ایک ہی اُمت تھے۔"

بلاشبہ محمد ﷺ کا ایک بڑا مقصد دائرہ اسلام میں وحدتِ نوعِ بشر تھا۔ اسی لیے خداوند نے آپ ﷺ کے دین کی اساس ملتِ ابراہیمی پر رکھی۔

ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ مسیحی اور نہ ہی بت پرست تھے بلکہ ایک مسلم تھے اور ایک خدا کی پرستش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی اور مسیحی دونوں ابراہیمؑ کو پیغمبر مانتے ہیں۔

محمد ﷺ نے اپنے دین کی اساس بھی اسی وجہ سے ملتِ ابراہیمؑ پر رکھی تاکہ یہودی و عیسائی قومیں اس دین کا خیر مقدم کریں۔ یہی باعث ہوا کہ جب آپ ﷺ نے اُمورِ رسالت کی انجام دہی کا کام شروع کیا تو کسی مذہب (اہلِ کتاب) کی مخالفت نہ کی بلکہ انھیں دعوت دی کہ اسلام کو قبول کر لیں۔

پیغمبرِ اسلام کا نظریہ یہ تھا کہ جو احکام موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کی تحریف کر دی ہے۔ اب ان کی زندگی شریعتِ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے مطابق نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ نے ان سے وہ سعادت واپس لے لی ہے۔ اب وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر یہ سعادت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔

''اسلام'' عربی زبان کا ایک خوبصورت لفظ ہے اور یہ قرآن پاک کے برجستہ اور قابلِ توجہ الفاظ میں سے ایک ہے۔ روایت سے معلوم ہے کہ محمد ﷺ کی بعثت سے قبل ''اسلام'' کا صرف ایک بار ذکر آیا ہے اور وہ بھی جب ابراہیمؑ نے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا تہیہ کیا اور خداوند نے قربانی معاف فرما دی۔

روایت ہے کہ اس کے بعد خداوند نے کہا: اَسْلَمَا ''ابراہیمؑ اور ان کا بیٹا اسماعیلؑ اسلام لائے'' یعنی ارادۂ خداوندی پر راضی ہوئے اور ''اسلام'' یعنی ارادۂ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور خود کو ''مسلم'' یعنی ارادۂ خداوندی کے تحت قرار دیا۔

''قرآن'' جیسا کہ کہا جا چکا ہے عربی زبان کے خوبصورت ترین کلمات کا مجموعہ ہے۔ اسے فرقان بھی کہتے ہیں یعنی فرقہ فرقہ یا حصہ حصہ کر کے، پارہ پارہ کر کے، تھوڑا تھوڑا کر کے۔ قرآن پاک کو فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تمام حصے ایک بار نازل نہیں ہوئے بلکہ تھوڑے تھوڑے حسبِ ضرورت نازل ہوتے رہے۔

جیسا کہ معلوم ہے عربی کلمات کا ایک حصہ خارجی زبانوں پر مشتمل ہے اور وہ الفاظ ظہورِ

اسلام سے کہیں پہلے عربی میں داخل ہوئے اور چونکہ مستعمل تھے، لہٰذا قرآن میں بھی استعمال ہوئے۔ ان الفاظ میں سے ایک لفظ خود قرآن ہے۔ قراءت اور قرآن، یہ دونوں الفاظ سریانی زبان سے عربی میں وارد ہوئے۔ قرآن یعنی قراءت یا کلام مقدس کو ازبر یا حفظ کرنا۔ اسی وجہ اور معنی کی بنا پر علم کلام کو قرآن نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے بھی اب یہ نام (قرآن) مخصوص ہو گیا ہے۔ اس کا اطلاق اس مجموعہ کلام پر ہوتا ہے جو خداوند کی طرف سے محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ کسی دوسرے کلام کو قرآن نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ مسلمان دانشوروں کا یہ عقیدہ ہے کہ تیسری سورۃ جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی وہ سورۃ ''قیامت'' ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو ایک آیت شمار کیا جائے تو اس کی چالیس آیتیں ہوتی ہیں۔

محمد ﷺ پر جب کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ جلدی جلدی پڑھا کرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا کچھ حصہ فراموش ہو جائے۔ اسی نسبت سے سورۃ قیامت کی سترھویں آیت میں فرمایا: اے میرے رسول ﷺ! جب قرآن کو پڑھو تو زبان کو اس سرعت سے حرکت مت دو، یعنی قرآن کو جلدی جلدی مت پڑھو۔

اُٹھارہویں آیت میں فرمایا: ہم قرآن کو تمھارے ضمیر میں جمع کر دیں گے اور تمھارے لیے اس کی تلاوت (قرآن) آسان کر دیں گے۔

اسی طرح انیسویں آیت میں فرمایا: صبر کرو کہ ہم تمھارے لیے آیاتِ قرآنی قراءت کریں۔ ساتھ ساتھ تم بھی قراءت کرو اور مطمئن رہو کہ یہ تمھیں حفظ ہو جائے گا۔

بیسویں آیت میں فرمایا: اور اگر حفظ کرنے کے بعد سمجھنے میں کوئی اشکال پیدا ہو تو ہم اس مشکل کو دور فرمائیں گے اور تمھارے لیے توضیح کریں گے۔

ان آیات کے نزول کے بعد محمد ﷺ قرآن کو پڑھنے میں جلدی نہیں فرماتے تھے بلکہ بڑی ملائمت کے ساتھ قراءت فرماتے تھے۔

قرآن پاک مرحلہ وار تیئیس سال میں نازل ہوا اور اگر دورِ فترت تین سال (بعض علما کے مطابق چند دن یا چند مہینے) شمار کریں تو اس صورت میں نزول کی مدت اس سورۃ کے علاوہ

جو غارِ حرا میں نازل ہوئی بیس سال رہ جاتی ہے۔ آج ہم اگر تاریخِ اقوامِ عرب پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اعراب بدوی اسلام سے قبل کیسی زندگی کے عادی تھے اور قرآن کے مرحلہ وار نزول کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔

اس لیے کہ اگر یہ ۶۲۱۹ آیات ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتیں تو اس دور کے افراد جو سادہ، ان پڑھ اور بے علم تھے، چکرا کر رہ جاتے اور کچھ بھی نہ سمجھ سکتے۔ حتیٰ کہ آج جب کہ بیسویں صدی عیسوی ہے لوگ تعلیم یافتہ ہیں، اقوام کا عالمی سطح پر رابطہ ہے، عالمی سطح پر لوگوں کی فکر چودہ سو سال والے پہلے دور سے بہت بلند ہو چکی ہے اگر ایک نئی حکومت وجود میں آئے تو وہ بھی ایک ہی مرتبہ تمام قوانین وضع نہیں کر سکتی۔ کجا آج سے چودہ سو سال پہلے کا دور اور وہ بھی بدوی عربوں کا۔ اگر قرآن ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو اعراب بادیہ نشین جن کا ذہن و حافظہ اس کلام و قانون کے مطابق وسیع نہیں تھا، قرآن کے اثرات کو قبول نہ کرتے۔ عقلی و طبیعی طریقہ نزول قرآن کا وہی ہو سکتا تھا جو اپنایا گیا یعنی مرحلہ وار نزول تا کہ بدوی عرب رفتہ رفتہ کلام و احکام خداوندی سے مانوس ہوتے اور قبول کرتے جائیں۔



سابقین

سب سے پہلے جو پیغمبرِ اسلام ﷺ پر ایمان لائیں وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آپؐ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ دوسرے نمبر پر رسولِ مقبول ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب تھے جن کو آپؐ بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ تیسرے نمبر پر حضرت زیدؓ، آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، انھوں نے والدین پر حضرت محمد ﷺ کو ترجیح دی تھی۔

ان تینوں کے ایمان لانے کے بعد کوئی اور ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔ ۶۱۰ء سے ۶۱۳ء یعنی تین سال تک قافلۂ اسلام محمد ﷺ کے علاوہ ان تین افراد پر مشتمل تھا۔ تیسرے سال حضرت ابوبکرؓ مسلمان ہوئے[1] اور تعداد چار ہو گئی۔ محمد ﷺ ہر چند کوشش فرماتے کہ ساکنین مکہ اسلام کو قبول کریں مگر ایسا نہ ہوا۔ مکہ کے لوگ محمد ﷺ کے دین کو قبول نہیں کر رہے تھے لیکن مخالفت بھی نہیں کر رہے تھے۔ محمد ﷺ جب دعوتِ اسلام دیتے تو ساکنین مکہ دشمنی کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے اور نہ بے اعتنائی ہی برتتے تھے۔

ابوبکرؓ کے مسلمان ہونے کے بعد ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام عائشہ رکھا گیا۔ یہ پہلی لڑکی تھی جو پیدائشی مسلمان تھی اور جس کا باپ مسلمان تھا۔ اس وقت خداوند کی طرف سے جیسے کہ سورۃ ''شعراء'' کی آیت نمبر ۲۱۴ میں ذکر ہوا ہے، محمد ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اپنے اقربا کو دعوتِ اسلام دیں:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ ''اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ''۔

روایت سے ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ ﷺ نے اپنے چچازاد

۱۔ ابوبکرؓ پہلے ہی دن مسلمان ہو گئے تھے جب خدیجہؓ، علیؓ اور زیدؓ اسلام لائے تھے (رحمۃ للعالمین از سلیمان منصور پوری ص ۵۶)

حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کو ہدایت کی کہ تمام چچاؤں اور ان کے خاندان والوں کو دعوت دے آئیں کہ وہ ہمارے ہاں تشریف لائیں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ دعوت آپ ﷺ کے چچا ابوطالب، ابولہب اور ان کے خاندان والوں نے قبول کی۔ سب دعوت میں آئے، کھانا کھایا۔ کھانا تمام ہونے پر محمد ﷺ نے انھیں دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی لیکن کسی ایک نے بھی ان کی بات کی پذیرائی نہ کی۔ فقط علیؓ اپنی جگہ سے اُٹھے اور کہا کہ اے محمد ﷺ میں آپ ﷺ کی دعوت قبول کرتا ہوں اور میں ایمان لاتا ہوں۔ اس روایت کے آخری حصہ میں اختلاف پایا جاتا ہے، نیز علیؓ ابنِ ابی طالب اس ضیافت سے بہت پہلے ایمان لا چکے تھے۔ اختلافی روایت میں مذکور ہے کہ علیؓ دوسرے فرد تھے جو حضرت خدیجہؓ کے بعد ایمان لائے۔

تاریخ اور دوسرے شواہد کے مطابق صحیح روایت ایسے ہوگی۔ جب محمد ﷺ کو خداوند نے حکم فرمایا کہ اپنے عزیزوں کو دینِ اسلام کی دعوت دیں تو پیغمبر ﷺ نے اپنے عزیزوں کی رُوحانی اقدار کا پوری طرح جائزہ لیا۔ سب سے پہلے چچا ابوطالب کا جائزہ لیا۔ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ وہ راست رو ہیں مگر کبر سنی کے پیشِ نظر اپنے اجداد کے مذہب کو ترک نہیں کریں گے اور میرے دین کو نہیں اپنائیں گے۔ ابوطالب کے بعد عبدالمطلب کی اولاد میں سرکردہ فرد ابولہب تھا جو ابوطالب کا بھائی تھا۔

ابولہب مکّہ کا ایک ثروت مند تاجر تھا۔ مذہب سے اسے کوئی دلچسپی تھی تو بس اس حد تک کہ اس کی تجارت متاثر نہ ہو۔ باقی سب تاجران قریش کا بھی ایسا ہی اندازِ فکر تھا۔ مذہب کو صرف اس لیے عزیز رکھتے تھے کہ یہ تاجروں کی حمایت اور مفاد میں ہے۔ مذہب میں ایک یہ پابندی بھی تھی کہ سال میں چار ماہ جنگ اور لوٹ مار حرام ہو جاتی تھی تا کہ کاروانوں کی آزادانہ آمدورفت ہو سکے اور مکّہ کا سالانہ تجارتی میلہ خوب رونق پذیر ہو۔ محمد ﷺ کو جہاں یہ امید نہ تھی کہ چچا ابوطالب مسلمان ہوں گے، وہاں انھیں یہ بھی احساس تھا کہ ابولہب جدید مذہب کو بالکل قبول نہیں کرے گا۔

ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل، ابوسفیانؓ کی بہن تھی جو کہ مکّہ کا امیر ترین تاجر تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور تونگر بھی تھی۔ محمد ﷺ اور ابولہب کے درمیان چچا بھتیجے کے رشتے کے علاوہ ایک اور قرابت بھی تھی، وہ یہ کہ ابولہب کے دو لڑکے محمد ﷺ کے داماد تھے۔ آپ ﷺ کی چچی اُمِ جمیل شاعرہ بھی تھی اور شعر خوب ترنم سے پڑھا کرتی تھی۔ اسے ہجو کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ محمد ﷺ نے جب تبلیغ شروع کی تو جمیلہ آپ ﷺ کی ہجو کہا کرتی تھی۔

ابولہب اور اس کی بیوی اسلام نہیں لانا چاہتے تھے۔ وہ عقیدتاً اس کے مخالف تھے، اس لیے کہ عبدالمطلب کا یہ بیٹا ہر چیز کو ایک تاجر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کی دنیا بس خرید و فروخت اور سود پر روپیہ پیسہ قرض پر اُٹھانے تک محدود تھی۔

عبدالمطلب کا تیسرا لڑکا حمزہ تھا۔ خداوند کے حکم کے مطابق اس کو بھی دعوتِ حق دی جانی تھی۔ حمزہ پہلوان تھا اور پہلوانی کے سوا اُسے کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ پہلوانی کے مقابلوں کے علاوہ اور کسی طرف توجہ ہی نہ تھی بلکہ پہلوانوں کے سوا دوسرے افراد کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ سچا اور وعدے کا پکا انسان تھا۔ محمد ﷺ سوچتے تھے یہ بھی مسلمان نہیں ہوگا کیوں کہ مذہب سے وہ بے اعتنا تھا۔ عبدالمطلب کا چوتھا لڑکا عباس تھا جو پیشے کے لحاظ سے ایک سود خور صراف تھا۔ مکہ، مدینہ اور طائف کے تاجروں سے وہ کاروبار کرتا تھا۔ عباس کی دنیا میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو سود پر قرض لینے آتے تھے اور دوسرے وہ جو قرض لے چکے ہوتے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ سود وصول کرے اور بغیر وثیقہ و ضامن کے کسی کو قرض نہ دے۔

محمد ﷺ نے عبدالمطلب کے تمام فرزندوں کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ابوطالب بوڑھے اور ضعیف ہیں۔ ابولہب تاجر، حمزہ پہلوان اور عباس سود خور ہیں۔ ان کا مذہب سے تعلق اپنی دنیاوی منفعت تک محدود تھا۔ محمد ﷺ جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی کلامِ حق سننے پر آمادہ نہیں ہوگا مگر حکمِ خداوندی سے فرار ممکن نہ تھا۔ نیز خداوند نے فرمایا تھا اپنے عزیزوں کو دینِ اسلام کی دعوت دو۔

محمد ﷺ دیکھ رہے تھے کہ ان کی گرمیِ نفس عزیزوں پر کوئی اثر نہیں چھوڑے گی۔ اسی وجہ سے بہت متفکر ہوئے یہاں تک کہ بیمار ہو گئے۔ نزدیکی عزیزوں کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے سوچا کیا خوب ہو کہ میں دوسرے عزیزوں کو دعوت دوں کہ دین حق کو قبول کریں مگر حکم خداوندی بہت واضح تھا۔ بالآخر آپ ﷺ نے چالیس افراد یعنی چاروں فرزندانِ عبدالمطلب اور ان کے خاندان کے دوسرے چھتیس افراد کو اپنے گھر آنے اور کھانا کھانے کی دعوت دی۔ میزبانی کے فرائض حضرت علیؓ کو تفویض ہوئے۔ ویسے بھی رسول اللہ ﷺ حضرت علیؓ کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ دعوت کی رُوداد، روایت میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب کچھ کھانا لائے اور مہمانوں کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ اللہ کے نام سے شروع کیجیے۔ جو کھانا حضرت علیؓ لائے وہ بہت تھوڑا تھا لیکن مہمان ہر چند کھاتے وہ کم نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر بھی تھوڑا سا کھانا بچ رہا۔ مہمان جب کھانے سے فارغ ہوئے تو محمد ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا پینے کے لیے پانی بھی لائیں۔ حضرت علیؓ ایک پیالہ پانی کا لائے کہ بمشکل ایک فرد کے لیے کافی ہوگا مگر تمام مہمانوں کے نوش کرنے کے بعد بھی پانی کی مقدار ویسی کی ویسی تھی۔ حاضرین بہت متعجب ہوئے۔ صرف ابولہب نے کہا کہ محمد ﷺ نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔

سب مہمان فوراً ہی دسترخوان سے اُٹھے اور چل دیے۔ محمد ﷺ کو فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ دین حق کی بات کر سکیں۔ دوسری روایت میں مذکور ہے کہ جب طعام کھایا جا چکا تو محمد ﷺ چاہتے تھے کہ بات شروع کریں کہ مدعوین اُٹھ کر چل دیے اور محمد ﷺ کا مقصود جس کے لیے دعوت دی گئی تھی پورا نہ ہو سکا۔ بہرحال واقعہ روایتاً مذکور ہوا ہے اور اس کا میں بحوالہ روایت ہی ذکر کرتا ہوں۔ سرزمین مغرب کا مؤرخ جب کوئی واقعہ سنتا ہے تو دلیل مانگتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ تھوڑا سا کھانا ہو اور سب کا پیٹ بھرنے کے بعد بھی ختم نہ ہوا اور پانی پی جانے کے بعد بھی اتنی مقدار میں بچ رہا۔ میں نے جو اس روایت کو نقل کیا ہے علم تاریخ کی رُو سے اسے زیر بحث نہیں لاؤں گا۔ صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ محمد ﷺ نے دینِ اسلام کی تبلیغ کے سلسلے

میں ایک ہی دعوت دی تھی اور وہ یہی دعوت تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے افراد کو کبھی اکٹھا نہ کر سکے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اس واقعہ کے بعد ان سے دور دور رہنے لگے تھے اور ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل تو محمد ﷺ کی ہجو کہتی پھرتی تھی۔

محمد ﷺ نے سوچا کہ میں حکمِ خداوندی قرابت داروں کو نہیں پہنچا سکا، لہٰذا اب تمام مکّہ والوں کو کوہِ صفا پر جمع کروں اور دعوت دین حق دوں۔ کوہِ صفا بھی جبل النور کی طرح مکّہ کے اطراف میں ایک ٹیلہ ہے جسے اہلِ عرب جبل یا پہاڑ کہتے ہیں۔ محمد ﷺ کا خیال تھا کہ جب تمام اہل مکّہ کوہِ صفا پر جمع ہوں گے تو ان میں یقیناً میرے عزیز و اقارب بھی ہوں گے، لہٰذا حکم خداوندی کے مطابق دعوت دین حق ان تک بھی پہنچ جائے گی۔

اسی سوچ کی بنا پر اہل مکّہ کو اطلاع دی گئی کہ ایک مقررہ دن کوہ صفا پر جمع ہو جائیں کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) انھیں اہم معلومات بہم پہنچانا چاہتے ہیں۔ تمام لوگ جن میں عبدالمطلب کا خانوادہ بھی شامل تھا، مقررہ دن کوہِ صفا پر جمع ہو گئے۔ محمد ﷺ ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: اگر میں تم سے کچھ کہوں تو کیا تم یقین کر لو گے؟

حاضرین نے جواب دیا: ہم تمھارے کہنے کو یقیناً حق جانیں گے، اس لیے کہ تم ایک سچے آدمی ہو اور ہم نے آج تک تمھیں جھوٹ بولتے نہیں سنا۔

اس کے بعد محمد ﷺ نے حاضرین سے فرمایا: خداوند نے مجھے رسالت کے لیے منتخب فرمایا ہے اور میں اس کی طرف سے مامور کیا گیا ہوں اس بات پر کہ تمھیں دعوت دوں کہ خداوند کے حکم کو مانو اور امرالٰہی کی اطاعت کرو۔ اگر تم نے اطاعت نہ کی تو تم پر عذاب نازل ہوگا۔

طبری نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ابولہب پکارا: اے محمد ﷺ! کیا تم نے صرف یہی کچھ کہنے کے لیے ہمیں یہاں بلایا ہے؟ تمھیں یہ خیال نہ ہوا کہ یہ باتیں اتنی وقعت نہیں رکھتیں کہ ہم اپنے کام چھوڑ کر یہاں جمع ہوں۔ پھر جمعیت کو مخاطب کر کے بولا: ”اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے پر کان نہ دھرو، اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تو عقل کھو بیٹھا ہے“۔ لوگ منتشر ہو گئے اور واپس چل دیے بجز دو افراد کے ان

میں سے ایک علیؓ ابنِ ابی طالب اور دوسرے زیدؓ تھے۔ اس دن کے بعد پیغمبرِ اسلام کے خاندان والوں نے کہ یہ سب جزوِ قریش تھے، شدید طعن وتمسخر شروع کردیا۔ بالآخر قریش خصوصاً ابولہب اور اس کی بیوی نے محسوس کیا کہ زبانی حملے یعنی طعن وتمسخر کا محمد ﷺ پر کوئی اثر نہیں ہورہا تو دوسرے طریقوں سے انھیں آزار پہنچانا شروع کردیا۔ ابولہب اور اس کی بیوی محمد ﷺ کے گھر میں پتھر پھینکتے۔ کھڑکیاں کہ لکڑی کی ہوتیں، پتھر لگنے سے ٹوٹ جاتیں۔ یہ دونوں بچوں کو پیسے دیتے کہ وہ محمد ﷺ کے گھر پتھر پھینکیں۔ مردہ جانور اور گندگی اُٹھا لاتے اور محمد ﷺ کے گھر میں پھینک دیتے۔

جب محمد ﷺ گھر سے باہر تشریف لاتے تو بچے ابولہب اور اُمِ جمیل کی شہ پر آپ ﷺ کو پتھر مارتے۔ عموماً اس سنگ زنی سے آپ ﷺ کا چہرہ اور سر زخمی ہوجاتے۔ آپ ﷺ اپنے دامن سے خون صاف فرماتے۔ جب انسان کو اس کا نصب العین معلوم ہو تو اسے درد اور تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ اُمِ جمیل جیسا کہ کہا جاچکا ہے محمد ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھا دیا کرتی تھی تاکہ آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہوں۔ آپ ﷺ جب گھر واپس آکر پاؤں سے کانٹے نکالتے تو زخموں سے خون جاری ہوجاتا۔

ان لوگوں نے آپ ﷺ کو اس قدر اذیت پہنچائی کہ ایک دن آپ ﷺ پکار اُٹھے: ''خداوندا! تو جانتا ہے کہ یہ وہ لوگ نہیں جو تیرے دین کو قبول کریں''۔ اس حرفِ شکایت کے بعد جبریلؑ تشریف لائے اور آپ ﷺ کے لیے چند آیات پڑھیں جو کہ قرآن کی پندرہویں سورۃ ''حجر'' میں شامل ہیں۔ اس سورۃ کی چورانویں آیت یہ ہے:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ یعنی ''پس اے نبی ﷺ، جس چیز کا تمھیں حکم دیا جارہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو''۔

اسی سورت کی آیت پچانوے میں فرمایا:

﴿ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴾ یعنی ''تمھاری طرف سے ہم ان مذاق اُڑانے والوں

کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں''۔ مقصد یہ ہے کہ محمد ﷺ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کردیں، خدا خود انھیں سزا دے گا۔

اسی سورۃ کی آیت ستانوے میں خداوند نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ یعنی ''ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تمھارے بارے میں بناتے ہیں ان سے تمھارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے''۔

خداوند سورۃ ''حجر'' کی آخری آیت میں یہ فرماتے ہیں: ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ یعنی ''اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے''۔

اس آیت میں خداوند اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تمام آزار وتکلیفات کے باوجود جو تمھیں پیش آرہی ہیں، رسالت کے کام کو آخری دم تک نبھاؤ۔

ان آیات میں سے بعض میں خداوند نے محمد ﷺ کی دلداری فرمائی اور کہا ہے ایسا نہ ہونے دینا کہ مشرکین فوقیت حاصل کریں، محمد ﷺ کو تشفی حاصل ہوئی اور اس کے بعد آپ ﷺ نے غیر معمولی ثابت قدمی دکھائی۔

ایک روز محمد ﷺ اور خدیجہؓ دونوں گھر پر ہی تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں بیٹیاں جو ابولہب کے بیٹوں سے بیاہی ہوئی تھیں، اپنے سامان کے ہمراہ آگئیں اور والدین سے کہا کہ ہمارے شوہروں نے ہمیں طلاق دے دی ہے اور کہا ہے کہ باپ کے گھر واپس چلی جاؤ۔

خدیجہؓ نے پوچھا: تمھیں کیوں طلاق دی گئی ہے؟

بیٹیوں نے کہا کہ ہمارے شوہروں نے ابولہب اور اُمِ جمیل کے کہنے پر ہمیں طلاق دی ہے۔ انھوں نے اپنے لڑکوں سے کہا تھا: یہ کوئی شائستہ بات نہیں ہے کہ تمھاری بیویاں محمد ﷺ کی بیٹیاں ہوں جس سے اس وقت سارا مکہ نفرت کرتا ہے اور اس طرح کے گھرانے سے رشتہ داری باعثِ ننگ ہے۔ خدیجہؓ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئیں لیکن محمد ﷺ نے ان کی دلجوئی فرمائی۔

محمد ﷺ بدوی عربوں کی طرح راسخ العقیدہ سمجھے جاتے تھے۔ بدوی عرب ایک یورپین

نہیں کہ نظریے (Ideology) کا محتاج ہو۔ یورپ کے لوگ یونان، رُوم سے تمدنی رشتہ کے باعث نظریے کی عادت میں مبتلا ہیں۔ ایک یورپین کے ذہن میں ممکن ہے کئی افکار سما سکیں مگر ایک بدوی عرب کے ذہن میں بیک وقت کئی افکار جگہ نہیں پکڑ سکتے۔ بدوی عرب مصلحت پرست یورپین کی طرح افکار ہائے گوناگوں کے پیچھے نہیں دوڑتا اور جب اس کے ذہن میں ایک عقیدہ جاگزین ہوجائے تو پھر اس کے ذہن سے اس عقیدے کا نکلنا محال ہے، اِلّا یہ کہ کوئی قوی تر اور مؤثر تر عقیدہ سامنے لایا جائے۔

یہ موضوع عربستان میں اس حد تک صادق ہے کہ آج بھی ایک بدوی عرب عربستان میں جہاں اس وقت تیل کی پائپ لائنیں جزیرہ نمائے عرب کے وسط سے گزر رہی ہیں اور عربستان کے آسمانوں سے روز و شب ہوائی جہازوں کی آوازیں آتی ہیں، نظریے کا مطیع و تابع نہیں ہے۔ آج بھی ایک دو یا تین سے زیادہ افکار ایک بدوی عرب کے ذہن میں نہیں آتے۔ لیکن جب بھی کوئی فکر اس کے ذہن میں جگہ پکڑ جائے اور اس فکر سے اگر ایک عقیدہ وجود میں آجائے تو محال ہے کہ وہ اس عقیدے کو چھوڑ دے۔

ایک عرب شاعر شنفرہ گزرا ہے۔ اس کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے بدوی عربوں کے تعصب یا عقیدے کی پختگی کا تعین ہوجائے گا۔ یہ شاعر صرف اپنے دور کا ہی معروف شاعر نہ تھا بلکہ آج بھی اس کا کلام بدوی عربوں کی زبان پر ہے اور وہ اس کو خوب پہچانتے ہیں۔ شنفرہ ریگزاروں میں آوارہ پھرا کرتا تھا۔ ایک روز قبیلہ بنی سلیمان کے ایک فرد نے اس کی توہین کی۔ قبائلی قانون کے مطابق اس نے قبیلہ بنی سلیمان سے انتقام لینے کی ٹھان لی، اس لیے کہ قبائلی قانون میں فرد انفرادی حیثیت میں قابل گرفت نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس کا قبیلہ جواب دہ اور موردِ الزام سمجھا جاتا تھا۔ شنفرہ نے خود سے عہد کیا کہ وہ اپنی توہین کے عوض قبیلہ بنی سلیمان کے ایک صد افراد کو قتل کرے گا۔

عہد کر لینے کے بعد شنفرہ نے اپنے قبیلہ کو خیرباد کہہ دیا۔ تیر و کمان لے کر بنی سلیمان کے افراد کی گھات میں رہنے لگا۔ بالآخر پندرہ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ قبیلہ بنی

سلیمان کے ننانوے افراد قتل کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن ایک دن جب کہ وہ ایک کنویں سے پانی نکال رہا تھا، کچھ رہزنوں نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس کی لاش درندوں اور پرندوں کی خوراک بنی۔ فقط ہڈیاں باقی رہ گئیں اور وہ بھی منتشر حالت میں۔ کھوپڑی کنویں کے نزدیک ہی پڑی رہ گئی۔ آخر ایک دن قبیلہ بنی سلیمان کے کچھ افراد سفر کرتے ہوئے اس کنویں پر پہنچے اور کنویں سے پانی نکالنے لگے۔ اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہوا نے کھوپڑی کو اُٹھا کر ایک فرد کے پاؤں پر پٹخ دیا جس سے اس کا پاؤں زخمی ہوگیا۔ علاج معالجہ کے باوجود اس شخص کی موت اسی زخم کے باعث ہوئی۔ اس طرح شنفرہ نے اپنی قسم بعد از مرگ بھی پوری کردی اور اپنی کھوپڑی کی ہڈی سے قبیلہ بنی سلیمان کے ایک فرد کو زخمی کر کے کشتگان کی تعداد ایک سو پوری کردی۔ ظاہر ہے کہ اس سرگزشت کا آخری حصہ ایک روایت ہے اور ایک مؤرخ کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہمارا اس ذکر سے مقصد بدوی عرب کے تعصب اور پختگی کو ظاہر کرنا تھا جو نسل در نسل منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔

محمد ﷺ ایک عرب تھے اور دوسرے تمام بدوی عربوں کی طرح اپنے عقیدے پر محکم تھے۔ خداوند نے انھیں جب پیغمبری پر مبعوث فرمایا تو نزولِ وحی کے ساتھ ہی خداوند اور دین جدید پر آپ ﷺ کا عقیدہ پختہ ہوگیا۔ لہٰذا عزیزوں کی ایذا رسانیوں کے باوجود آپ ﷺ کسی جگہ سے بھی پسپا نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس ان کا یہ عقیدہ کہ اس دین کو عربوں میں رائج کردیں، مزید محکم و قوی تر ہوتا چلا گیا۔

جب محمد ﷺ کو پیغمبرِ خدا ہونے کا یقین ہوگیا تو آپ ﷺ مکلف ہوگئے کہ خداوند کے دینِ جدید کو اہل عرب میں رواج دیں اور اس فرض کی انجام دہی میں اگر اپنی جان بھی خطرہ میں نظر آتی تب بھی آپ ﷺ تبلیغ کا کام چھوڑنے والے نہیں تھے۔ بعثت کے چوتھے سال تک محمد ﷺ کے خاندان اور دوسرے قبائل کے افراد کی ایذا رسانی انتہا کو پہنچ چکی تھی جو ہم بیان کر چکے ہیں لیکن اس سال کے بعد انھوں نے محمد ﷺ کو قتل کردینے کا ارادہ کیا۔ محمد ﷺ اب کھلے بندوں اسلام کی تبلیغ کا آغاز کر چکے تھے۔ اپنے عزیزوں سمیت تمام قریشی قبائل

سے فرمایا کرتے کہ تم ان جدا جدا خداؤں (جو تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشے یا بنائے ہیں) کی پرستش کرنا چھوڑ دو اور خدائے یگانہ کی پرستش کرو۔ وہ عزیز اور قبیلہ قریش کے دوسرے افراد ان سے پوچھتے: آیا ہم تیرے کہنے پر اپنے آباؤ اجداد کے خداؤں کو چھوڑ پرے کریں؟

محمد ﷺ فرماتے: ہاں، ایسا ہی کرو۔ اور کہو "لاالہ الا اللہ" تاکہ تمھاری بخشش ہو۔

یہی موقع تھا جب قریش کا قہر و غضب اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور انھوں نے محمد ﷺ کو قتل کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ محمد ﷺ کی عادت تھی کہ آپ ﷺ دن کو گھر سے کعبہ تشریف لے جاتے اور وہاں خداوند کی یاد میں مشغول ہو جاتے۔

قریش کو آپ ﷺ کی عادات کا علم تھا، اس لیے قریش نے ان کے کعبے میں داخلے پر پابندی لگا دی کہ وہ بیت اللہ میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

"بیت" کے معنی خانہ یعنی گھر کے ہیں لیکن مکہ میں اس سے مراد خدا کا گھر یعنی کعبہ ہے۔ محمد ﷺ نے ان کی پابندی کے جواب میں فرمایا کہ کعبہ تو خدا کا گھر ہے اور خدا کے گھر جانے کے لیے مجھے تمھاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دن آپ ﷺ خانہ کعبہ میں دوزانو بیٹھے حمد و ثنا میں مشغول تھے کہ ابوجہل جو کہ قبیلہ قریش میں سے تھا، اپنے خاندان کے کچھ دوسرے افراد کے ساتھ ایک اونٹ کی اوجھڑی اُٹھائے ہوئے آیا۔ اوجھڑی خون اور گندگی سے پُر تھی۔ عربوں میں مجرموں کو پھانسی دینے کے کئی ایک طریقے مروّج تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ خون اور گندگی سے پُر اونٹ کی اوجھڑی مجرم کے سر پر اس طرح رکھتے تھے کہ اس کا سر اور چہرہ اوجھڑی کے اندر چلا جاتا۔ جب اوجھڑی تھیلے کی طرح گردن تک چڑھ جاتی تو اسے نیچے سے باندھ دیتے تھے۔ نتیجتاً ناک اور منہ اوجھڑی کے اندر بند ہونے پر آدمی سانس گھٹنے سے مر جاتا۔ اس روز ابوجہل اور اس کے ساتھی آپ ﷺ کو بھی اسی طریقے سے قتل کرنا چاہتے تھے۔

ابوجہل اور اس کے ساتھی جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو محمد ﷺ کو خبر نہ ہوئی اس لیے کہ وہ سب آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے تاکہ ان کے پاؤں کی آواز سنی نہ جا سکے۔

ابوجہل نے بے خبری میں اوجھڑی آپ ﷺ کے سر پر اس طرح رکھی کہ آپ ﷺ کا سر اور چہرہ اس کے اندر چلے گئے اور وہ ایک تھیلے کی طرح آپ کے سر اور چہرہ کے اردگرد چڑھا دی گئی۔ پھر ابوجہل نے اوجھڑی کا منہ بوری کی طرح آپ ﷺ کی گردن کے اردگرد باندھ دیا۔ یہ عمل اس نے بڑی سرعت سے انجام دیا۔ محمد ﷺ نے جب محسوس کیا کہ اوجھڑی ان کے سر پر ڈال کر باندھ دی گئی ہے تو آپ ﷺ نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن خود کو نجات نہ دلا سکے۔

اس وقت جو لوگ خانہ کعبہ میں موجود تھے، سمجھ گئے کہ اب محمد ﷺ تھوڑی دیر کے مہمان ہیں اور ان کی رہائی کی کوشش اور ان کا تڑپنا دیکھتے رہے۔

محمد ﷺ کا تڑپنا ان سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس تھیلا نما اوجھڑی کو آپ ﷺ کی گردن سے اُتار دیں، مگر ابوجہل وہیں کھڑا تھا اور وہ اس سے خوف کھاتے تھے کہ اگر محمد ﷺ کو نجات دلائی تو ابوجہل دشمن ہو جائے گا، لہٰذا آپ ﷺ کی رہائی کے لیے کسی نے کوئی اقدام نہ کیا۔

ایک عورت جو کہ قبیلہ قریش سے تھی، یہ سب نہ دیکھ سکی اور دوڑتی ہوئی محمد ﷺ کے گھر گئی اور آپ ﷺ کی بیٹی فاطمہ سے کہا جلدی خانہ کعبہ میں اپنے باپ کے پاس پہنچو اور اسے رہائی دلواؤ۔ اگر دیر کی تو انھیں زندہ نہ پاؤ گی۔ فاطمہ روتی ہوئی خانہ کعبہ پہنچیں۔

ابوجہل اور دوسرے قریشی افراد نے جب فاطمہؓ کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے اور انھوں نے اوجھڑی کھول کر گردن سے اُتاری۔ آپ ﷺ کے چہرے پر موجود گندگی کو اپنے کُرتے کے دامن سے صاف کیا تو آپ سانس لے سکے۔

آپ ﷺ تقریباً ایک گھنٹہ بے حس و حرکت پڑے رہے، پھر فاطمہؓ آپ ﷺ کو بازوؤں کا سہارا دے کر آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دیں۔ گھر پہنچ کر رقیہ نے آپ ﷺ کا سر دھلایا۔ کپڑے بدلوائے اور خون آلود کپڑوں کو دھو کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈال دیا۔

دوسرے روز حسبِ معمول بغیر کسی خوف کے آپؐ خانہ کعبہ تشریف لے گئے اور حمدِ باری تعالیٰ میں مشغول ہو گئے۔ محمد ﷺ ایک عرب تھے، باارادہ، بااستقامت اور پُر از یقین۔ یہ ممکن ہی

نہ تھا کہ دشمنوں کی تہدید آپ ﷺ کو اپنی راہ سے ہٹا دے۔ لیکن مخالفین بھی بدوی عرب تھے، اپنے عقیدے پر محکم۔ دوسرے روز جب انھوں نے محمد ﷺ کو پھر خانہ کعبہ میں موجود پایا تو دوبارہ آپ ﷺ کے قتل کا قصد کیا۔

اس دن ایک مرد جس کا نام عقبہ تھا، ہاتھ میں ایک چادر (ردا) لیے ہوئے اس طرح ننگے پاؤں خانہ کعبہ میں داخل ہوا (ایک تو وہ ننگے پاؤں تھا، دوسرے وہ قدم پھونک پھونک کر اُٹھا رہا تھا) کہ محمد ﷺ متوجہ نہ ہونے پائیں۔

محمد ﷺ حمد باری تعالیٰ میں کچھ اس طرح مشغول تھے کہ اطراف سے بالکل غافل تھے، حتیٰ کہ عقبہ کے نزدیک آنے کی آواز بھی نہ سن سکے۔

جب آپ ﷺ سجدے میں تھے تو عقبہ نے آپ ﷺ کے سر پر چادر ڈال کر آپ کو مکوں سے مارنا شروع کر دیا۔ محمد ﷺ کو ضربات شدید آئیں۔ آپ ﷺ کے ناک اور منہ خون آلود ہو گئے۔ عقبہ کی کوشش تھی کہ محمد ﷺ کو مکوں کی ضربوں سے بے حال کر دے اور جب آپ ﷺ سجدے سے سر اُٹھائیں تو آپ ﷺ کا گلا دبا دے۔

لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور محمد ﷺ خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے اور دوسری مرتبہ خون آلود چہرہ لیے آپ گھر آئے مگر زبان پر شکوہ تھا نہ شکایت۔

نیز آپ ﷺ خود فرمایا کرتے تھے کہ انسان اس وقت رنجور ہوتا ہے جب اسے معلوم ہی نہ ہو کہ یہ سب اس کے ساتھ کیوں بیت رہی ہے۔ لیکن جب انسان کو معلوم ہو کہ یہ سب تکلیفات، مشکلات کس لیے برداشت کر رہا ہے تو پھر وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔



عربوں کی عادات و روایات

جاہلیت کے دور یعنی قبل از ظہور اسلام کی رسوم و آداب کا ایک حصہ اسلام کے بعد بھی عربستان میں باقی ہے۔ ابھی تک کئی ایک رسوم مثلاً مہمان نوازی (صرف بیابانوں میں، شہروں میں نہیں) باقی ہیں۔ بدوی عرب کا قانون اساسی ایک ہی کلمے سے تشکیل پاتا تھا اور وہ کلمہ تھا "مروّت"۔

مروّت جامع معنی کا حامل ہے لیکن عرب اس سے صرف تین مفہوم لیتے تھے:

اوّل: مہمان نوازی۔

دوم: مظلوم کو پناہ دینا۔

سوم: اپنے قبیلہ کے قوانین کا احترام و رعایت۔

بدوی عرب کو مروّت کی ان معنوی مشکلات کو دوسروں کی نسبت زیادہ سامنا رہتا تھا۔ اپنی ذات میں اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ دلیر ہو۔ جنگ میں پسپائی اختیار نہ کرے۔ دشمن کو پیٹھ نہ دکھائے اور اس حد تک ثابت قدم ہو کہ یا تو قتل ہو جائے یا فتح حاصل کرے۔

رحم کا مفہوم جو دوسری قوموں میں لیا جاتا ہے وہ عربوں میں نہیں۔ اسی پیرائے میں جب کوئی چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے اور اس پر کسی شخص کا دل نہیں دکھتا تھا۔

بدوی عربوں کے قانون اساسی میں "مروّت" رحم نا آشنا تھی۔ لیکن کسی مظلوم کو پناہ دینا عربوں کے قانونِ اساسی کا ایک رکن تھا اور دوسرا رکن قبیلے کے قانون کا احترام کرنا تھا۔

وہ لوگ جو خانہ کعبہ میں موجود تھے اور محمد ﷺ کے تڑپنے کا منظر دیکھ رہے تھے، آپ کو مظلوم نہیں سمجھتے تھے اور ان میں سے کچھ شاید آپ کو واقعی واجب القتل سمجھتے تھے، اس لیے کہ آپ ﷺ بدوی عربوں کے قانون اساسی کے ایک رکن کی علانیہ مخالفت کر رہے تھے۔

بدوی عرب مہمان نواز تھا اور مظلوم کو پناہ بھی دیتا تھا۔ مگر اس فعل میں رحم کا دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے جوانمردی کی صفت سمجھا جاتا تھا۔

عربستان کے گرم بیابانوں میں ایک عرب روزی حاصل کرنے کے لیے اس قدر رنج و زحمت برداشت کرتا کہ اس کو اپنے قلب میں رحم کو جگہ دینے کے لیے فرصت ہی نہ ہوتی تھی۔

آج بھی سرزمین عرب کے ان مقامات پر جہاں تیل نے اُن لوگوں کی زندگی کو بدل نہیں دیا، یہی وضع دیکھنے میں آتی ہے۔

قوموں کی عادات و خصائل ان کے ملک کی آب و ہوا اور جغرافیائی وضع کے تابع ہوتی ہیں۔ ارنسٹ رنان ایک فرانسیسی دانش مند نے جو تحقیقات دورِ جاہلیت کے تمدن پر کی ہے، واقعتا توجہ طلب ہے۔ وہ جو ''مروّت'' عربوں میں دیکھتا ہے اُسے جزیرہ نمائے عرب کے جغرافیائی حالات کا نتیجہ گردانتا ہے۔ عرب کے جلتے ریگستانوں میں جب کوئی بھوکا پیاسا مسافر کسی بدوی عرب کے خیمے میں پہنچتا ہے، اگر وہ اس کی مہمان نوازی نہ کرے تو وہ مسافر بھوک اور پیاس سے چل بسے گا۔

اسی طرح اگر ایک مسافر راہزنوں سے بچ کر ایک بدوی عرب کے خیمے میں پہنچے اور صاحب خیمہ اس کی حمایت اور مدد پر آمادہ نہ ہو تو اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔ ''طرد'' کیے جانے کی بھی پہلے تشریح کی جا چکی ہے۔ اس پر مزید کہنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ جب کسی عرب کو اس کا قبیلہ ''طرد'' کرتا تو یہ ایسے ہوتا جیسے اس کے فنا کا حکم صادر کر دیا گیا ہو۔

مجھے ارنسٹ رنان کے نظریے سے خصوصاً ایک نکتے پر اختلاف ہے یعنی جوانمردی اور سخاوت کا کوئی ربط آب و ہوا اور بیابانوں سے نہیں ہے۔ حالانکہ ان علاقوں میں جہاں حصول معاش مشکل ہے (مثلاً یورپ کا کوہستانی علاقہ) وہاں کے باشندے بہت زیادہ کنجوس ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو انتہا کر دیتے ہیں کہ بن بلائے اور ناآشنا مہمان کو پانی تک نہیں پوچھتے۔

اس کے برعکس عرب کے ریگ زاروں میں جہاں حصول معاش مشکل تر تھا، بعض اوقات اپنا ایک ہی اونٹ جو کہ تنہا وسیلۂ معاش ہوتا ذبح کر دیتے اور گوشت مہمانوں کو کھلا دیتے تاکہ وہ بھوکے نہ رہیں۔

ارنسٹ رنان اپنی کتاب ''بدوی تمدن'' میں لکھتا ہے کہ دنیا کی تمدنی تاریخ میں بدوی عربوں کی وضع زندگی ایک قابل تحسین مثال کی حیثیت رکھتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر تمدن کا وجود اس دور میں ناپید تھا۔ جوانمردی اور سخاوت (از راہِ مہمان نوازی) میں وہ بڑے ثابت قدم اور اونچے مقام کے مالک تھے لیکن اس کی وجہ رحم اور خونریزی سے نفرت نہیں تھی۔ ایک بدوی عرب کی نظر میں گردن مارنا یا ہاتھ کاٹنا ایک عادی فعل تھا لیکن مظلوم کی دادرسی اور حمایت وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

جب کبھی کوئی مظلوم کسی بدوی عرب کے خیمے میں پناہ گزین ہوتا تو وہ عرب تلوار ہاتھ میں لے لیتا اور اس مظلوم کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتا۔ جب تک کہ صاحب خیمہ قتل نہ ہو جائے اُس مظلوم کو خیمہ سے نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

قبائل قریش کی نگاہ میں محمد ﷺ مظلوم نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دو مرتبہ اقدامِ قتل کے باوجود کوئی بھی فرد آپ ﷺ کی حمایت میں آگے نہ بڑھا۔

آپ ضرور سوچیں گے کیا وہ لوگ دیکھ نہیں رہے تھے کہ یہ محمد ﷺ کو قتل کرنے کی سازش ہے اور محمد ﷺ مظلوم ہیں۔

ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن عربوں کی نگاہ میں مظلوم وہ ہوتا تھا جو اپنے قبیلے سے نہ ہو، ایک بیگانہ ہو اور کسی دوسرے قبیلے کے پاس پناہ گزین ہو یا پناہ مانگے۔ اگر کسی دوسرے قبیلے کا کوئی مرد مکہ میں وارد ہوتا اور قریش سے پناہ مانگتا اور کہتا کہ مجھ پر ظلم ہو رہا ہے تو وہ اس کی حمایت میں جان دے دیتے۔ مگر محمد ﷺ کوئی بیگانہ یا پناہ گزین نہیں تھے۔ وہ لوگ جن کے سامنے دو مرتبہ اقدامِ قتل کیا گیا اور وہ محمد ﷺ کی حمایت نہیں کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس اقدامِ قتل کو قانونی اور جائز تصور کرتے تھے۔ بدوی عربوں کی نگاہ میں مظلوم وہ ہوتا تھا جس پر مالک نے ظلم کیا ہو۔ اور اگر کوئی فرد خود اپنے ہی قبیلے کے لیے باعث آزار ہوتا تو خود وہ قبیلہ اسے مظلوم شمار نہیں کرتا تھا۔ اُصول ''مروّت'' کے مطابق ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی قبیلہ خود اپنے افراد پر ستم نہیں کرتا۔ اور جب ایک قبیلہ اپنے افراد میں سے کسی کو آزار پہنچاتا تو وہ ایک قانونی اقدام تصور ہوتا تھا (نیز قبیلے میں ہر فرد قاضی ہوتا تھا)۔

بدوی عربوں کے اس عقیدے پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ آج بھی فرانس میں یہی عقیدہ رواج پذیر ہے۔ آج بھی ایک فرانسیسی عدالت کا جج سزا سناتا ہے کہ اس آدمی کا سرتن سے جدا کر دیا جائے تو کوئی شخص قاضی کو ظالم نہیں گردانتا اور نہ کوئی یہ کہے گا کہ جج کا حکم ایک تباہ کارانہ قدم ہے۔

فرانس کے فوج داری قانون کی شق ۳۲۷ میں یہ کلمات لکھے ہوئے ہیں:

کسی انسان کا قتل جو کہ زخم لگا کر یا ضرب لگا کر قانون کے مطابق کیا گیا ہو، یہ قانونی امر کے تحت انجام کو پہنچا سمجھا جائے گا اور یہ عمل جرم تصور نہیں ہوگا۔

آج بھی مملکتِ فرانس میں جج جب حکم کرتا ہے کہ محکوم کا سر گردن سے جدا کر دیا جائے اور جب جلاد گلوٹین کے ذریعے سے اس کا سر گردن سے جدا کرتا ہے تو کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ قاضی اور جلاد دونوں مجرم اور تباہ کار ہیں اور تماشا کنندگان میں سے کوئی بھی جلاد کو مجرم نہیں گردانتا۔ بدوی عربوں میں قانون اور عدالت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف قبیلہ ہوتا تھا اور اگر ایک قبیلہ اپنے کسی فرد کو نابود کرنے کی سزا دیتا تو اس قبیلے کو یہ حق حاصل ہوتا تھا۔

چونکہ قبائل قریش نے فیصلہ کر لیا تھا کہ محمد ﷺ کو قتل کر دیا جائے، لہٰذا قریش کا ہر فرد آپ کو واجب القتل سمجھتا تھا۔ فقط چار افراد کو محمد ﷺ پر رحم آتا تھا اور وہی مسلمانانِ اول تھے، یعنی حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؑ، حضرت زیدؓ اور حضرت ابوبکرؓ۔ اور اگر حضرت ابوبکرؓ کی نوزائیدہ لڑکی کو بھی شمار کیا جائے تو پانچ افراد۔ ان پانچ افراد میں یہ سکت و ہمت نہ تھی کہ اقدامِ قتل کرنے والوں کی مخالفت کریں یا انھیں روک سکیں۔

بعثت کے چوتھے سال ایمان لانے والوں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو پہلے ہی خداوند کی جستجو میں تھے۔ اس دور میں کچھ ایسے لوگ تھے (اور آج بھی ہیں) جو زندگی کی بقا کے لیے ہوا، پانی اور دھوپ کے علاوہ تعلق باللہ کو بھی لازم سمجھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو مکّہ کے عربی معاشرے میں غلام، سیاہ فام اور خارجی لوگ تھے، جنھیں ان کے قبائل نے مطرود کر دیا تھا یعنی تمام ایسے لوگ جو الناس کی تعریف میں آتے ہیں۔

آج بھی عجمی لوگ لفظ الناس کا ترجمہ "عوام" ہی کرتے ہیں لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

وہ جماعت یا افراد جن کے پاس اپنے دفاع کے وسائل نہ ہوں" اور ایسے افراد یعنی الناس کی تعداد آج بھی اور ہر دور میں زیادہ رہی ہے بہ نسبت ان کے جو اپنے دفاع پر قادر ہوں۔ غلام، سیاہ فام، خارجی، قبیلوں سے نکال باہر کیے ہوئے اور بے بضاعت لوگوں کا طبقہ، یہی ہے "الناس"۔ یہ طبقہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب انھیں بھی دوسروں کے برابر (یعنی مساوی) شمار کیا جائے گا۔

محمد ﷺ جب مبعوث ہوئے تو فرمایا "تمام افراد ملتِ واحدہ ہیں اور وہ علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں"۔ مزید فرمایا کہ "تمام انسانوں کو خدا نے ایک ہی مادہ یعنی گل یا گارے سے بنایا ہے" یہ ذکر سورۂ رحمٰن کی چودھویں آیت میں ہے ﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ یعنی "انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا" (صلصال، وہ مٹی جو گوندھی ہوئی اور ظروف سازی کے لیے تیار ہو)۔ غلاموں اور سیاہ فاموں نے پہلی بار یہ سنا کہ وہ بھی اسی مادے سے پیدا کیے گئے ہیں جس مادے سے اشراف اور توانگر لوگ، اور ان کے مابین کوئی تفاوت نہیں ہے۔ دونوں طبقے یعنی اشراف و توانگر اور غریب و بے بضاعت سب گارے سے پیدا ہوئے ہیں اور رنگ اور چہرے میں فرق فقط ایک دوسرے کی پہچان کے لیے ہے۔

حضرت زیدؓ کے بعد جو خود آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، پہلا غلام جو مسلمان ہوا، وہ سیاہ فام غلام حضرت بلالؓ تھے۔

عرب میں تین چیزیں بدبختی کی نشانی سمجھی جاتی تھیں: ایک اجنبی ہونا، دوسرے غلام ہونا، تیسرے سیاہ رنگت کا ہونا۔ حضرت بلالؓ میں یہ تینوں چیزیں جمع تھیں۔

حضرت بلالؓ مکّہ کے ایک امیر شخص (امیہ بن خلف جمحی) کے غلام تھے۔ جب ان کے مالک کو معلوم ہوا کہ بلالؓ مسلمان ہوگئے ہیں تو انھیں مکّہ سے خارج کر دیا۔ بیرونِ شہر ان کا لباس اتروا دیا اور زیرِ آفتاب گرم زمین پر لٹا کر ان کے ہاتھوں پاؤں میں میخیں گاڑ دیں اور کہا: اب تم اسلام کو چھوڑ دو وگرنہ سسک سسک کر یہیں ختم ہو جاؤ گے۔

بلالؓ یہ جانتے ہوئے کہ ان کا مالک اپنی بات پوری کر کے رہے گا، مجھے نہیں چھوڑے گا تاوقتیکہ میں ہلاک نہ ہو جاؤں، خود کو ہلاکت کے لیے آمادہ کر لیا۔

حضرت بلالؓ پر ان مظالم کا علم جب حضرت عبداللہؓ بن عثمان جو کہ ابوبکرؓ کے نام سے مشہور تھے کو ہوا تو انھوں نے حضرت بلالؓ کو نجات دلانے کا ارادہ کیا، ان کے مالک کے پاس گئے اور انھیں خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔

بلالؓ کے مالک نے جب یہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ اس کے سیاہ فام غلام کو اچھے داموں خریدنے پر تیار ہیں تو اس نے بلالؓ کو ابوبکرؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں خریدنے کے بعد آزاد کر دیا۔

حضرت محمد ﷺ نے بلالؓ کو مؤذن کے فرائض تفویض کیے۔ مؤذن، وہ شخص جو دوسروں کے کانوں تک پہنچائے۔ اسلام میں اصطلاحاً مؤذن اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بلند آواز میں دوسروں کو عبادت کی دعوت دے۔

الناس یعنی محروم لوگوں کے طبقے نے جب یہ دیکھا کہ ایک سیاہ فام کی اسلام نے یوں پذیرائی کی ہے تو ان میں جرأت پیدا ہوئی۔ فوراً بعد عمرؓ کی دونوں کنیزیں جن کے نام لبینہ اور زنیرہ تھے، اسلام لے آئیں۔

عمرؓ، بلالؓ کے مالک کی حد تک پتھر دل نہ تھے کہ اپنی کنیزوں کے ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑ دیتے، لہٰذا انھوں نے دونوں کو کوڑے مارنے شروع کر دیے اور کہا: "تمھیں اتنے کوڑے لگاؤں گا کہ تم یا تو مر جاؤ گی یا پھر دینِ محمد ﷺ کو ترک کر دو گی"۔ لیکن دونوں عورتوں نے زخموں سے چور چور ہونے کے بعد بھی دینِ محمد ﷺ کو ترک نہ کیا۔

ایک دفعہ پھر حضرت ابوبکرؓ ان دونوں عورتوں کی مدد کو پہنچے اور عمرؓ سے درخواست کی کہ ان دونوں کو میرے ہاتھ بیچ دے۔ عمرؓ نے دونوں کو ابوبکرؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے خریدنے کے بعد انھیں آزاد کر دیا۔

اس طرح مسلمانوں کی تعداد سات تک پہنچ گئی جن میں سے تین عورتیں تھیں۔ ان کے

بعد چوتھی عورت جو ایمان لائی وہ صحرا کی رہنے والی تھی اور اس کا نام تھا "غزیہ"۔ یہ چوتھی عورت "غزیہ" کنیز نہیں تھی۔ صحرا سے مکّہ آئی اور مسلمان ہوئی اور علانیہ اسلام کی دعوت دینے لگی۔ بدوی عورتیں مردوں کی طرح دلیر تھیں، خوف وبیم کو دل میں جگہ نہیں دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے اس عورت کو قریش سے کوئی خوف نہیں تھا۔ قریش نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورت تبلیغ اسلام میں حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہے تو اسے اغوا کر کے ایک اونٹ پر بٹھا کر رسیوں سے باندھ دیا اور ایک کاروان کے سپرد کر دیا جو مکّہ سے باہر جا رہا تھا اور کاروان والوں سے کہا کہ اس عورت کو کھانا پانی کچھ نہ دیں تاکہ بھوک اور پیاس سے مر جائے اور جب یہ مر جائے تو اس کی لاش کو صحرا ہی میں پھینک دیں تاکہ اسے درندے کھا جائیں۔

"غزیہ" اپنی روداد (حسبِ روایت) یوں بیان کرتی ہے: تین شبانہ روز کی پیاس اور خستگی نے مجھے بے حال کر دیا۔ چوتھی رات مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ہونٹ ٹھنڈے پانی سے تر ہو گئے ہیں۔ میں نے پانی پینا شروع کر دیا اور پھر اتنا پیا کہ میری پیاس ختم ہو گئی۔ صبح قافلے والے بجائے اس کے کہ مجھے مردہ پاتے، جب صحیح حالت میں تروتازہ پایا تو بہت حیران ہوئے۔ میں نے تمام واقعہ اپنے مسلمان ہونے اور گزشتہ شب پانی پینے کا انھیں سنایا تو وہ اپنے رویے پر پشیمان ہوئے اور میرے ہاتھ پاؤں کھول کر مجھے اونٹ پر آزاد بٹھا دیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ قافلے والے مسلمان ہو گئے۔ بہر حال وضاحت طلب نکتہ یہ ہے کہ قریش نے "غزیہ" کے اغوا کا پروگرام بنایا مگر حضرت ابوبکرؓ کو ان کے ارادے کی بروقت اطلاع نہ ہو سکی ورنہ وہ مانع ہوتے۔

ابوبکرؓ نے اپنا تمام مال و متاع اسلام کی راہ میں خرچ کر ڈالا اور بالکل تہی دست ہو گئے لیکن وہ اپنی اس حالت پر ناخوش نہیں تھے، بلکہ جب کبھی کوئی غلام یا کنیز مسلمان ہوتی، مالک ان پر ظلم کرتا اور آزار پہنچاتا تو حضرت ابوبکرؓ انھیں ہر قیمت پر خرید کر آزاد کر دیتے۔

❁ ❁❁ ❁

اسلام کی راہ میں پہلی شہید عورت

ابوجہل کی ایک کنیز تھی جس کا نام تھا "سمیہؓ"۔

سمیہؓ اسم تصغیر ہے بمعنی مشہور و معروف۔ سمیہؓ ابوجہل کی کنیز تھیں اور اس کے علاوہ مکہ میں دایہ کی حیثیت سے کام بھی کرتی تھیں۔ حاملہ عورتوں کے گھر جا کر وضع حمل میں مدد کرتی تھیں، یعنی ان کی حیثیت وہ نہ تھی جو آج کل دایہ کی ہے یعنی تھوڑی بلند تر۔ وہ حاملہ عورتوں کو مشورہ دیتیں اور ان کی راہنمائی بھی کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے ابوجہل کے خاندان میں ان کا ایک کنیز سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا حتیٰ کہ وہ مسلمان ہوگئیں۔

جیسے ہی ابوجہل کو معلوم ہوا کہ سمیہؓ مسلمان ہوگئی ہیں، اس نے سمیہؓ سے کہا: اس دین کو ترک کر دو۔

سمیہؓ نے جواب دیا: میں دین محمد ﷺ کو ترک نہیں کروں گی۔

ابوجہل نے انھیں مارنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ وہ بے حال ہوگئیں۔

اس موقع پر ابوبکرؓ کو خبر ہوئی۔ وہ ابوجہل کے گھر آئے اور دیکھا کہ سمیہؓ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔ ابوجہل سے کہا: اس کنیز کو میرے ہاتھ فروخت کر دو مگر ابوجہل نے کہا: نہیں بیچوں گا۔ (عَمرو بن ہشام، ابوالحکم یعنی "حکمتوں والا" کہلاتا تھا، نبی ﷺ نے اسے "ابوجہل" کہہ دیا اور پھر وہ اسی نام سے مشہور ہوا)۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ابوالحکم! اگر تم آمادہ ہو تو میں تمھیں ایک صد دینار دوں گا۔

ابوجہل نے کہا: نہیں بیچوں گا۔

حضرت ابوبکرؓ نے قیمت بڑھا کر ۱۵۰ دینار کر دی مگر ابوجہل فروخت پر آمادہ نہ ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ ہر مرتبہ قیمت بڑھاتے مگر ابوجہل مسلسل انکار کرتا چلا جاتا۔

حضرت ابوبکرؓ جنھوں نے اپنی تمام دولت اسلام کی راہ میں خرچ کر ڈالی تھی، جب دیکھا کہ ابوجہل کسی طور آمادہ نہیں ہو رہا تو کہا کہ اگر تو سمیہؓ کو میرے ہاتھ بیچ دے تو میں تمھیں "ابل کافیہ" دوں گا۔

ابل قافیہ بدوی عربوں کی مخصوص اصطلاح میں اس اونٹ کو کہتے تھے جو ایک آدمی کے خون کے عوض اس کے خاندان کو دیا جاتا تھا، یعنی ابل کافیہ ایک خون بہا تھا جو مقتول کے وارثوں کو دیا جاتا تھا۔

ابوجہل، محمد ﷺ اور اسلام سے اس قدر بغض رکھتا تھا کہ اتنی بڑی پیشکش کے باوجود وہ کنیز کو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ بیچنے پر آمادہ نہ ہوا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ اس وقت تک چھ غلاموں کو خرید کر آزاد کر چکے تھے جن میں دو مرد اور چار عورتیں شامل تھیں۔ مگر اس روز وہ سمیہؓ کو آزاد نہ کرا سکے۔ جب قریش کی عورتوں کو معلوم ہوا کہ ابوجہل ہر روز گھر میں سمیہؓ کو کوڑے مارا کرتا ہے اور سمیہؓ باوجود اس قدر تشدد کے دین محمد ﷺ سے منحرف نہیں ہو رہی تو ان سب نے ابوجہل سے درخواست کی کہ اسے کوڑے نہ مارا کرے۔ یہ سب وہ عورتیں تھیں جن کی وہ وضع حمل میں مدد کر چکی تھی۔

ابوجہل نے ان کی درخواست بھی رد کر دی۔ ابوجہل نے اس کنیز پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ سرتاپا زخمی ہوگئی اور ہلنے جلنے کی سکت اس میں نہ رہی۔ لیکن وہ دین محمد ﷺ سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ابوجہل جب اس سے ناامید ہوگیا تو اس نے سمیہؓ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا اور ایک دن اسے خانہ کعبہ کے سامنے لے آیا جہاں تمام اہل مکہ جمع ہو چکے تھے۔ اتمامِ حجت کے طور پر اس سے آخری بار پوچھا: کیا تم دین محمد ﷺ چھوڑنے پر آمادہ ہو؟ سمیہؓ نے کہا: میں دین محمد ﷺ کو ترک نہیں کر سکتی۔

جواب سن کر ابوجہل نے کہا: اب میں تمھیں قتل کر سکتا ہوں اور اہل مکہ کے رُوبرو اس طاقت سے نیزہ سمیہؓ کے سینے میں مارا کہ وہ سینے کے آر پار ہوگیا۔ اور سمیہؓ کو اسلام کی پہلی شہید ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

روایت ہے کہ جب محمد ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی کوششوں کے متعلق سنا جو آپؓ نے سمیہؓ کی آزادی کے لیے کی تھیں تو ان کے حق میں دعا فرمائی "حیا اللہ قبلک" یعنی خداوند تیرے روشن چہرے کی حفاظت فرمائے۔ دوسرے الفاظ میں خداوند تیرے چہرے کو ہمیشہ روشن رکھے۔

سمیہؓ کے قتل کے بعد قریش کے چار بڑوں (ابوسفیان، ابوجہل، ابولہب اور اس کی بیوی اُم جمیل) نے ایک اعلان کے ذریعے پابندی لگا دی کہ مکّہ کا کوئی شخص اپنے "بردوں" [غلاموں] کو ابوبکرؓ کے ہاتھ نہ بیچے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اسلام غربا و مساکین میں مقبول ہو چکا ہے اور ہر وہ "بردہ" جو مسلمان ہوگا ابوبکرؓ اسے خرید کر آزاد کر دے گا۔ لہٰذا، انھوں نے پابندی لگا دی تا کہ اسلام وسعت پذیر نہ ہو۔

لیکن ہوا ایسا کہ اس پابندی کے بعد کچھ اشخاص مسلمان ہوئے جو غلام نہیں بلکہ آزاد افراد تھے مثلاً حضرت عثمانؓ بن عفان جو حضرت عبدالمطلب کے نواسے تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص جو حضرت محمد ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے عم زاد تھے۔ طلحہؓ بن عبید اللہ، سعید بن زید بن عمرو کہ اشراف مکّہ کے جوانوں میں سے تھے اور ان کے والد حنیف تھے۔

مسلمانوں کی تعداد میں ان قدآور شخصیتوں کے اضافے سے قبائل قریش بہت غضب ناک ہوئے اور انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب محمد ﷺ کو زیادہ سے زیادہ ایذا دیں گے۔

ہم یہ تو بتا ہی چکے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے خانہ کعبہ جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ کچھ لوگ مستقل طور پر محمد ﷺ کی راہ میں بیٹھے رہتے۔ جب آپ گھر سے بقصدِ خانہ کعبہ یا کسی اور وجہ سے نکلتے تو وہ لوگ آپ ﷺ کو پتھر مارتے اور آپ ﷺ پر گندگی پھینکتے۔ ہر دفعہ جب محمد ﷺ گھر سے خانہ کعبہ جانے کے لیے نکلتے تو ان کی جان خطرے میں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود آپ ﷺ بے خطر خانہ کعبہ تشریف لے جاتے اور عبادت کرتے تھے۔

روایت کے مطابق خانہ کعبہ پہلا معبد ہے جس کو نوع بشر نے تعمیر کیا۔ بموجب روایت خانہ کعبہ کو آدمؑ نے بنایا اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تجدید کی۔

کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ حضرت محمد ﷺ خون آلود گھر میں واپس تشریف نہ لائے ہوں۔ قریش بڑی سنگ دلی اور شقاوت سے آپ ﷺ کو پتھر مارا کرتے تھے۔

قریش اس درجہ حضرت محمد ﷺ کے دشمن ہو چکے تھے کہ اس معاملے میں احترامِ خانہ کعبہ کو بھی بھول گئے تھے۔ سنت دیرینہ کے مطابق محیط خانہ کعبہ حرم تھا اور ان حدود میں کوئی شخص دوسرے سے جھگڑا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن قریش نے دونوں بار قتل کا اقدام خانہ کعبہ (حرم) کے اندر کیا اور پہلا جو مسلمان مرد شہید ہوا اسے بھی خانہ کعبہ کے اندر ہی شہید کیا گیا۔ اسلام کی راہ میں پہلے شہید کی روداد اس طرح ہے:

ایک دن قریش نے کچھ اس شدت سے آپ ﷺ کو پتھر مارے کہ جب آپ ﷺ گھر پہنچے تو اس قدر بے حال ہو چکے تھے کہ دوسرے دن درد کی شدت اور کسالت کی وجہ سے اپنی جگہ سے اُٹھ نہ سکے کہ خانہ کعبہ تشریف لے جائیں۔

اس دن عبادت کے لیے خانہ کعبہ میں جمع مسلمانوں کو جب علم ہوا کہ رسول اللہ آج تشریف نہیں لا سکیں گے تو انھوں نے اپنے طور پر ہی عبادت شروع کر دی۔ جب وہ سجدہ میں گئے تو قریش کے مردوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ چند مسلمان زخمی ہوئے اور حضرت حارثؓ جو حضرت خدیجہؓ کے پہلے دو خاوندوں میں سے ایک کے لڑکے تھے، شہید ہو گئے۔ حارثؓ پہلے مسلمان ہیں جو اسلام کی راہ میں شہید ہوئے اور وہ سجدے کی حالت میں خانہ کعبہ کے اندر قتل ہوئے۔ اس روز کے بعد قریش کے کچھ افراد ہمیشہ خانہ کعبہ کے باہر نگہبانی کرنے لگے تا کہ محمد ﷺ اور ان کے یاروں اور پیروکاروں کو خانہ کعبہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

ان حالات میں جب محمد ﷺ نے دیکھا کہ خانہ کعبہ جا کر عبادت کرنا ممکن نہیں رہا تو زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا انتخاب کیا جو بہ نسبت دوسری اراضی کے خاصا گہرا تھا۔ اب محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکار دن میں دو بار وہاں جمع ہوتے اور نماز باجماعت ادا کرتے۔

یہ نماز جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کی طرز ادائیگی اس طرح تھی کہ حضرت بلالؓ حبشی اذان کہتے اور جب نماز تمام ہوتی تو محمد ﷺ ان سب کے لیے قرآن کی آیات پڑھتے۔ اس

دور میں مکّہ کا شہر عبادت کے لیے آزاد نہ تھا۔ صرف اسی لیے مسلمان شہر سے باہر جمع ہوتے کہ نماز باجماعت ادا کرسکیں۔

ان ایام میں ابوسفیان آپ ﷺ سے بہت زیادہ دشمنی کا اظہار کیا کرتا تھا، ابوسفیان قریش سے علانیہ کہتا کہ محمد ﷺ کو نابود کردو تاکہ اس کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے امن مل جائے۔

ممکن ہے اس موقع پر کچھ لوگ سوال اٹھائیں کہ قریش کیوں محمد ﷺ کے اس قدر دشمن ہوگئے تھے جب کہ مکّہ از لحاظِ مذہبی ایک بین الاقوامی شہر شمار ہوتا تھا اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام مذاہب کے ماننے والے خانہ کعبہ میں اپنے الگ الگ حجرے رکھتے تھے اور ان حجروں میں اپنے علیحدہ علیحدہ بت رکھا کرتے تھے۔ کوئی شخص جو کوئی بھی مذہب رکھتا ہو، وہ آزاد تھا کہ خانہ کعبہ جاکر اپنے طریق پر پرستش کرے یعنی اپنے بت کے مقابل رکوع یا سجود کرے۔ پس قریش محمد ﷺ کے دشمن کیوں ہوئے؟ اور آپ ﷺ کا دین، مکّہ والوں کی مزاحمت کا باعث کیوں بنا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے ادیان کے پرستار مکّہ میں ہوتے یا سفر کرکے مکّہ جاتے تو خانہ کعبہ کے بتوں سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے اور ایک دوسرے کے بتوں کو برا نہیں کہتے تھے۔ گوناگوں مذاہب کے بت وہاں موجود تھے مگر ان سب کے پیروکار ایک دوسرے سے لاتعلق رہا کرتے تھے۔ لیکن محمد ﷺ نے جب اپنی رسالت کا اعلان کیا تو تبلیغ شروع کردی اور بت پرستی کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے اور فرمایا: تمام بتوں کو معدوم کردو اور بجز اللّٰہ کے کسی کی عبادت نہ کرو۔

مکّہ والوں کو اندیشہ تھا کہ اگر محمد ﷺ کے کہنے پر عمل کریں، بتوں کو خانہ کعبہ سے نکال دیں تو بت پرستی کی رسم ختم ہوجائے گی اور یہ ایک بہت بڑا نقصان ہوگا، کیوں کہ مکّہ کی بین الاقوامی تجارت جو کہ ہر سال چار ماہ کے لیے اپنے عروج پر ہوتی تھی متروک ہوجائے گی۔

مکّہ میں زراعت نہیں تھی اور مکّہ والوں کا دو ذرائع معاش پر انحصار تھا: ایک تجارت، دوسرے جانور پالنا خصوصاً اونٹ۔ دورِ جاہلیت میں یعنی قبل از اسلام مکّہ جزیرہ نمائے عرب کا

ایک بہت بڑا بت خانہ تھا اور جیسا کہ آج بھی اسلام کے ہر فرقے کا مرکز ہے، اس وقت ہر مذہب کا مرکز تھا۔

مکّہ کے ایک مذہبی مرکز ہونے کی وجہ سے ماہ ہائے حرام کے علاوہ بھی کاروان مکّہ کی طرف سفر کرتے تھے تاکہ اپنے بتوں کی زیارت کریں اور اگر بتوں کو خانہ کعبہ سے نکال دیا جاتا اور کوئی بھی زیارت کے مقصد کے لیے کعبہ نہ آتا تو سالانہ تجارتی میلے کا چار ماہ کے لیے منعقد ہونا محال ہوجاتا۔

انھی حالات کی بنا پر مکّہ والے یہ تصور کرتے تھے کہ دینِ محمد ﷺ ہماری اقتصادیات کو تباہ کردے گا اور انھیں یقین تھا کہ اگر یہ دین پیش رفت کرے گا تو ہم اقتصادی لحاظ سے فنا ہوجائیں گے۔ دوسری وجہ دشمنی کی یہ تھی کہ جب محمد ﷺ بتوں کی تکذیب فرماتے تو مکّہ والے بالواسطہ اسے اپنے آباؤاجداد کی تکذیب سمجھتے تھے۔ اپنی زندگی میں وہ اپنے آباؤاجداد کے عقیدہ کو تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے، نیز اجدادِ قریش سب بت پرست تھے۔ جب محمد ﷺ نے فرمایا: ''بت پرستی ترک کرنی ہوگی'' تو مکّہ والے اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ ہمارے آباؤاجداد کا عقیدہ باطل کیا گیا ہے۔ اعراب بادیہ اپنے آباؤاجداد کو بہت محترم رکھتے تھے۔ آباؤاجداد میں سے زیادہ تر وہی تھے جو بت پوجا کرتے تھے اور جزیرہ نمائے عرب کا مخصوص مذہبی عقیدہ ان کے لیے بڑا محترم تھا۔

ایک حقیقت جو تمام ملکوں اور تمام ادوار میں دیکھی گئی ہے، حتیٰ کہ آج بھی اس کا مظاہرہ عام ہے وہ یہ کہ ''عام لوگ باطنی عقیدے کی نسبت مذہب کی ظاہری رسومات سے زیادہ وابستگی رکھتے ہیں''۔

کوئی آدمی یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا کہ ایک مومن کا عقیدہ کیا ہے اور کیا وہ اپنے دین یا مذہب کا جس کی پیروی کا وہ دعوے دار ہے اتنا ہی عامل اور معتقد ہے۔ فقط مذہب سے وابستہ ہونا، ظاہری رسومات پر عمل کرنا اور زبانی کلامی مذہب کا احترام کرنا کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مذہب کی ظاہری رسمیں اجداد سے میراث میں ملتی ہیں اور ہر نسل اپنا یہ اوّلین فرض سمجھ لیتی ہے کہ ان ظاہری رسموں کو کسی تغیر کے بغیر دوسری نسل کو منتقل کرے۔

عرب میں ان ظاہری رسومات (مذہبی) کا جو کہ اجداد سے اخلاف کو منتقل ہوئی تھیں، بڑا احترام تھا اور وہ ایک قوت تھیں۔ کسی شخص کو جرأت نہیں تھی کہ ان کو ختم کر سکے اور یہ کہے کہ آباؤاجداد غلطی پر اور باطل پرست تھے لیکن محمد ﷺ یہ بات کہتے تھے۔ اسی وجہ سے مکّہ کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے۔

قریش کے افراد کو جب علم ہوا کہ محمد ﷺ اور ان کے پیروکار کہاں عبادت کرتے ہیں تو اس میں بھی آڑے آئے کہ یہ بیابان میں جمع ہوں اور عبادت کریں۔ سعدؓ بن ابی وقاص جو کہ مسلمان ہو چکے تھے، ان حالات کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''ہم مسلمانوں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ کعبہ میں اجتماع کر سکیں، اس لیے ہم کسی ایک مسلمان کے گھر جمع ہو کر عبادت کرتے لیکن یہ بھی قریش کے مسلسل تعاقب کی وجہ سے ممکن نہ رہا۔ کیوں کہ ادھر ہم کسی مسلمان کے گھر میں جمع ہوئے، اُدھر محلّہ والوں نے دیکھا اور ہم پر حملہ آور ہو گئے کہ ہمیں اسی جگہ قتل کر دیں۔ یہی باعث ہوا کہ ہم فوری پروگرام کے تحت مکّہ سے باہر چلے جاتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ ہم کہاں اکٹھے ہوئے ہیں اور عبادت کر رہے ہیں۔ عبادت کے بعد دوسرے اجتماع کے لیے جگہ کا انتخاب ہوتا تھا۔ قریش اس طرح ہمارا پیچھا کرتے کہ ہمارے لیے ایک جگہ بیک وقت اکٹھے ہونا ممکن نہ ہوتا تھا۔

ایک دن ہم درہ ابودوب میں جمع ہوئے۔ بدن کی طہارت کے بعد عبادت شروع کی لیکن عبادت کے دوران ہی قریش کے کچھ سرکردہ افراد (ابوسفیان، اخنس بن شریق وغیرہ) وہاں آ گئے اور ہم سے تعرض کرنے لگے حتیٰ کہ ہم دفاع پر مجبور ہو گئے۔ میں نے اپنی ذات کے دفاع کے لیے ایک اونٹ کی بڑی سی ہڈی جو وہاں پڑی ہوئی تھی ہاتھ میں لی اور پوری قوت سے ان میں سے ایک کے سر میں ضرب لگائی۔ اس شخص کے سر سے خون بہنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ شخص بھاگ نکلا۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے اسلام کی راہ میں ایک کافر کا

خون زمین پر گرایا۔ اس دور میں صرف ایک شخصیت مسلمانوں میں تھی جو خوفِ مرگ کے بغیر اپنے گھر سے باہر آتے تھے اور وہ خود پیغمبر ﷺ تھے۔ دوسرے افراد گھروں سے باہر نہیں آیا کرتے تھے مگر قبل از طلوع و بعد از غروب آتے تھے جب لوگ خوابیدہ ہوتے تھے اور وہ بھی چھپ چھپا کر کہ لوگ انھیں دیکھ نہ لیں یا ان لوگوں کی نگاہ ان پر نہ پڑے جو جانتے تھے کہ یہ مسلمان ہو چکے ہیں''۔

بہر حال مسلمانوں کی تعداد بڑی آہستگی سے بڑھ رہی تھی اور زیادہ تر اشخاص دینِ اسلام کو قبول کرنے والے غلام، کاریگر یا وہ لوگ تھے جو آج کی اصطلاح میں اشراف وخواص نہیں ہوتے یعنی تیسرا طبقہ اور ان کا سابقہ کردار بھی اچھا نہ ہوتا تھا لیکن محمد ﷺ ان کے سابقہ کردار کو مکّہ کے اشراف وخواص کی نگاہ سے نہیں پرکھتے تھے بلکہ جب کبھی کسی کے سابقہ کردار پر نگاہ کرتے تو حالات کے ساتھ ان کے کردار کا جائزہ لیتے کہ کیا واقعی یہ مرد یا عورت بری تھی یا صرف اشراف وخواص مکّہ اسے بدِ سابقہ قرار دیتے تھے۔ ویسے دینِ مسیح میں بھی ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جنھیں حاکم بدِ سابقہ قرار دیتے تھے حتیٰ کہ ان کا قتل مباح تھا۔

اشراف وخواص کا انھیں بدکردار یا بدسابقہ قرار دینے اور ان کے واقعتاً بدکردار یا بدسابقہ ہونے میں بہت فرق تھا۔

آپ ﷺ کے پاس کوئی بدسابقہ فرد اسلام قبول کرنے کے لیے آتا تو وہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہوتا تھا۔ یہ کہ اشراف وخواص نے اس کو بدسابقہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں غور کیا جا سکتا تھا کہ وہ واقعتاً بدسابقہ ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر وہ بدسابقہ ثابت نہ ہوتا تو محمد ﷺ اس کو حلقۂ اسلام میں داخل کر لیتے تھے۔ دوسری حالت یہ کہ وہ ہر ایک کی نگاہ میں برا شمار ہوتا تھا۔ اس صورت میں آپ ﷺ دیکھتے کہ واقعی وہ اپنے سابقہ کردار پر پشیمان ہے اور توبہ کے لیے قصد رکھتا ہے تو اس کو بھی دین اسلام میں داخل فرما لیتے تھے۔ اس کی تائید میں ابوذر جو کہ قبیلۂ غفار سے تھے، کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

مکّہ کے شمال میں ایک خطۂ زمین ہے کہ میں اسے خطۂ ارضی کا وحشت انگیز ترین علاقہ

سمجھتا ہوں۔ اس خطۂ زمین پر ایک قبیلہ ''غِفار'' نامی رہتا تھا۔ اس قبیلے کے لوگوں کا واحد شغل راہزنی تھا۔ آج بھی یہ علاقہ چودہ سو سال پہلے کی طرح سنگلاخ، گرم اور جلا دینے والا ہے حتیٰ کہ اس علاقے میں کانٹے دار جھاڑیاں تک نہیں اگتیں۔ کوئی جانور حتیٰ کہ سوسمار بھی اس علاقے میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

اس علاقے سے آپ گزریں تو آپ کو کم بلند پہاڑ ملیں گے جب کہ وادیوں کے کنارے عمودی تراش کے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں عمیق اور خوفناک درّوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جب کوئی مسافر اوپر سے نیچے نگاہ کرے تو سیاہ زرد اور سبز پتھروں کی ناہموار گہرائیوں سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

میں نے جس وقت اس منطقہ کو عبور کیا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں تخلیق ارض کے ابتدائی دور میں ہوں یا پھر کرۂ قمر پر پہنچ گیا ہوں۔ بعض مقامات تو قیر (کول تار) کی طرح سیاہ اور بعض زرد رنگ تھے۔ گرمیوں میں جب آفتاب ان چٹانوں پر چمکتا ہے اور حرارت کا انعکاس ہوتا ہے تو زمین اور ہوا کا درجہ حرارت انسانی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس صحرا میں انسان بغیر کسی پناہ کے چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

قبیلہ ''غِفار'' کے افراد جن میں سے ایک ''ابوذر'' تھے، اسی سرزمین کے باسی تھے اور راہزنی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ عرب میں ڈاکہ زنی یا راہزنی اور بقولِ اعراب ''غزوہ'' باعثِ عار نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اگر اس میں کامیابی حاصل ہو تو اسے مباح قرار دیا جاتا۔ غزوہ کا اقدام عربوں کے رسم و رواج کے مطابق خفیہ طریق پر انجام دیا جاتا تھا تاکہ جس قبیلے پر حملہ کرنا ہو اسے غافل رکھ سکیں۔

غزوات میں خون نہیں بہایا جاتا تھا۔ اموالِ قبیلہ کو غارت کرنے کے لیے قتلِ نفس جائز نہیں تھا۔ دوسرے اس حملے میں عورتوں، بچوں اور ان کا سامان چھیننے کا حملہ آور مجاز نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ اگر قبیلے کی عورتیں لباسِ فاخرہ اور قیمتی زیورات پہنے ہوئے ہوں تو حملہ آور کو حق نہیں ہوتا تھا کہ وہ لباس اُتارے یا زیورات چھینے یا ان کو ہاتھ لگائے بلکہ انھیں عورتوں سے کہنا ہوتا

تھا کہ اپنا لباس اور زیور خود سے جدا کر دو اور جب عورتیں لباس تبدیل کر رہی ہوتیں یا زیور اُتار رہی ہوتیں تو حملہ آور قبیلے کے مرد اپنا رُخ مخالف سمت پھیر لیتے تھے کہ اس حالت میں ان پر نگاہ نہ پڑے۔ بدوی عربوں کی رسم کے مطابق سال میں چار مہینے غزوہ کی ممانعت تھی۔ ان چار مہینوں کو ماہِ حرام کہا جاتا ہے اور زائرین کو جو احرام باندھ کر سفر کر رہے ہوں، موردِ حملہ قرار نہیں دیا جاتا تھا۔ غزوہ میں قتل جائز نہیں تھا تاوقتیکہ مقابل قبیلے کے مرد اپنے دفاع میں تلواریں نہ نکال لیں۔ فقط یہی ایک حالت تھی جس میں قتل جائز تھا۔

قبیلہ غفار جو مکّہ کے شمالی علاقے میں سکونت پذیر تھے، اس جوانمردانہ رسم کا لحاظ نہیں کیا کرتے تھے۔ ماہ ہائے حرام میں بھی مسافروں پر حملے کرتے حتیٰ کہ احرام باندھے ہوئے لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

ذیقعد ماہ ہائے حرام میں سے ہے۔ اس مہینہ میں قبیلہ غفار نے ایک کاروان پر جو کہ ان کے علاقے سے گزر رہا تھا، حملہ کیا اور صرف لوٹ مار پر اکتفا نہ کیا بلکہ مردوں اور عورتوں کو قتل کر دیا۔ ابوذر نے جو بنوغِفار سے متعلق تھا، جب بچوں کو اپنے والدین کی نعشوں پر گریہ وزاری کرتے دیکھا تو بہت پشیمان ہوا۔ بچوں کی بے تابی اس سے دیکھی نہ گئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ اپنے قبیلے کو چھوڑ دے گا اور غفاریوں کے درمیان مزید ایک لمحہ بھی نہ رہے گا۔ یوں ابوذر نے اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر صحرا کی راہ لی اور قبیلے کے مسکن کو چھوڑ دیا۔ عربستان میں قبیلے کو چھوڑنا یا قبیلے سے نکال دیا جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، کجا کہ ایک بنوغِفار کا فرد۔ بدوی عرب چونکہ غفاریوں کو خوب جانتے تھے لہٰذا جب کبھی اور جہاں کہیں بھی انھیں پاتے قتل کر دیتے تھے، اس لیے کہ اس قبیلے کے افراد رسوم وقوانین کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ جوانمردی کے اُصولوں کو بھی پامال کر دیتے تھے۔

ابوذر ایک مدت سفر کرنے کے بعد اپنی والدہ کے قبیلے میں پہنچا۔ والدہ اور چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑ کر تن تنہا پھر سفر پر نکل پڑا۔ چند مہینے اس بدو نے تن تنہا صحراؤں میں بسر کیے کیوں کہ وہ اس علاقے میں پہنچ چکا تھا جہاں کم از کم صحرائی نباتات میسر تھیں۔

وہ شخص جو عرب نہ ہو، صرف صحرائی نباتات پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لیکن عرب، جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، بچپن ہی سے بھوک اور پیاس کے عادی ہو جاتے تھے اور رفتہ رفتہ بھوک اور پیاس ان کی فطرت کا جز ہو جاتی تھی۔

سر رچرڈ برٹن ایک انگریز نے ۱۸۵۰ء میں تقریباً آج سے ۱۵۸ سال پہلے پورے عرب کی سیاحت کی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح عرب میں موٹر کاریں یا جیپیں نہیں تھیں۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے: عرب کے بدو کا یہ عقیدہ ہے کہ موت کا سبب غذا کا تناول کرنا ہے نہ کہ بھوک۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ عرب جب تک صحرا میں زندگی بسر کرتا ہے، سالم رہتا ہے۔ جب شہر پہنچ کر فراواں غذا میسر آتی ہے تو اس کا مزاج مختل ہو جاتا ہے اور دو تین سال میں اسے موت آ لیتی ہے۔

بہرحال ابوذر نے چند مہینے صحرا میں گزارے اور اس دوران روز و شب کی تنہائی میں غور و فکر کرتا رہا اور بالآخر راہِ مکّہ اختیار کی۔ کسی سے شناسائی پیدا کیے بغیر تیس دن مکّہ میں رہا۔ اس دوران اس نے محمد ﷺ کا نام سنا کہ وہ (محمد ﷺ) لوگوں کو ایک خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ بدی سے پرہیز کرو اور شرک کو ترک کرو۔

تیس روز بعد ابوذر نے ارادہ کیا کہ محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو۔ لہٰذا ایک فرد سے آپ ﷺ کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اس شخص نے ابوذر کو تعجب سے دیکھا اور دہائی دی کہ اے قریش، اس آدمی کو پہچان لو۔ اس کو قتل کر دو کیوں کہ یہ ایک مسلمان ہے۔ لوگوں نے ابوذر پر حملہ کر دیا۔ وہ اپنی جان کے خوف سے بھاگ نکلا لیکن لوگوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ساتھ ساتھ سنگ باری کرتے گئے۔ خود ابوذر کہتے ہیں کہ مجھے اتنے پتھر مارے گئے کہ میں بے حال ہو گیا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ میں مر چکا ہوں، لہٰذا مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ تمام بدن خون خون ہے۔ رات کی تاریکی میں دو آدمی آئے اور مجھے کوچے سے اُٹھا لے گئے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان میں سے ایک حضرت ابوبکرؓ تھے۔ مجھے سنگسار کرنے کی خبر کسی مسلمان نے حضرت ابوبکرؓ کے گوش گزار کی اور تاریکی چھا جانے پر وہ اپنے ایک ساتھی

کی مدد سے مجھے اُٹھا لے گئے۔ دوسرے دن ابوذر کی ملاقات محمد ﷺ سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے نام پوچھا اور سوال کیا کہ کس قبیلہ سے ہو؟

ابوذر نے عرض کیا: قبیلہ غفار سے ہوں! قبیلے کے عمل پر پشیمان ہوں۔ اس لیے میں نے قبیلہ چھوڑ دیا ہے۔ صحرا میں ایک مدت بلا مقصد سرگرداں رہا، پھر مکّہ آیا۔ یہاں پہنچ کر آپ کے متعلق سنا کہ آپ لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلاتے ہیں۔ میں نے عزم کیا کہ آپ ﷺ کو تلاش کروں اور آپ ﷺ کے وسیلے سے خدائے یگانہ کو پہچانوں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: کب سے مکّہ میں ہو؟

ابوذر نے عرض کی: کل تیس روز پورے ہو گئے تھے!

محمد ﷺ نے فرمایا: اس مدت میں تمھارا وسیلۂ گزران کیا تھا؟ ابوذر خاموش رہا۔

محمد ﷺ نے پھر فرمایا: تم گذر بسر کیسے کر رہے تھے؟

ابوذر نے عرض کی: یہ تیس دن آبِ زم زم پیتا رہا ہوں!

محمد ﷺ نے پوچھا: ان تیس دنوں میں تم نے غذا مطلق نہیں کھائی؟

ابوذر نے جواب دیا: نہیں کھائی!

آج ہم اس جواب پر حیرت ظاہر نہیں کریں گے کیوں کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بغیر غذا فقط پانی پینے سے آدمی تیس دن زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا وزن ضرور کم ہو جائے گا اور بدن نے جو غذائی مواد ذخیرہ کیا ہوگا وہ صرف ہوتا رہے گا۔

وہ اشخاص جو بھوک کے عادی ہوں، تیس روز تک غذا کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں پانی پینے کو ملتا رہے۔ محمد ﷺ نے یہ جان لینے کے بعد کہ یہ شخص غفاری ہے یعنی ایک راہزن ہے، اس کو حلقۂ اسلام میں شامل کر لیا۔ لیکن آپ ﷺ کی دوربین نگاہیں یہ بھی جان چکی تھیں کہ ابوذر اپنے اعمال پر پشیمان ہے، اس نے توبہ کر لی ہے اور ارادہ رکھتا ہے کہ راہِ حق پر چلے۔

ابوذر کا شمار بعد میں سرکردہ مسلمانوں میں ہوا۔ انھوں نے اپنے تمام قبیلے کو مسلمان کیا اور وہ لوگ جن کا وسیلۂ معاش راہزنی تھا، چوری سے نفرت کرنے لگے۔

ابوذر غفاریؓ کی مثال ہم نے اس لیے دی ہے کہ واضح کر سکیں کہ محمد ﷺ ان افراد کو جو عوام کی نگاہ میں بد سابقہ ہوتے تھے مگر جب توبہ کر لیتے، حلقہ اسلام میں شامل کر لیا کرتے تھے۔ دوسرے ہم یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مکّہ والوں کی دشمنی انتہا کو پہنچ چکی تھی حتیٰ کہ ایک شخص اگر انجانے میں بھی ان کے گھر کا پتہ پوچھ لیتا تو وہ اسے مسلمان سمجھ کر قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے یا شاید وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ یہ جو محمد ﷺ کے گھر کا پتہ پوچھ رہا ہے، کہیں مسلمان نہ ہو جائے۔



عمر بن الخطاب کا قبول اسلام

یہ ایک انتہائی تعجب انگیز بات ہے کہ محمد ﷺ کو مکّہ میں کیوں قتل نہ کیا جا سکا، جب کہ سبھی ان کی جان کے درپے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزارش کی جا چکی ہے کہ طائفہ قریش دس قبیلوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک قبیلے کا نام بنی ہاشم تھا۔ محمد ﷺ اسی قبیلے کے فرد تھے۔ دوسرے نو قبیلے آپ ﷺ کو قتل کرتے تو مطابق رسم و شعائر قبیلہ بنی ہاشم کو خون بہا دیتے یا پھر بنی ہاشم کے انتقام کا سامنا کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ قبائل محمد ﷺ کے قتل کی جرأت نہیں کر رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ محمد ﷺ کو قریش کے افراد نے دو مرتبہ قتل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ ان کے دونوں منصوبے ناکام ہو گئے۔ ان ناکامیوں کے بعد وہ سست پڑ گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ محمد ﷺ کو مکّہ کے ایک طاقت ور ترین مرد کی حمایت حاصل ہو گئی۔

جب بھی محمد ﷺ گھر سے باہر تشریف لاتے، لوگ آپ ﷺ کو پتھر مارتے۔ زمین پر گرا لیتے اور ٹھوکریں مارتے۔ ایک دن ابو جہل کی تحریک پر لوگ محمد ﷺ کو پتھر مار رہے تھے اور آپ ﷺ زخمی ہو چکے تھے۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص محمد ﷺ کے چچا حمزہ کے پاس گیا۔[1] حمزہ ایک پہلوان تھا۔ وہ ابھی ابھی شکار سے واپس آیا ہی تھا کہ اس تماشائی نے اس سے کہا کہ تم پہلوان تو ہو مگر تمھاری غیرت کہاں گئی ہے کہ لوگ تمھارے بھتیجے کو پتھر مارتے، ٹھوکریں لگاتے اور تمھارے قبیلے کو گالیاں دیتے ہیں اور تو اس کی حمایت نہیں کرتا۔

حمزہ نے آج تک اس پہلو سے محمد ﷺ کی طرف توجہ نہیں کی تھی کیوں کہ اس نے مُن

۱۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ابو جہل نے نبی ﷺ کو ایذا اور گالیاں دی تھیں اور آپؐ کے دین کو برا بھلا کہا تھا۔ عبداللہ بن جدعان کی ایک لونڈی یہ سن رہی تھی اور اس نے حمزہؓ کو ابو جہل کی بدکلامی کے بارے میں بتایا تھا۔ (السیرۃ النبویہ: ۱/ ۳۲۸)

رکھا تھا کہ محمد ﷺ اجداد کے عقیدے کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے لیے اجداد کا عقیدہ محترم تھا لیکن جب اس نے سنا کہ لوگ محمد ﷺ کو پتھر مارتے اور ٹھوکریں لگاتے ہیں، خصوصاً اسے جب یہ بتایا گیا کہ گندی گالیاں دیتے ہیں تو حمزہ نے اس شخص سے پوچھا کیا گالیاں دیتے ہیں؟ اس آدمی نے کچھ گالیاں سنا دیں جو لوگ محمد ﷺ کو دیا کرتے تھے۔ جب حمزہ کو معلوم ہوا کہ لوگ میرے بھتیجے کو فحش گالیاں دیتے ہیں تو غصے سے اس کی حالت اس طرح بدلی کہ اس کا سرخ چہرہ سیاہ ہو گیا۔ ویسے بھی عرب بادیہ نشین کلام کو بہت اہمیت دیتے تھے خواہ وہ کلام اُن کی تعریف میں ہو یا ہجو میں۔ بدوی عرب اپنے بزرگوں کی شان میں بدگوئی کو ناقابلِ معافی جرم قرار دیتے تھے۔ چونکہ کلام کو بہت اہمیت دیتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہتا کہ تیری پیٹھ میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے تو وہ بیوی اس پر حرام ہو جاتی تھی۔ نیز بدکلامی یا گالی خواہ ایک فرد کو ہی کیوں نہ دی گئی ہو وہ پورے قبیلے کی توہین تصور کی جاتی تھی۔ ویسے بھی ایک قبیلے کے افراد آپس میں رشتہ دار ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے اشتراک خون بھی ہوتا تھا۔

حمزہ نے تلوار اُٹھائی۔ یہ تو اسے معلوم ہی ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ کی مخالف تحریک کا لیڈر ابوجہل ہی ہے۔ وہ اس کے گھر گیا اور اسے خوب تھپڑ لگائے اور کہا: اے ابوجہل! تو نے سمجھ رکھا ہے محمد ﷺ بے یارومددگار ہیں؟ کیا تو اس لیے انھیں پتھر مارتا اور گالیاں دیتا ہے؟ میں آج سے دین محمد ﷺ کو قبول کرتا ہوں اور جس نے محمد ﷺ کو برا کہا اس سے میں خود نپٹ لوں گا۔[2]

حضرت حمزہؓ کا مسلمان ہونا آپ ﷺ کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا۔ حمزہؓ تمام پہلوانوں سے زیادہ طاقت ور یعنی "رستم عرب" تھے، تاہم قریش کے افراد کی ایذا رسانی کم نہ ہوئی، حالانکہ انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حمزہؓ (محمد ﷺ کے چچا) اسلام لا چکے ہیں۔ وہ محمد ﷺ پر پھر بھی حملہ کر دیا کرتے تھے۔

۲- ابن ہشام کے مطابق حمزہؓ نے ابوجہل کو مسجد الحرام میں جا لیا تھا اور اس کے سر پر کمان دے ماری تھی۔ حمزہؓ نے اسے یہ کہہ کر چیلنج کیا کہ اگر ہمت ہے تو سامنے آ مگر اس نے جرأت نہ کی اور اپنے ساتھیوں سے کہا: "ابوعمارہ کو جانے دو۔ میں نے واقعی اس کے بھتیجے کو گندی گالیاں دی تھیں"۔

اتنا فرق ضرور آیا کہ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد محمد ﷺ اور دوسرے مسلمان کوہ صفا پر ایک گھر میں جمع ہونے لگے۔ یہ گھر خانہ کعبہ کے روبرو تھا۔ میں نے اس گھر کو دیکھا ہے، آج وہ ایک مدرسہ ہے۔[3]

جب مسلمان اس گھر میں عبادت کے لیے جمع ہوتے، کچھ افراد ان میں سے شمشیر بدست ہو کر نگہبانی کرتے، اس لیے کہ ہر لحہ خطرہ ہوتا تھا کہ قریش حملہ کر دیں گے اور سب کو قتل کر دیں گے۔

محمد ﷺ مسلمانوں سے نظم و ضبط میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں چاہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ عبادت کے وقت اس گھر میں ضرور پہنچنا ہوگا اور نماز باجماعت میں شرکت کرنا ہوگی۔ نماز باجماعت سے غیر حاضری پر کسی عذر کو نہ مانتے تھے، الا یہ کہ کوئی اتنا بیمار ہو کہ اُٹھ بیٹھ نہ سکتا ہو۔

اہل عرب موت کی پروا اسی وقت تک کرتے جب تک تلوار ہاتھ میں نہ لیں۔ جب شمشیر بدست ہوتے تو موت کا خوف جاتا رہتا تھا۔ ایک بدوی عرب جب تلوار اُٹھا لیتا تو خود کو دس نفر کے برابر سمجھتا اور مسلمان بھی تو بدوی عرب ہی تھے۔

موت کے بارے میں عربوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اجل یا مرگ انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ خداوند تعالی کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا اگر کوئی تلوار لیے میدانِ جنگ میں اترے تو ہلاک نہیں ہوگا، اِلّا یہ کہ اس کی اجل آ چکی ہو۔ عرب اس عقیدے کی بنا پر میدانِ جنگ میں موت کا خیال تک ذہن میں نہیں لاتے تھے۔ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ اور حلم سے میدانِ جنگ میں لڑتے، خصوصاً مکّہ کے عرب حلم میں معروف تھے اور جانتے تھے کہ جوشیلا پن میدانِ جنگ میں خطرناک ہوتا ہے۔ حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد کچھ اور افراد مسلمان ہوئے اور یوں مسلمانوں کی تعداد تیس سے تجاوز کر گئی۔

ساکنان مکّہ خصوصاً قبائل قریش نے اب اسلام کا فروغ حقیقی طور پر محسوس کیا اور پہلی بار اس بابت دارالندوہ (مجلس شوریٰ) کا مکّہ میں اجتماع ہوا کہ دین محمد ﷺ کا کس طرح اور کیا توڑ کیا جائے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

۳- یہ گھر دارارقم تھا جو حضرت ارقمؓ بن ابی ارقم کی ملکیت تھا۔

قریش کے سرداروں میں ایک مرد بنام عمر تھا۔ جب مجلس منتشر ہو گئی اور تمام بزرگ دارالندوہ سے چلے گئے تو عمر نے کہا: میں محمد ﷺ کو قتل کرتا ہوں اور مکّہ والوں کو اس شر سے رہائی دلاتا ہوں۔ تمام اشراف قریش چاہتے تھے کہ محمد ﷺ قتل کر دیے جائیں۔ لیکن کوئی بھی جراًت نہیں کرتا تھا، تاہم عمر نے اس کا بیڑا اُٹھا لیا۔[۴]

عمر اُن افراد سے تھا جو ارادے کے پکے اور بات کے دھنی ہوتے ہیں۔ دوسری صفت یہ کہ مکّہ میں اس سے بلند قامت کوئی اور شخص نہ تھا۔ قد اتنا بلند تھا کہ جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسجد بنائی گئی اور عمر مسجد میں داخل ہونے لگے تو ان کا سر چھت سے جا لگا۔

مکّہ کے لوگ جانتے تھے کہ عمر کی زبان سے نکلا ہوا لفظ واپس نہیں ہوا کرتا۔ جب اس نے کہا کہ فلاں آدمی کو قتل کر دوں گا تو بغیر کسی شک وشبہ کے وہ اسے قتل کر دے گا اور دوسرے اسے مردہ ہی سمجھ لیں۔ جس دن خطاب کے بیٹے نے محمد ﷺ کو قتل کا ارادہ کیا، وہ ۶۱۴ سن عیسوی تھا یعنی آٹھ سال قبل از ہجرت۔

اس دن محمد ﷺ اور مسلمان کوہ صفا پر واقع گھر میں جمع تھے۔ عمر بن الخطاب اپنے گھر گیا اور اس ارادے سے کہ محمد ﷺ کو قتل کرے، اپنی تلوار اُٹھائی اور کوہ صفا کی طرف چلا۔ راستے میں اسے نعیمؓ بن عبداللہ ملے (جو پوشیدہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے) نعیمؓ نے پوچھا: عمر کہاں جا رہے ہو؟

عمر کی عادت تھی بہت بلند آواز سے گویا ہوا کرتا تھا۔ کہا: یا نعیمؓ! میں جب سے پیدا ہوا ہوں، میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے قریش کی اتنی توہین کی ہو جتنی محمد ﷺ نے کی ہے حتیٰ کہ بڑے بڑے دشمنوں نے بھی ہماری ایسی ہتک نہیں کی۔ یہ شخص دین جدید لا کر موجب نفاق ہوا ہے۔ ہمارے اجداد کی شان میں بدگوئی کرتا ہے۔ ہمارے والدین کو اس نے خاک برابر کر دیا ہے اور کہتا ہے کہ ہم اپنے خداؤں کی پرستش چھوڑ دیں۔ ہم نے آج تک صبر کیا ہے صرف اس لحاظ سے کہ محمد ﷺ قبیلہ قریش سے ہے، لیکن اب ہم اس کی اس بے باک توہین سے تنگ

۴۔ کوئی مہاراجا کسی مہم پر بھیجتے وقت اعلان کرتا: کون ہے جو یہ بیڑا اٹھائے؟ جو سردار آگے بڑھ کر پان کا بیڑا اُٹھا لیتا، اسے سپہ سالار بناتے۔

آ گئے ہیں۔ میں جا رہا ہوں کہ اسے قتل کروں تا کہ ہمیشہ کے لیے مکّہ سے یہ شر ختم ہو۔

نعیمؓ جانتے تھے کہ عمر ایک صاف گو، شریف اور راست باز مرد ہے اور اسے اپنے ارادے سے باز نہیں رکھا جا سکتا، الا یہ کہ اسے کسی محکم عقلی دلیل سے قائل کر لیا جائے۔ چونکہ وہ راست گو اور شریف تھا، عقل و انصاف کا قائل ہو جاتا تھا اور اس میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہ سوچ کر نعیمؓ عمر کے پیچھے بھاگے اور کہا: عمر! ذرا ٹھیرنا میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ عمر ٹھیر گیا۔ نعیمؓ جب اس کے پاس پہنچے تو عمر اتنا بلند تھا کہ نعیم کا سر اس کے سینے تک پہنچ رہا تھا۔

عمر کا طریقہ تھا کہ بوقتِ جنگ تلوار کو کبھی بے نیام نہیں کیا کرتا تھا۔ زمانہ امن میں وہ اپنے دشمنوں کو کوڑوں سے مارا کرتا تھا۔ لیکن اس دن اس نے اپنے ہاتھ میں ننگی تلوار لے رکھی تھی کہ محمد ﷺ کو قتل کرے۔

جس وقت عمر ٹھیر گیا تو نعیم بن عبداللہ نے کہا: اے عمر! تو محمد ﷺ کے دین جدید سے ناراض ہے اس لیے کہ یہ ہمارے دین کی بیکی کا باعث ہے لیکن پیش تر اس کے کہ تو مکّہ کے لوگوں کا نفاق دور کرے، یہ بہتر ہوگا کہ اپنے گھر کو منظم کرو۔

عمر نے پوچھا: تمھارا مطلب؟

نعیم نے کہا: دو افراد تمھارے عزیزوں میں سے مسلمان ہیں، تمھارے گھر میں رہتے ہیں۔ ایک تمھاری بہن فاطمہؓ اور دوسرے تمھارے بہنوئی سعید بن زیدؓ۔ تو مکّہ والوں کو ابھی چھوڑ اور جا اپنے گھر کی فکر کر۔

عمر ایک منطقی انسان تھا۔ اس نے جب یہ سنا تو کہا: تو ٹھیک کہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ مکّہ سے تمام اسلام کی بیخ کنی کروں، اسلام کو اپنے گھر سے نکال باہر کرنا ہوگا۔ یہ کہہ کر کوہ صفا کی طرف جانے کے بجائے واپس اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

جب عمر اپنے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ فاطمہؓ اور اس کا شوہر سعیدؓ بن زید اور ایک مرد بنام خبابؓ تینوں مل کر قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔ عمرؓ نے بہن کو تازیانے مارنے

شروع کر دیے اور وہ بھی اس شدت سے کہ فوراً ہی فاطمہؓ کے بدن سے خون رسنا شروع ہو گیا۔ عمرؓ بہن کو مارتا جاتا اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا تم دینِ محمد ﷺ کو ترک کر دو۔ لیکن فاطمہؓ نے کہا: یہ ناممکن ہے، تم چاہے مجھے قتل کر دو۔ ویسے تم اگر قرآن پڑھ کر دیکھو تو تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ دین دینِ برحق ہے۔

یہاں دو روایتیں منقول ہیں: ایک یہ کہ عمر نے سعیدؓ بن زید کے ہاتھ سے قرآن لے کر پڑھنا شروع کر دیا اور دوسرے یہ کہ عمر نے بہنوئی سے خواہش ظاہر کی کہ میرے لیے قرآن پڑھیں تاکہ میں سمجھ سکوں اس میں کیا تاثیر ہے جو میری بہن مجھ سے کہتی ہے کہ پڑھ کر تو دیکھو تاکہ تمھیں معلوم تو ہو کہ دینِ محمد ﷺ برحق ہے۔

پہلی روایت کہ سعیدؓ بن زید کے ہاتھ سے قرآن لے لیا، تاریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ یہ واقعہ آٹھ سال قبل از ہجرت کا ہے اور قرآن پاک موجودہ شکل و ترتیب میں نہیں تھا، بلکہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں قرآن موجودہ شکل میں مرتب نہیں ہوا تھا۔ قرآن کو موجودہ شکل رحلت رسول اللہ کے بعد حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں دی گئی تھی۔ مسلمان عموماً ان پڑھ تھے۔ ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ آیات کو لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیں۔ حضرت محمد ﷺ کے دورِ حیات میں قرآن متفرق آیات کی صورت میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا۔ اکثر مسلمان آیات قرآنی کو حفظ کر لیا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کی موجودہ شکل کا اس وقت وجود نہ تھا، اور نہ اس وقت تک آیات قرآنی کو یکجا کیا گیا تھا اور نہ قرآن کی تکمیل ہوئی تھی۔ قرآن ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوتا رہا۔

ہاں یہ ممکن ہے کچھ پڑھے لکھے مسلمانوں نے بعض آیات کو لکھ کر رکھا ہوتا کہ بھول نہ جائیں اور یہی ان تین افراد کے پاس موجود ہوں اور یہی لکھی ہوئی آیات عمر کے ہاتھ لگی ہوں۔ آج ہم نہیں جانتے کہ وہ آیات کس چیز پر لکھی ہوئی تھیں اور ان کی کیا شکل تھی۔ جدا جدا کاغذوں یا چمڑے کے ٹکڑوں کا ڈھیر تھا یا ایک رسالے کی شکل تھی۔ روایت اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔

جب عمر گھر میں داخل ہوا اور بہن کو پیٹنا شروع کیا، یہ ہجرت کے آٹھ سال پہلے کا واقعہ

ہے۔ بہر صورت عمر نے وہ آیات قرآنی پڑھیں یا سنیں تو ان کا بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ بہن کو چوم لیا اور تینوں سے کہا: میں فوراً مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ اسی وقت یہ تینوں افراد عمر کی ہمراہی میں کوہ صفا کی طرف چل دیے۔ مسلمانوں نے جو کوہ صفا پر موجود تھے، جب دیکھا کہ عمر اپنی زخمی بہن کے ساتھ آ رہا ہے تو یہ سمجھے کہ عمر قتل کے ارادے سے آ رہا ہے۔ بہر حال عمر نے یقین دلایا کہ وہ اسلام قبول کرنے کے لیے آیا ہے۔

عمرؓ بن الخطاب چالیسویں فرد تھے جو مسلمان ہوئے۔ عمرؓ کا اسلام قبول کرنا مسلمانوں کے لیے ایک بڑی مدد تھی۔ اسے تاریخ اسلام کا بہت اہم واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ عمرؓ اس قدیم دنیا کے ایک مثالی فرد تھے جیسے کہ بتایا جا چکا ہے۔ عمرؓ بلند قامت، چوڑے چکلے شانوں اور بہت بلند آواز کے مالک تھے۔ وہ جب اونچی آواز نکالتے تو ان کی آواز ایک ہزار قدم تک سنی جا سکتی تھی۔ وہ تمام صفات جو ایک مثالی اصیل عرب میں ہونی چاہییں، عمرؓ ان سے متصف تھے۔

عمرؓ اسلام لانے سے قبل بھی منہیات کے عادی نہیں تھے اور ایک بدوی عرب کی طرح کھانے پینے میں افراط سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ بلند قامت اور چوڑے شانوں والا انسان صرف پانچ لقمے غذا پر اکتفا کیا کرتا اور بعید نہیں کہ انھوں نے تاریخ میں جو فوق العادۃ کام انجام دیے ہیں، اسی بنا پر تھے۔ اپنے دورِ خلافت میں بعض اوقات آپ پندرہ پندرہ دن رات مسلسل کام کرتے تھے بغیر اس کے کہ تھکن کے آثار نمایاں ہوں۔

عمرؓ بن الخطاب ہرگز کسی مجرم کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ سزا میں کمی کے قائل نہیں تھے، لیکن یہ بھی محال تھا کہ کوئی بے گناہ ان کے ہاتھ سے سزا پا جائے۔

عمرؓ دس سال مسلمانوں کے خلیفہ رہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں دنیا کی تین بڑی سلطنتوں (ایران، مصر، روم) کو فتح کیا۔ زندگی کے آخری لمحے تک جب آپؓ قدیم دنیا کے ایک بڑے حصے کے حکمران تھے، خاک یا کھجور کی چٹائی پر بیٹھا کرتے تھے اور ایک وقت میں فقط پانچ لقمے غذا پر اکتفا کرتے تھے۔

اس دن جب کوہ صفا والے گھر میں عمرؓ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے، انھوں نے

حضرت محمد ﷺ اور مسلمانوں سے کہا: آؤ اب ہم خانہ کعبہ چلیں۔ اور پھر پہلی بار مسلمان مکہ شہر میں سے ایک جتھے کی صورت میں گزرے اور خانہ کعبہ پہنچ کر نماز ادا کی۔ اس موقع پر ابوجہل، ابوسفیانؓ، ابولہب اور کئی دوسرے سرکردہ افراد خانہ کعبہ کے مقابل جمع ہو گئے تھے مگر انھیں جرأت نہ ہوئی کہ خانہ کعبہ میں داخل ہوں۔

نماز سے فارغ ہو کر جب مسلمان خانہ کعبہ سے باہر آئے تو عمرؓ بن الخطاب نے سردارانِ قریش سے کہا: اگر آج کے بعد محمد ﷺ اور اسلام کے متعلق کوئی بات ہو تو آپ مجھ سے رجوع کریں۔ نیز میں آج سے مسلمان ہو گیا ہوں۔ قبیلہ قریش کے سردار عمرؓ سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ان میں سے کسی کو ان کی بات کا جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی اور مسلمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اس دن حضرت عمرؓ، حضرت محمد ﷺ کو ان کے گھر تک چھوڑ کر آئے۔ کسی فرد کو جرأت نہ ہوئی کہ کوئی گندی بات کہے یا آپ ﷺ کی طرف پتھر پھینکے۔

سردارانِ قریش نے جب دیکھا کہ عمرؓ بھی مسلمان ہو گئے ہیں اور انھوں نے کھلم کھلا محمد ﷺ کی حمایت شروع کر دی ہے تو وہ بہت زیادہ فکر مند ہوئے۔ اتنی فکر انھیں حضرت حمزہؓ کی حمایت پر لاحق نہیں ہوئی تھی۔ حمزہؓ ایک رستم اور جنگجو تھے لیکن قریش کی جماعت عمرؓ سے زیادہ خوفزدہ تھی، اس لیے کہ وہ جانتے تھے عمرؓ کتنا دلیر اور وفادار ہے۔ مکہ میں مشہور تھا کہ شیطان بھی عمرؓ سے دور بھاگتا ہے۔

بہر حال اسلام کے دشمن حضرت محمد ﷺ اور عمرؓ کی طرح بدوی عرب تھے اور وہ آبائی دین پر یقین رکھتے تھے اور وہ کسی صورت بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ محمد ﷺ ان کے آباؤ اجداد کے دین کو باطل کہیں اور نتیجتاً ان کا دین باطل ہی تصور کیا جانے لگے۔

اس وجہ سے انھوں نے دوبارہ آپس میں مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ابوطالب جو حضرت محمد ﷺ کے قبیلہ بنو ہاشم کے بزرگ ہیں، ان کی طرف رجوع کیا جائے اور اس پر زور دیا جائے کہ محمد ﷺ کو قبیلے سے باہر کرے تاکہ ہم اسے قتل کر سکیں۔

جب تک محمد ﷺ قبیلہ ہاشم کے رکن تھے، قریش کی جماعت انھیں قتل نہیں کر سکتی تھی، لیکن اگر ابوطالب ان کی موافقت کرتے اور حضرت محمد ﷺ کو قبیلہ سے طرد کر دیتے تو پھر آپ ﷺ کا خون ان پر مباح ہو جاتا تھا۔ جب تک کہ محمد ﷺ رکن قبیلہ ہاشم تھے، ان کے خون کی قیمت تھی۔ قاتل قبیلہ لازماً خون بہا ادا کرتا اور وہ بھی اس صورت میں کہ مقتول کا قبیلہ خون بہا لینا قبول کر لے۔ اگر ابوطالب محمد ﷺ کو طرد کرنا قبول کر لیتے تو قریش کی جماعت بلا خوف و خطر آپ ﷺ کو قتل کر دیتی۔ اس طرح قتل کی صورت میں نہ خون بہا واجب تھا اور نہ مقتول کے قبیلہ سے انتقام کا خطرہ تھا۔

قریش کی جماعت میں سے چند آدمیوں کو ابوطالب سے مذاکرات کے لیے مامور کیا گیا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے قبیلے سے طرد کروائیں اور اس کے عوض ابوطالب قریشی قبائل میں سے ایک یا دو جوانوں کو اپنے قبیلہ میں لے لے۔

اس موضوع اور پیش کش پر حیران نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ قبل از اسلام جزیرہ نمائے عرب میں قتل انسانی پر جزا و سزا کا تصور موجود نہیں تھا۔ جب ایک شخص دوسرے کو قتل کرتا تو اس میں کوئی پشیمانی کی بات نہیں ہوتی تھی اور لوگ بھی اسے اس فعل پر کسی دنیوی یا اخروی سزا کا مستوجب نہیں سمجھتے تھے۔ آخرت میں جزا و سزا کا تصور اسلام کے ساتھ وجود میں آیا ورنہ ایک بدوی کو دس انسان قتل کر کے بھی عذاب آخرت کا احساس یا خوف نہیں ہوتا تھا اور نہ اس فعل کو دوسرے لوگ مستوجب سزا سمجھتے تھے۔

ایک فرد کی حیثیت قبیلے میں ایسی ہوتی جیسے گھوڑا یا شتر۔ جس وقت قبیلے کا کوئی فرد قتل ہو جاتا تو قاتل اس کا خون بہا ادا کرتا اور اگر مقتول کا قبیلہ خون بہا قبول کر لیتا تو قاتل کا جرمِ قتل معاف تصور ہوتا تھا۔ کبھی ایسے بھی ہوتا کہ قاتل کے قبیلے سے ایک فرد مقتول کے قبیلے کو دے دیا جاتا تاکہ تعادل (عدل میں برابری) قائم رہے۔ بدوی عرب افراد قبیلہ کو مثل سرمایۂ مادی تصور کرتے تھے، لہٰذا ایک فرد کے قتل سے قبیلے کی قوت میں جو کمی واقع ہو جاتی تھی، اس کے عوض قاتل قبیلے سے ایک فرد کو اپنے خاندان میں شامل کر کے خوش ہو جاتے تھے کہ مجموعی طور پر قبیلے کی قوت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

دور جاہلیت کے کچھ شعرا عقیدہ رکھتے تھے کہ بیٹے، بھائی یا باپ کا قتل ناقابل تلافی ہے حتیٰ کہ قاتل کے تمام افراد کو بھی قتل کر دیا جائے تو تلافی ممکن نہیں ۔اور یہ بھی کوئی تلافی کا طریقہ نہیں کہ بیٹے، بھائی یا باپ کو بہ بہائے شتر یا زر بیچ دیا جائے۔

اسی عقیدے کی بنا پر یہ شعرا مجبور ہوئے کہ اپنے اپنے قبیلے سے دور رہ کر ایک مطرود کی زندگی بسر کریں ۔وہ اس لیے کہ ان کا نظریہ اُصول مروت کے خلاف تھا جب کہ مروت کو عربوں کے قانون اساسی میں بہت دخل تھا۔

قانون مروت کا تقاضا تھا کہ جب ایک آدمی قتل ہو جائے اور اس کا قاتل خود ہی خون بہا کی ادائگی کے لیے حاضر ہو جائے اور مقتول کے قبیلے کو راضی کر کے خون بہا ادا کر دے تو قاتل کے خلاف فردِ جرم نہیں رہتی ۔پھر ایک کے آدمی قتل کے انتقام میں تمام قبیلے کو نابود نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال دور جاہلیت کے بعض شعرا نے خون بہا کے اہتمام کو کافی نہیں سمجھا ۔وہ سمجھتے تھے کہ اس سے ایک عزیز کے خون کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔بہر حال وہ شاعر تھے اور قریش تاجر۔ تاجران قریش رسم قدیم وقوانین مروت کی پیروی کرتے تھے ۔ان کی یہ سوچ تھی کہ اگر ابو طالب نے محمد ﷺ کو قبیلے سے طرد کر کے اس کے عوض کسی دوسرے جوان کو شامل کر لیا تو کچھ نقصان نہیں ۔اور اگر ابو طالب ایک کے بجائے دو جوان شامل کرنے پر مصر ہوئے تو چلو کچھ منافع بھی وصول کر لے گا۔

قریش کے نمائندے ابو طالب کے پاس گئے اور اپنا مدعا بیان کیا ۔ابو طالب نے کہا: بھائیو! میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں گا، فکر نہ کرو۔ میں اپنے اجداد کے دین پر ہی مروں گا، لیکن اپنے قبیلے سے محمد ﷺ کو طرد نہیں کروں گا تا کہ تم اسے قتل کر سکو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس سے گفتگو کروں گا۔ شاید میں اسے قائل کر سکوں کہ وہ اپنے دین کو چھوڑ دے ۔آپ لوگ میرے پاس کل تشریف لائیں ۔جو بھی گفتگو کے نتائج ہوں گے، میں آپ کو ان سے آگاہ کر دوں گا۔

اس روز ابو طالب نے حضرت محمد ﷺ کو اپنے پاس بلایا اور آپ ﷺ کو قریش کی خواہش سے آگاہ کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں تمھیں قبیلے سے طرد کر دوں تا کہ وہ تمھیں قتل کر سکیں۔

میں نے ان کی خواہش کے پیش نظر انھیں بتایا ہے کہ میں ہرگز دین محمد ﷺ کو قبول نہیں کروں گا مگر محمد ﷺ میرا بھتیجا ہے، میں اسے قبیلے سے طرد نہیں کر سکتا۔ میں اس سے بات کروں گا شاید وہ باز آ جائے۔

محمد ﷺ نے پوچھا: چچا کس چیز سے باز آنا ہوگا؟

ابو طالب نے کہا: میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ تم سے مذاکرہ کروں کہ تم دین جدید کو چھوڑ دو اور اس کی تبلیغ وغیرہ بند کر دو۔

محمد ﷺ نے فرمایا: چچا! میں نے جب سے رسالت کا پیغام پہنچانا شروع کیا ہے، اس وقت سے میں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور پر تکیہ نہیں کیا اور آج بھی میں اسی پر تکیہ کرتا ہوں ۔اگر آپ مجھے قبیلے سے طرد کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

لیکن ابو طالب نے آپ کو قبیلے سے طرد نہ کیا کیوں کہ وہ اس عمل کو باعث ننگ و عار سمجھتے تھے ۔قریش سے کہہ دیا کہ میں محمد ﷺ کو قبیلے سے طرد نہیں کروں گا۔ مگر جب تک زندہ ہوں، اس کے دین کو قبول نہیں کروں گا۔

قریش کی جماعت نے جب دیکھا کہ ابو طالب سے گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہوئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ محمد ﷺ سے بالمشافہہ گفتگو کی جائے ۔قریش نے اپنے میں سے ایک بڑے ذہین، حلم والے اور متحمل مزاج شخص کا انتخاب کر کے اسے محمد ﷺ کے پاس بھیجا ۔اس شخص نے نمائندے کی حیثیت سے محمد ﷺ سے یوں کہا:

اے محمد ﷺ! جب سے سیانے ہوئے ہو ہم نے تمھیں امین اور صابر پایا اور ہم سب تمھارے حسن خلق سے راضی وخوش تھے ۔کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ تمھارے ہاتھ سے کسی کو آزار پہنچا ہو لیکن آج تم جو کہتے ہو اور جو کام کرتے ہو، اس سے اس شہر کے تمام افراد کی زندگی دگرگوں ہو کر رہ گئی ہے ۔کوئی شخص مطمئن نہیں ہے ۔تم علانیہ اس شہر کے لوگوں کے مذہب کو غلط کہتے ہو اور ہمارے بتوں کو باطل سمجھتے ہو۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ ہمارے اجداد کا دین ایک گمراہی ہے جب کہ تم خود ہم میں سے ہو اور ہمارے ہی

اجداد کے خلف، پھر کس طرح تم اپنے اجداد کی توہین روا رکھتے ہو؟
میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ جو کچھ تمھارے دل میں ہے تم برملا کہہ دو تا کہ ہم سمجھ سکیں کہ تمھارا منشا و مقصود کیا ہے۔ اگر تمھیں دولت کی خواہش ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مکّہ والوں سے اس قدر دولت جمع کردوں گا کہ تم بے نیاز ہو جاؤ گے اور اگر عورت درکار ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ قریش کی زیبا ترین لڑکیاں تمھارے لیے ہوں گی اور تم شب و روز ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس کے ساتھ بسر کرو۔ اگر طلب جاہ ہے تو جو مقام تم چاہو ہم تمھیں دیں گے۔ اگر چاہتے ہو مکّہ میں رئیس بنو تو ہمیں یہ بھی منظور ہوگا کہ تمھیں اس شہر کی ریاست دے دیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم اپنی روش بدل ڈالو، ہمارے عقیدے کو نہ جھٹلاؤ اور مت کہو کہ ہمارے بت برحق نہیں ہیں، اس لیے کہ ہم میں اس توہین کو برداشت کرنے کی قوت نہیں ہے۔ ہر لفظ جو تم کہتے ہو ہمارے سینوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتا ہے۔“

حضرت محمد ﷺ نے بڑے تحمل اور حوصلے سے نمائندہ قریش کو سنا۔ جب وہ اپنی بات تمام کر چکا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کا فرمان ہے۔ خدا جو کچھ مجھ پر وحی کرتا ہے وہ تم لوگوں سے کہتا ہوں اور یہ سب عربی زبان ہی میں ہے، تم اسے سمجھ کر اس پر عمل کر سکتے ہو۔ جب میں کہتا ہوں کہ تمھارے اجداد کا دین برحق نہیں ہے، یہ شرک ہے تو خدا کا کلام میری زبان پر ہوتا ہے۔ میں رسول خدا ہوں اور اپنے وظیفے کو انجام دوں گا۔ طمع، لالچ یا خوف جو تم مجھے دلا رہے ہو، مجھے رسالت کے کاموں کی انجام دہی سے نہیں روک سکتا۔ تم لوگ میری بات مان لو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ خود کو شرک سے پاک کر لو اور دین خدا کو قبول کر لو۔“

خداوند کا فرمان میری زبان سے سن لو:

﴿قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ

وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ﴾ ترجمہ (یہ سورۂ سجدہ کی ساتویں آیت ہے) اے محمدؐ! ان مشرکوں سے کہہ ”کہ میں بھی تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں، فرق یہ ہے کہ خداوند کی طرف سے مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ میں تمھیں بتا دوں کہ خدا ایک ہے۔ تم اس کی طرف بڑھو اور اس سے بخشش طلب کرو اور جان لو کہ مشرکوں کے لیے ”ویل“ تیار ہے۔ [حم سجدہ ۴۱: ۶]

قریش کا نمائندہ جواب سن لینے کے بعد جب قبیلہ قریش میں واپس آیا تو ان سے کہا کہ مجھ سے تو کچھ بن نہیں آیا۔ اب جو سلوک چاہو محمد ﷺ سے روا رکھو۔ یہ نمائندہ قریش جس نے آپ ﷺ سے مذاکرات کیے، اس کا نام عتبہ تھا، عتبہ بن ربیعہ، ابوسفیانؓ کا خسر۔



مسلمانوں کی ہجرتِ اوّل

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی متعدد ازواج تھیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ جب تک حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ زندہ رہیں، آپ ﷺ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا اور یہ پچیس سال کی ازدواجی مدت تھی۔

جب آپ ﷺ نے خدیجہؓ سے نکاح کیا، آپ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی، یعنی عین عالم شباب اور جب حضرت خدیجہؓ نے رحلت فرمائی تو آپ ﷺ کی عمر عزیز کے پچاس سال گذر چکے تھے۔ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کے لیے صرف ایک بیوی ہی نہ تھیں بلکہ وہ ایک مشیر اور پختہ ترین دوست شمار ہوتی ہیں۔ حضرت محمد ﷺ جیسے خود ایک بدوی عرب تھے، حضرت خدیجہؓ کو بھی ایک بدوی عرب کی طرح دوست رکھتے تھے۔

براعظم یورپ کے رہنے والوں کے لیے تو نیلگوں سمندر اور بڑے بڑے دریا، جنگل، سبزہ زار اور باغات دیکھنے کے لیے اور سننے کے لیے بلبلوں کی صدائیں میسر ہیں، لہٰذا انھیں ایک عورت کی رفاقت کی قدر کیا ہوگی، لیکن عرب کے بیابانوں میں جہاں نہ دریا ہیں نہ سبزہ نہ چمن نہ گلستان اور نہ بلبل کی صدا، وہاں ایک بدوی عرب ان تمام فطری لطافتوں سے محروم فقط اپنی بیوی کو ان مناظر کی جگہ دیکھتا ہے۔ بلبل کی صدا کی جگہ اپنی بیوی کی آواز سنتا ہے۔ اس کی نظر میں پھول کا کھلنا عبارت ہے عورت کے تبسم سے اور سرو کا درخت اس کی نظر میں قامتِ زن ہے۔ اور جب کبھی کسی عورت کا چہرہ نظر آیا تو ایک گلستان نظر آیا۔ تمام تشبیہات شاعرانہ کہ آج تمام یورپی شاعروں نے عورت کی تعریف کے لیے استعمال کی ہیں، وہ سب شعرائے عرب سے مستعار ہیں۔ فقط عرب ہی تھے جنھوں نے ابتدا میں تمام زیبائیوں کو وجودِ زن میں دیکھا۔

دورِ جاہلیت کے عرب شعرا نے عورت کی بابت جو کہا، دل کی گہرائی سے کہا۔ لیکن یورپ

کے شاعروں نے ان کی محض تقلید کی ہے، اس لیے کہ احساسات کی روح پرور گہرائیوں میں وہ ایک بدوی عرب کے تخیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ پس عورت کی بابت ان کے اشعار دورِ جاہلیت کے شعرا جیسی حلاوت و شیرینی سے عاری ہیں۔

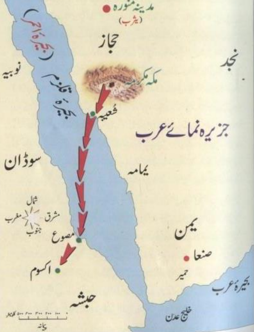
حضرت محمد ﷺ شاعر نہیں تھے کہ خدیجہؓ کی شان میں شعر کہتے، لیکن ایک بدوی عرب کی طرح طبیعت کی تمام زیبائیوں کو ان کے وسیلے سے اور انھی میں دیکھتے تھے۔ پچیس سال میں وہ ایک بار بھی دوسرے نکاح کی فکر میں مبتلا نہ ہوئے۔

حضرت خدیجہؓ ایک بیوی ہی نہیں تھیں، بلکہ آپ ﷺ کی سچی مشیر بھی تھیں اور جب کبھی محمد ﷺ نے اپنے کاموں کی بابت ان سے رجوع فرمایا، خدیجہؓ نے اپنی صوابدید کے مطابق بہترین مشورہ دیا اور بہت سے مواقع پر تو حضرت محمد ﷺ نے ان کے مشورے پر عمل بھی فرمایا۔ خدیجہؓ پہلی فرد ہیں جو آپ ﷺ پر ایمان لائیں، حالانکہ وہ ایک تاجرہ تھیں اور خرید و فروخت کے علاوہ دوسری طرف ان کی توجہ نہ تھی۔ پھر بھی اول روز جب محمد ﷺ نے فرمایا کہ میں پیغمبری پر مبعوث ہوا ہوں تو وہ ایمان لے آئیں اور تمام مال و دولت اسلام کی راہ میں خرچ کر ڈالا۔ جب خدیجہؓ نے وفات پائی تو دنیوی مال و دولت میں سے آپؐ کے پاس کچھ نہ تھا۔ مالی قربانی دو افراد نے سب سے بڑھ کر دی اور وہ ہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت ابوبکرؓ۔ قبل از اسلام یہ دونوں افرادِ مکہ کے ثروت مند ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن رحلت کے وقت کچھ بھی پاس نہ تھا، ان دونوں نے اسلام کی راہ میں اپنی ہستی مٹا دی تھی۔

ہم حضرت خدیجہؓ زوجہ محمد ﷺ کے متعلق (جنھوں نے ابتدائے اسلام سے پیغمبر ﷺ کی بہت زیادہ مدد کی) آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔ ابھی ہم ایک اور تاریخی اہمیت کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہے کچھ مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت۔

عمرؓ بن الخطاب مسلمان ہوئے تو انھوں نے نہ صرف اپنے گھر والوں کو دعوت اسلام دی، بلکہ قبیلہ عدی کے اور بہت سے افراد بھی مسلمان ہو گئے۔

قریش مسلمانوں کی روز افزوں تعداد کی وجہ سے وحشت زدہ ہو رہے تھے، مگر حمزہؓ اور عمرؓ



کی حمایت کی وجہ سے کسی کو محمد ﷺ کو ایذا پہنچانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس صورت حال میں قریش نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کو ایک ہی ہلّے میں (قرآن نے اسے فتنے کا نام دیا ہے) اسلام سے دور کردیں۔

زیادہ تر مسلمان جو اسلام لائے تھے وہ سابقین الاوّلین کی سی استقامت نہ رکھتے تھے، بالخصوص حضرت محمد ﷺ کی سی استقامت کہ شدائد کا مقابلہ کرسکیں۔ قبائل قریش اب مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ دکھ اور تکلیف پہنچانے لگے، جس کے لیے نیا طریقہ یہ اختیار کیا کہ انھوں نے پابندی لگادی کہ کوئی فرد مسلمانوں سے نہ تو خریداری کرے اور نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت کرے۔ مسلمانوں سے رشتے ناطے بھی نہ کریں۔ مکّہ کی سرزمین میں کہ جہاں ذریعۂ معاش فقط تجارت ہے، اس پابندی نے مسلمانوں کی زندگی مفلوج کر کے رکھ دی۔ کچھ مسلمان جو تازہ اسلام کے دائرے میں آئے تھے، حالات کا مقابلہ نہ کرسکے اور انھوں نے اسلام کو چھوڑ دیا۔ حضرت محمد ﷺ کو فکر لاحق ہوئی مگر فوری طور پر چارہ نہ تھا۔ اور یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اس اقتصادی بائیکاٹ کے دباؤ کے باعث کچھ اور مسلمان دین اسلام کو چھوڑ دیں۔

ان حالات میں حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کے متعلق وہ فیصلہ کیا جو آج تک کسی پیغمبر نے اپنے پیروکاروں کے لیے نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ خود تو مکّہ میں رہیں گے چاہے قتل کردیے جائیں لیکن مسلمانوں کو حبشہ بھیج دیا جائے۔

حبشہ میں ان دنوں جو بادشاہ حکومت کررہا تھا اس نے مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ فقط شرط یہ تھی کہ کوئی بھی مذہب دوسرے مذاہب یا مذہب کی مزاحمت یا مخالفت کا باعث نہ ہو۔ محمد ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکّہ چھوڑ کر حبشہ چلے جائیں اور اس وقت تک وہیں رہیں جب تک کہ مکّہ کے حالات مسلمانوں کے لیے سازگار نہ ہوجائیں۔ پیغمبر ﷺ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ اس طریقے سے روانہ ہوں کہ قریش کو خبر نہ ہو۔

محمد ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر اجتماعی حیثیت میں سفر کرو گے تو لامحالہ قریش کو خبر ہوجائے گی۔ لہٰذا تم کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں حبشہ جانا ہوگا تا کہ قریش یہ نہ جان سکیں کہ ہمارا

قصد ہجرت ہے۔ پہلے گروپ میں مکّہ سے حبشہ ہجرت کرنے والے افراد مندرجہ ذیل تھے:

(۱) جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کی اہلیہ اسماؓ جنھوں نے بعد میں کشتی میں سوار ہو کر بحیرہ قلزم کو عبور کیا اور حبشہ پہنچیں۔ اسی مناسبت سے انھیں "بحریہ" نام دیا گیا یعنی "بحر پیما عورت" (ابو طالب کے دو بیٹے تھے ایک علیؓ جن کو حضرت محمد ﷺ اپنے فرزند کی طرح رکھتے تھے۔ بعد میں اپنی بیٹی فاطمہؓ کو ان کے عقد میں دیا۔ دوسرے جعفرؓ تھے جنھیں حضرت محمد ﷺ کے چچا عباس نے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ بڑے ہونے پر ان کا حضرت اسماءؓ سے عقد ہوا۔ (۲) عثمانؓ بن عفان جو حضرت محمد ﷺ کی صاحبزادی رقیہؓ کے شوہر تھے۔ ابولہب کے بیٹے سے طلاق ہونے کے بعد عثمانؓ بن عفان نے ان سے عقد کر لیا تھا۔ (۳) زبیرؓ بن العوام (۴) عبداللہؓ بن مسعود (۵) عبدالرحمٰنؓ بن عوف (۶) ابوحذیفہؓ بن عتبہ (۷) سہلہؓ دختر سہیل بن عمرو (۸) مصعبؓ بن عمیر (۹) ابوسلمہؓ بن عبدالاسد اور ان کی اہلیہ اُمِ سلمہؓ دختر ابی امیہ (۱۰) عثمانؓ بن مظعون (۱۱) عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی اہلیہ لیلیٰؓ دختر ابوحثمہ (۱۲) حاطبؓ بن عمر (۱۳) سہیلؓ بن بیضا۔ اس گروہ کے یہ افراد چپکے چپکے مکّہ سے باہر نکلے، سمندر کے کنارے اکٹھے ہو کر کشتی میں سوار ہوئے اور حبشہ کی راہ لی۔ مسلمانوں کا یہ پہلا دستہ تھا جس نے حبشہ کا سفر کیا۔ ان کے بعد کئی اور گروپ بھی حبشہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔

میں نے بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ جعفرؓ بن ابی طالب دوسرے گروپ میں تھے نہ کہ پہلے میں، لیکن اپنی جگہ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ حبشہ میں داخلے کے بعد جب بھی حبشہ کے بادشاہ سے مسلمانوں کے مذاکرات ہوئے جعفر بن ابی طالب ہی مسلمانوں کی نمائندگی فرمایا کرتے تھے۔ جب پہلا گروپ حبشہ کی حدود میں داخل ہو کر پایہ تخت حبشہ میں پہنچا تو اسماءؓ زوجہ جعفرؓ بن ابی طالب ملقب بہ "بحریہ" کے ہاں بیٹا متولد ہوا اور اسی دن شاہ حبشہ کے ہاں بھی لڑکا پیدا ہوا۔ حضرت اسماءؓ نے خود کو اس کی پرورش کے لیے پیش کیا اور عرب دستور کے مطابق شاہ حبشہ کا لڑکا اور جعفرؓ بن ابی طالب کا بیٹا رضاعی بھائی ہو گئے۔

دستۂ اوّل و دوم کے بعد بھی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا، حتیٰ کہ حبشہ میں مسلمانوں کی

تعداد ایک سو نو ہو گئی ۔تب جا کر قریش کو خبر ہوئی کہ مسلمان تو حبشہ ہجرت کر گئے ہیں۔ جماعتِ قریش نے عمرو بن العاص اور عمارۃ بن ولید پر مشتمل ایک سفارت بادشاہ حبشہ کی خدمت میں بھیجی کہ بادشاہ سے اجازت لے کر مسلمانوں کو واپس مکّہ لے آئیں۔

عمرو بن العاص اور عمارۃ بن ولید دونوں شاہِ حبشہ (نجاشی) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عمرو بن العاص نے عرض کی: "اے بادشاہِ حبشہ! جن لوگوں کو آپ نے پناہ دی ہے یہ بڑے فاسد لوگ ہیں۔ اپنے اجداد کے مذہب سے منحرف ہو چکے ہیں۔ ہمارے اجداد کو برا کہتے ہیں۔ ہمارے اجداد کے عقیدے کو باطل گردانتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے آبا باطل کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ اے بادشاہِ حبشہ! جن لوگوں کو تم نے پناہ دی ہے، کل کو یہ آپ کی قوم کے مذہب کو بھی تبدیل کر دیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ انھیں ہمارے سپرد کر دیں تا کہ ہم انھیں مکّہ واپس لے جائیں اور ان کے خاندان والوں کو واپس کریں کیوں کہ ان کے خاندان والوں کا یہی مطالبہ ہے"۔

بادشاہ (نجاشی) نے مسلمانوں کو حاضری کا حکم دیا۔ مسلمان حاضر ہو گئے تو بادشاہ نے ان سے کہا: یہ دو افراد مکّہ سے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم لوگ مجرم ہو اور تمھیں مکّہ واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ نیز یہ کہتے ہیں کہ تمھارے خاندان والے تمھاری واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تم ان کے الزامات کے جواب میں کیا کہتے ہو؟

جعفرؓ بن ابی طالب ایک قدم آگے بڑھے اور کہا: "اے بادشاہِ حبشہ! ان دو افراد سے پوچھیے کہ کیا ہم نے مکّہ یا عربستان کے کسی حصے میں چوری کی ہے، کوئی قتل کیا ہے یا کوئی اور ایسا فعل جس سے کسی کو اذیت یا نقصان پہنچا ہو ہم سے سرزد ہوا ہے"؟

بادشاہ نے دونوں سے پوچھا۔ انھوں نے جواباً کہا: "نہیں، ایسا نہیں ہوا"۔

جعفرؓ دوبارہ بولے: "اے بادشاہِ حبشہ! ہم ماضی میں بت پرست تھے۔ ہماری عمریں لہو ولعب میں گزرتی تھیں۔ ہم میں ہر قسم کی شہوت رانی ہوتی تھی۔ ہم دوسروں پر ستم روا رکھتے تھے یہاں تک کہ ایک پیغمبر محمد ﷺ بن عبداللہ ہم میں سے مبعوث ہوئے اور انھوں نے فرمایا:

"بت پرستی ترک کر دو۔ آپ ﷺ نے ہماری خدائے واحد کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہمیں تعلیم دی کہ بتوں کی پوجا نہ کرو۔ شہوت پرستی چھوڑ دو۔ کمزوروں پر ظلم مت کرو۔ ہم ان پر ایمان لے آئے ہیں، اور یہ دو آدمی جو ہمیں واپس لے جانے کے لیے آئے ہیں، بت پرست ہیں۔ یہ پتھر اور لکڑی کے بتوں کو پوجتے ہیں۔ کمزوروں پر ستم روا رکھتے ہیں اور جس دن سے حضرت محمد ﷺ پیغمبری پر مبعوث ہوئے ہیں، یہ دونوں اور دوسرے قبیلہ قریش کے افراد ہر وقت محمد ﷺ کو پتھر مارتے اور برا بھلا کہتے ہیں"۔

بادشاہ حبشہ نے طرفین کو سن کر حکم دیا کہ تحائف جو یہ دونوں لائے ہیں، واپس کر دیے جائیں۔ مزید کہا کہ جن لوگوں نے میری مملکت میں پناہ لی ہے وہ میرے عقیدے کے بہت نزدیک ہیں۔ وہ بھی میری طرح خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ میں انھیں ملک بدر نہیں کروں گا کہ یہ انھیں دکھ پہنچائیں۔ جب یہ دونوں بادشاہ کا حکم سن کر واپس چلے گئے تو شاہ حبشہ نے جعفرؓ بن ابی طالب سے پیغمبر ﷺ اسلام پر نازل شدہ اللہ کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی۔

جعفرؓ نے نجاشی اور دوسرے حاضرین کے سامنے قرآن کی وہ آیات پڑھیں جو آج قرآن کی انیسویں سورۃ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان آیات میں حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کو برحق بتایا گیا ہے۔ نجاشی جو کہ عیسائی تھا، ان آیات کو سن کر رونے لگا۔ حاضرین بھی رو دیے۔ بادشاہ حبشہ نے کہا: "تمھارا پیغمبر ایک مردِ بزرگ اور سچا ہے۔ تم جب تک چاہو میرے ملک میں رہ سکتے ہو، کوئی شخص تمھیں اس ملک سے نہیں نکالے گا"۔

مسلمان جو ہجرت کر کے حبشہ پہنچے تھے، بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قریش کی طرف سے انھیں کوئی خطرہ نہیں رہا تھا لیکن کچھ دوسرے مسائل سر اٹھانے لگے۔ اس جماعت میں سے ایک فرد نے جب عیسائیوں کے عظیم الشان کلیسا دیکھے تو متاثر ہو کر مسیحیت قبول کر لی۔ یہ عبید اللہ بن جحش تھا جو اپنی بیوی اُم حبیبہؓ کے ساتھ ہجرت کر کے آیا تھا۔ اُم حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی تھی۔

عبید اللہ اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک حنیف تھا، یعنی اس نے اپنی عمر حقیقت کی جستجو

میں گزاری تھی۔ جب اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی تو وہ مسلمان ہوگیا، لیکن حبشہ آنے کے بعد وہ عیسائیوں کے بڑے بڑے کلیسا دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور اس نے دینِ اسلام کو چھوڑ دیا۔

جب قریش کو معلوم ہوا کہ کچھ مسلمان حبشہ چلے گئے ہیں تو انھوں نے بقایا مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا اور زندگی ان پر تنگ کر دی۔ اشرافِ مکّہ جب کسی مسلمان سے ملتے تو اسے سرزنش کرتے، حقیر جانتے اور کہتے: تمھیں شرم نہیں آتی آباؤاجداد کے مذہب کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے آبا کے عقیدے کو تم نے باطل ٹھیرایا ہے۔ تم کیسے اس زمین پر زندہ ہو جب کہ تمھارے آبا نے لات، منات اور عزیٰ کے ساتھ عقیدت پر جان دی۔ یہ تینوں کعبے کے بڑے بت تھے اور اعرابِ مکّہ کی اکثریت ان سے عقیدت رکھتی تھی۔ ابوجہل کی کوشش ہوتی کہ ان الفاظ سے مسلمان افراد کے عقیدے کو متزلزل کر دے اور وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں۔

وہ تاجر مسلمانوں سے جا کر کہتا کہ آج کے بعد کوئی شخص تم سے خریداری نہیں کرے گا اور تمھارے ہاتھ کچھ فروخت نہیں کرے گا۔ تمھارے مقروض تمھارا قرض واپس ادا نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کے لیے قریش نے جو سزا تجویز کی، وہ یہ تھی کہ مسلمانوں سے کسی قسم کا لین دین حرام ہے۔ ان کا مال غصب کرنا جائز ہے اور ہر وہ شخص جس نے مسلمانوں کا قرض دینا ہے وہ نہیں دے گا۔

یہ ایک تاجر ہی جان سکتا ہے کہ اس پابندی سے ایک سوداگر پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تمام مسلمان حضرت محمد ﷺ کا سا حوصلہ اور مقاومت نہیں رکھتے تھے کہ خدا کی راہ میں اس اقتصادی شکنجے کو برداشت کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے کئی ایک متزلزل ہو گئے اور وہ اشخاص جو ایمان لائے مگر عوام الناس میں شمار ہوتے تھے یعنی اپنے دفاع کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ابوجہل انھیں اس قدر کوڑے مارتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے۔ اس طریقے سے قریش نے لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر دی۔ اور جو لوگ اسلام لانا چاہتے تھے یا اسلام کی طرف مائل تھے وہ رک گئے۔

مکّہ کے تاجروں میں سے فقط ایک ابوبکرؓ ایسے تھے جو علانیہ محمد ﷺ کی طرف داری

کرتے تھے۔ جماعتِ قریش نے ان کے تمام اعتبارات کو ساقط کر دیا تھا اور وہ لوگ جن کے ذمہ ابوبکرؓ کی رقوم واجب الادا تھیں، ادائیگیاں نہیں کر رہے تھے۔ لیکن یہ تمام اقدامات بھی ابوبکرؓ کو متزلزل نہ کر سکے اور وہ محمد ﷺ سے وفاداری میں ثابت قدم رہے۔ بغیر کسی لالچ اور ریا کے اپنی تمام باقی ماندہ جائداد وقفِ اسلام کر دی۔ لوگ جو مکّہ سے حبشہ ہجرت کرتے، آپ (ابوبکرؓ) ان کو سفر خرچ ادا کرتے۔ اسلام کے اوّلین دنوں میں تنہا حضرت ابوبکرؓ اسلام کے خزانہ دار تھے۔ خزانہ داروں کو تو آمدنی بھی جماعتی ذریعوں سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ خزانہ دار تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے بغیر کسی واپسی کی امید کے۔

ابوبکرؓ حبشہ نہیں گئے تھے، اس لیے کہ آپ محمد ﷺ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ جس دن سے ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا تھا، حضرت محمد ﷺ کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت محمد ﷺ کو اطلاع ملی کہ اگر ابوبکرؓ مکّہ سے ہجرت نہ کر گئے تو قریش انھیں قتل کر دیں گے، لہٰذا آپ ﷺ نے ابوبکرؓ کو مکّہ سے چلے جانے کو کہا۔ اس حکم پر ابوبکرؓ بہت آزردہ ہوئے اور یمن کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا۔

ابوبکرؓ خاموشی سے مکّہ سے نکل کر جنوبی عربستان کی طرف چل دیے۔ مسافرت کے دوران ان کا ایک ایسے خطے سے گزر ہوا جہاں ایک بہت بڑا قبیلہ آباد تھا۔ قبیلے کے رئیس رفاعی نے جب یہ سنا کہ ابوبکرؓ نے مجبوراً مکّہ کو ترک کیا ہے تو بہت حیران ہوا۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ ابوبکرؓ مکّہ کے ایک بہت بڑے تاجر اور قریش کے سرداروں میں سے تھے بڑے تعجب سے ابوبکرؓ سے پوچھا: اے ابوبکرؓ! تم کیا کوئی جرم کر کے اپنے شہر سے بھاگے ہو؟

ابوبکرؓ نے فرمایا: میں نے دینِ اسلام کو قبول کر لیا ہے۔ اس لیے قریش مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ میں اپنی جان کی حفاظت کے لیے مکّہ سے خارج ہوا ہوں۔

رفاعی نے ابوبکرؓ سے کہا: میں خود تمھیں مکّہ واپس لے جاؤں گا اور قریش کو خبردار کر دوں گا کہ میں نے ابوبکرؓ کو اپنی حمایت (جوار) میں لے لیا ہے۔ پھر قریش کو یہ ہمت نہیں ہوگی کہ تمھیں آزار پہنچا سکیں۔

رفاعی نے ایسا ہی کیا۔ ابوبکرؓ کو مکّہ لے جا کر قریش کے سامنے اعلان کر دیا کہ ابوبکرؓ میرے جوار میں ہے اور حقِ جوار سے مکمل طور پر استفادہ کرتا ہے، لہٰذا جس کسی نے اس پر ہاتھ اُٹھایا اس کا معاملہ مجھ سے ہوگا۔ حقِ جوار عرب کی ایک سنت تھی کہ کوئی قبیلہ کسی غیر فرد کی حمایت کرتا تو اعلان کرتا تھا کہ یہ شخص میرے جوار میں ہے۔ پھر اگر کوئی اسے آزار پہنچاتا یا قتل کرتا تو قاتل قبیلے سے مواخذہ جوار میں لینے والا قبیلہ کرتا تھا۔

رفاعی کا قبیلہ ایک جنگجو قبیلہ تھا۔ اس کے تمام افراد اسلحے سے لیس تھے اور مکّہ کے قرب و جوار میں ہی آباد تھے۔ قریش کی جماعت نے اس خوف سے کہ قبیلہ رفاعی سے مڈبھیڑ نہ ہو، ابوبکرؓ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

ابوبکرؓ کو جب مکّہ کے لوگوں سے تحفظ مل گیا تو آپ نے پروگرام بنایا کہ اپنے گھر میں مسجد تعمیر کریں۔ مسجد تعمیر کی اور ہر شب اس مسجد میں بلند آواز سے قرآن خوانی شروع کر دی۔ جہاں تک تاریخی شواہد سے ثابت ہے، ابوبکرؓ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے ان حالات میں بلند آواز سے تلاوت فرمائی۔ پیشتر ازیں مسلمان تلاوت دھیمی آواز میں کیا کرتے تھے کیوں کہ انھیں دشمنوں کا خوف ہوتا تھا۔ اب ابوبکرؓ کو ایک قبائلی سردار رفاعی کی حمایت حاصل تھی۔ آواز بھی ان کی بڑی دلنشیں تھی۔ بڑی اونچی آواز میں قرآن پڑھا کرتے۔ تمام وہ لوگ جو عربی زبان سے آشنا ہیں جانتے ہیں کہ قرآن اشعار پر مشتمل نہیں لیکن کچھ آیات بالخصوص چھوٹی سورتیں جو مکّہ میں نازل ہوئیں مثلاً سورۃ الاخلاص (قل ھواللّٰہ احد)، سورۃ اللھب، سورۃ الکافرون، سورۃ الکوثر، سورۃ القریش، سورۃ الفیل، سورۃ الھمزہ، سورۃ العصر، تکاثر، القارعہ، زلزال، العلق، التین، الم نشرح، الضحیٰ، اللیل، الشمس، البلد، الفجر، الغاشیہ، الاعلیٰ، الطارق، البروج، الانشقاق، الانفطار۔ یہ تمام سورتیں جو مکّہ میں نازل ہوئیں، ان کی آیات وزن رکھتی ہیں اور ان کا قافیہ بھی ایک ہے۔

یہ آیتیں جو مکّہ میں نازل ہوئی تھیں آیاتِ مسجع ہیں۔ ابوبکرؓ انھیں خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور ہر شخص جو ابوبکرؓ کے گھر کے قریب سے گزرتا ٹھیر جاتا اور توجہ سے سنتا۔ بدوی اعراب

کی یہ کمزوری ہے کہ کلام جو ترنم سے پڑھا جائے، خصوصاً شعر، اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ یورپ کا ایک مفکر جس نے عربوں کا مطالعہ کیا ہے، بدوی عربوں کی طبیعت پر چار چیزوں کو حاوی گردانتا ہے: اوّل شتر، دوم خیمہ، سوم شمشیر، چہارم شعر۔

شعر یعنی کلامِ موزوں، مسجع، مقفّی، بدوی عرب کے لیے ایسا ہی جزوِ زندگی ہے جیسے شتر، خیمہ، شمشیر، اور اگر یہی کلام ترنم سے پڑھا جائے تو بدوی عرب کو بلاشبہ مجذوب کر دیتا ہے۔ پہلا آہنگ جو بدوی عربوں نے شعر کے لیے ایجاد کیا وہ ''حدی'' تھا۔ ''حدی'' دورانِ سفر شتربان کے اونٹ کی چال سے ہم آہنگ شعر پڑھنے کا نام تھا۔ جب انسان صحرا میں اونٹ کی پیٹھ پر سفر کرتا ہے تو ان ایام میں جب گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے اور لُو سفر نہیں کرنے دیتی، اونٹ کی چال میں تکان پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے لیے خستگی کا باعث ہوتی ہے۔ سوار کے عضلات میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جس سے تھکاوٹ کا احساس بہت بڑھ جاتا ہے۔ بدوی عرب جب اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا صحرا کی راہ لیتا اور شعر پڑھتا ہے یعنی اونٹ کی ایک سی چال کے سبب وہ اپنی آواز کو اونٹ کے قدموں کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے تو یہ آہنگ ''حدی'' یا شتربانوں کا آہنگ ہے۔

اعرابِ بادیہ ابتدا میں صرف اس لیے آہنگ (حدی) میں شعر پڑھتے تا کہ تھکاوٹ کا احساس نہ ہو لیکن انھیں محسوس ہوا کہ اس آہنگ میں شعر پڑھنے سے اونٹ جو قطار میں سفر کر رہے ہوتے، اپنے سروں کو بلند کر لیتے اور ان کی تھکاوٹ ختم ہو جاتی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ آواز (حدی) اونٹ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ آج بھی چودہ سو سال پہلے کی طرح یہ آہنگ (حدی) راہ پیمائی کے دوران اونٹوں کے لیے مؤثر ہے۔ اونٹ وجد و نشاط میں آجاتے ہیں۔ میں نے خود اس موضوع کا صحرا میں سفر کر کے جائزہ لیا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج جب کہ صحرا میں دن رات ہوائی جہاز محوِ پرواز ہیں، تیل کی پائپ لائنیں جا بجا بچھی ہوئی ہیں، عرب دولت مند ہو گئے ہیں، امریکی کاریں ان کے استعمال میں ہیں، ہنوز حدی خوانی کی رسم جب کہ اونٹوں کی قطار صحرا میں محوِ سفر ہو، متروک نہیں ہوئی۔

جب رات کی تاریکی چھا جاتی، مکّہ میں خاموشی طاری ہونے لگتی، لوگ اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے تو ابوبکرؓ بلند و دل نشین آواز کے ساتھ قرآن خوانی شروع کر دیتے۔

ایک مؤرخ ابنِ ہشام لکھتا ہے: ہر آدمی گھر واپس جاتے ہوئے ابوبکرؓ کے گھر کے عقب میں رک جاتا اور آیاتِ قرآنی کو بغور سنتا۔ بعض اوقات لوگوں کا اجتماع اس قدر بڑھ جاتا کہ گلی میں سے گزرنا محال ہو جاتا۔

جماعتِ قریش نے یہ سب دیکھ کر رفاعی کے پاس چند تحائف کے ساتھ پیغام بھجوایا: ''تو نے ابوبکرؓ کو اپنی حمایت (جوار) میں لیا ہوا ہے۔ اس سے کہو کہ اونچی آواز میں قرآن خوانی نہ کیا کرے۔ قرآن خوانی کے وقت لوگ اس کے گھر کے عقب میں جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ مکّہ کا اجتماعی نظام خراب کر رہا ہے''۔

رفاعی نے تحائف قبول کر لیے اور پیغام وصول کرنے کے بعد ابوبکرؓ کو کہلوا بھیجا: ''تم اونچی آواز میں قرآن خوانی نہ کیا کرو۔ اگر تم نے یہ وطیرہ جاری رکھا تو میں ناچار حمایت (جوار) واپس لے لوں گا اور پھر تمھیں میرے قبیلہ کی حمایت حاصل نہیں ہوگی''۔

ابوبکرؓ نے واپسی پیغام بھجوایا کہ: ''میں اپنے دین سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ بلند آواز میں پڑھنے سے جو لذت مجھے حاصل ہوتی ہے، اسی سے تو میری زندگی ہے۔ اور اگر تو چاہتا ہے کہ حمایت (جوار) واپس لے لے تو تجھے یہ حق حاصل ہے۔ میں اس کے بعد محمد ﷺ کی طرح خود کو خدا کی حمایت (جوار) میں دے دوں گا''۔



شعب ابی طالب

ورقہ بن نوفل (جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے) نے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے کہا تھا: ''کاش! جب وہ تمھیں قبیلہ سے طرد کریں گے، اس وقت میں مر نہ چکا ہوں''۔ یہ کلمات ورقہ نے ۶۱۰ء میں محمد ﷺ سے کہے تھے اور اس کی یہ پیش بینی ۶۱۶ء میں حقیقی صورت میں سامنے آئی۔

قریش کی جماعت نے جب دیکھا کہ قبیلہ بنی ہاشم (یعنی محمد ﷺ کا اپنا قبیلہ) محمد ﷺ کی حمایت سے دستکش نہیں ہوتا اور ہم اسے قتل نہیں کر سکتے تو محمد ﷺ اور تمام مسلمانوں کو مکّہ سے طرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب بھی کوئی ریفارمر اپنی قوم کی اصلاح کے لیے نیا پروگرام لاتا ہے جس سے سینکڑوں ہزاروں سال پرانے رسوم و رواج کو بدل دینا چاہتا ہے تو سوسائٹی کے ایک بڑے طبقے پر اس کی زد پڑتی ہے جو کہ اس نظام سے کئی طرح کے فوائد حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طبقے کے لوگ جب اپنے وجود کو خطرہ میں پاتے ہیں تو اس شخص (ریفارمر یا مصلح) کی راہ حتی الامکان روکتے ہیں۔ اسے جیلوں میں ڈالتے ہیں یا قتل کر دیتے ہیں۔

جس وقت بادشاہِ حبشہ نے جماعتِ قریش کے سفیروں کو نامراد واپس کر دیا اور مسلمانوں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، عین اس وقت مکّہ میں حضرت محمد ﷺ کا نفوذ بڑھ رہا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر قریش نے محمد ﷺ اور تمام مسلمانوں کو مکّہ سے نکال باہر کرنے کا انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا اس اقدام سے اسلام کی مکمل طور پر جڑ اکھیڑ دی جائے گی، لہٰذا اس بارے میں ایک اعلان خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کیا گیا کہ ''محمد ﷺ اور ان کے پیروکار ناپاک ہیں اور آج سے وہ مکّہ سے طرد کیے ہوئے شمار ہوں گے''۔

یہ اعلان ایک فرمان کی حیثیت رکھتا تھا جسے ان دنوں صحیفہ کہا جاتا تھا۔ اس کا مکمل متن

مندرجہ ذیل ہے:

۱- مکّہ کے کسی فرد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ کسی مسلمان (بزرگ، بچہ، مرد یا عورت) سے گفتگو کرے۔

۲- مکّہ کے کسی فرد کو یہ اجازت نہیں کہ کسی مسلمان کے جسم کو چھوئے (یعنی مصافحہ کرے) اور اگر کسی نے ایسا فعل کیا تو وہ بھی پلید شمار ہوگا۔

۳- مکّہ کے کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی قسم کی کوئی چیز کسی مسلمان سے خریدے یا اس کے ہاتھ فروخت کرے۔

۴- مکّہ کا کوئی فرد مجاز نہیں کہ کسی مسلمان کے ہاں شادی کرے یا مسلمان کو لڑکی دے۔

۵- مکّہ کا ہر وہ آدمی جو کسی مسلمان کا مقروض ہے وہ قرض کی رقم واپس نہیں کرے گا۔

یہ مقررات اس وقت تک کے لیے لاگو رہیں گے جب تک محمد ﷺ اپنے دین کو چھوڑ نہ دے یا بنو ہاشم اس کی حمایت ترک نہ کر دیں یا قبائل قریش اس کو قتل نہ کر دیں۔

۶۱۶ء میں حضرت محمد ﷺ اور تمام مسلمانوں کو مکّہ سے خارج کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے خروج کے وقت بنی ہاشم محمد ﷺ کی حمایت سے دستبردار نہ ہوئے تھے، لہٰذا ان تمام نے بھی مکّہ کو محمد ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ترک کیا۔ حالانکہ وہ بُت پرست تھے۔ ابوطالب کی غیرت اور حمیت نے برداشت نہ کیا کہ اپنے بھتیجے کو اس مشکل وقت میں اکیلا چھوڑ دیں، حالانکہ وہ خود اسلام قبول نہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔

محمد ﷺ کے قبیلے بنی ہاشم کے اس فیصلے پر صرف ایک آدمی نے عمل نہ کیا اور وہ ابولہب تھا جس نے اہل مکّہ کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے مکّہ کو ترک نہ کیا۔ دوسرے بھی افراد، قبیلہ سے پیوستگی کی وجہ سے مکّہ کو چھوڑ کر شعب میں جو کہ ابوطالب سے متعلق تھی، سکونت پذیر ہوئے..... شعب کیا ہے؟ اس کے لیے قدرے توضیح کی ضرورت ہوگی۔

لغت میں شعب کے معنی ہیں وہ شگاف یا درہ جو پہاڑ کے اندر ہو۔ مجازی معنی میں پہاڑ

کی گھاٹی۔ قریش کے بھی قبائل جو مکّہ میں سکونت پذیر تھے، ایک ایک شعب مکّہ سے باہر پہاڑوں میں رکھتے تھے۔ پہاڑوں سے مراد اطراف مکّہ کے کم مرتفع پہاڑ ہیں جنھیں ہم ٹیلے کہتے ہیں۔ لیکن عرب انھیں کوہ (جبل) پکارتے ہیں۔

جب بھی کوئی بیرونی شخص ان دس قبائل میں سے کسی ایک کی پناہ مانگتا تو وہ قبیلہ اسے اپنی پناہ میں لے کر شعب میں رکھتا تھا، اس لیے کہ بدوی عربوں میں یہ رسم نہ تھی کہ ایک خارجی یا بیگانہ (پناہ گزین) کو جزو افرادِ قبیلہ تصور کریں۔ ایک خارجی کبھی بھی رکنِ قبیلہ نہیں بنایا جاتا تھا، لہٰذا اسے قبیلے کے اندر زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

صحرا میں ہر قبیلہ اپنے خیمے مخصوص طرز پر لگایا کرتا تھا۔ اگر پہاڑ کی چوٹی سے ایک شخص نگاہ کرے تو اس طرز و ترتیب سے فوری سمجھ جائے گا کہ رئیس قبیلہ کا خیمہ کون سا ہے۔ رئیس قبیلہ کا خیمہ ہمیشہ وسط میں ہوتا اور دائیں بائیں اس کے بیٹوں، بھائیوں، بیٹیوں اور دامادوں کے خیمے بالترتیب نصب ہوتے تھے اور اگر کوئی رئیس قبیلہ کے خاندان کا دور کا عزیز ہوتا تو وہ ان سب کے خیموں کے پاس اپنا خیمہ لگاتا۔ شعب کا بہر حال اس ترتیب سے کوئی تعلق نہیں۔

شعب ابوطالب اگرچہ پہاڑ کی گھاٹی میں ایک گھر تھا۔ لیکن وہ تو غریب الوطن اور پناہ گزینوں کے لیے بنایا گیا تھا، نہ کہ اس مقصد کے لیے کہ ابوطالب یا اس کا قبیلہ خود اس میں رہے۔ شعب ابوطالب والا گھر ساری جمعیت کے لیے کافی نہیں تھا اور شعب کے اطراف میں ٹیلے اور درّے تھے۔

عرب کے کچھ شعرا نے اطراف مکّہ (اراضی) کی توصیف کی ہے۔ ہم جانتے ہیں مکّہ کی سرزمین خشک اور بنجر ہونے کی وجہ سے آج تک کسی اقتصادی تبدیلی کا باعث نہیں بنی، بجز تیل کی دریافت کے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سرزمین کس ہیئت کی تھی یا آج ہے۔

مکّہ کی اراضی اور اطراف کے ٹیلوں پر درخت تو کجا گھاس کے ایک تنکے تک کا وجود نہیں تھا۔ صرف تختہ ہائے سنگ تھے جو دن کو خورشید کی حرارت اس شدت سے منعکس کرتے کہ کوئی چیز دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ سارا سال کوئی پرندہ نظر نہیں آتا تھا، اس لیے کہ پرندوں کا رہنا وہاں

ہوتا ہے جہاں سبزہ اور پانی ہو۔ آج مکّہ میں پانی قدرے زیادہ ہوگیا ہے اور شہر کے چند مقامات پر درخت اور سبزہ بھی اگایا گیا ہے لیکن اگر آپ شہر سے ذرا دور ہوں تو وہی خشک سنگلاخ ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ اور مسلمان جب شعب میں وارد ہوئے تو وہ زیادہ سامان خورونوش اپنے ساتھ نہیں لے جا سکے تھے، اس لیے کہ یہ نقل مکانی ناگہانی اور ہنگامی طور پر ہوئی تھی۔ اور بفرضِ محال اگر زیادہ سامانِ خورونوش ساتھ لے بھی جاتے تو وہ کب تک ساتھ چلتا۔ صحیفۂ قریش میں درج پابندی کہ کسی شخص کو اختیار نہیں کہ کوئی چیز مسلمانوں کے ہاتھ بیچے، یہ بھی ایک وجہ تھی کیوں کہ مسلمان مکّہ کے لوگوں سے خریداری نہیں کر سکتے تھے۔

مسلمانوں نے اس شعب میں خوفناک ترین بھوک برداشت کی۔ اس حالت سے ان کے زندہ بچ رہنے کا فقط ایک ہی سبب تھا اور وہ تھے ماہ ہائے حرام۔ ان چاروں مہینوں میں جنگ و جدل بند ہوتی تھی، اس لیے مسلمان شہر چلے جاتے تھے اور قافلوں سے خورونوش کی اشیا خرید لیتے تھے۔

مسلمانوں کے شعب ابی طالب کے قیام کے دوران ایک بار خدیجہؓ کے بھتیجے نے ایک بوری کھانے پینے کی اشیا اپنی چچی اور حضرت محمد ﷺ کے لیے بھجوائیں۔ واضح رہے کہ خدیجہؓ بھی محمد ﷺ کے ساتھ ہی تھیں۔ قریش کے افراد اس بات کی نگرانی کر رہے تھے کہ بنی ہاشم کو کوئی چیز بھی کسی طرف سے نہ بھجوائی جا سکے۔ لہٰذا وہ سامان چھین لیا اور لانے والے کو اس قدر زدوکوب کیا کہ تین دن بعد تک اس کے زندہ بچنے کی امید نہ تھی۔

ان تین برسوں میں مکّہ کے بعض بزرگوں نے مصالحت کی کوششیں کیں اور قریش پر زور بھی دیا کہ وہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے تابعین کے مکّہ واپس آجانے پر رضامند ہو جائیں۔ قریش جواب میں یہی کہتے رہے کہ محمد ﷺ اپنے دین سے صرف نظر کریں تو شہر واپس آسکتے ہیں۔ ہم کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ماضی کی طرح اپنی زندگی بسر کریں۔

حضرت محمد ﷺ اگر ایک بے ارادہ انسان ہوتے تو اپنے مذہب سے صرفِ نظر کر جاتے،

چاہے جز وقتی ہی سہی، اور حالات کے بدلنے پر پھر تبلیغ شروع کر دیتے۔ لیکن وہ مومن مرد تھے۔ ان کا ایمان پختہ تھا۔ خدا کے رسول ﷺ دین سے صرفِ نظر نہیں کیا کرتے اور ہر امر اور اُمورِ رسالت میں ظاہر و باطن کو ایک جیسا رکھتے ہیں۔ عارضی یا وقتی طور پر بھی اس کی نفی نہیں کیا کرتے۔

آپ ﷺ نے مصلحت سے کام نہ لیا۔ تین سال کی مدت پہاڑ کی گھاٹی میں بھوک سے گزار دی۔ حتیٰ کہ بھیڑ بکری کی کھال کے ٹکڑے اُبال کر کھانے کی نوبت بھی آئی۔ مگر خود اپنی رسالت کا انکار نہ کیا اور نہ متردد ہوئے۔ یہ شعب ابی طالب میں تین سال کا عرصہ آپ ﷺ کے لیے ایک اور آزمائش تھا مگر آپ ﷺ اس سے سرخرو نکلے۔ بھوک کی سختی اور رنج انھیں متزلزل نہ کر سکے۔

شعب کے اندر تین سال کے عرصے میں مسلمانوں کے پاس کوئی گھریلو سامان اور برتن بھی نہ تھے۔ حضرت خدیجہؓ کے پاس ایک ہنڈیا اور ایک کوزہ تھا۔ ایک دن کوزہ ٹوٹ گیا، نیا نہیں لایا جا سکتا تھا۔ چند دن صبر کیا حتیٰ کہ وہاں سے ایک برتن جوڑنے والا گزرا۔ حضرت خدیجہؓ نے شکستہ کوزہ برتن جوڑنے والے کو دیا کہ جوڑ دے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ شعب میں تین سالہ نظربندی کی زندگی یا مجبوراً قیام ان حالات سے نمٹنے کے لیے جو بعد میں درپیش تھے، ایک تربیتی کیمپ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ دور جملہ مسلمانوں کے ارادوں میں بے پناہ پختگی پیدا کر گیا اور وہ جان گئے کہ آئندہ حالات کا انھیں کس طرح مقابلہ کرنا ہے۔

شعب میں بھوک کے دائمی رنج کے علاوہ ایک اور دکھ دیکھنا پڑا، وہ یہ کہ خدیجہؓ مسلسل بھوک، تنگ دستی اور مشقت کی وجہ سے بیمار ہو گئیں۔ ان کے علاج کے لیے نہ دوائی تھی نہ غذا۔ لہٰذا پیغمبرِ اسلام کی اہلیہ محترمہ ۶۱۹ عیسوی میں اس دنیا سے کوچ فرما گئیں۔ مسلمان اس سال کو "عام الحزن" یعنی غم کا سال کہتے ہیں۔

جس وقت خدیجہؓ نے وفات پائی ان کی عمر پینسٹھ (۶۵) سال تھی اور حضرت محمد ﷺ اس وقت ۵۰ سال کے ہو چکے تھے۔ حضرت محمد ﷺ مسلسل دو دن خدیجہؓ کی وفات پر آبدیدہ رہے اور زندگی کے آخری لمحے تک جب کبھی خدیجہؓ کی یاد آتی آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔

ایسی وفا کیشی کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ ایک نوجوان مرد ایک عورت کو جو اس سے پندرہ سال عمر میں زیادہ ہو ایسا عزیز رکھتا ہو کہ زندگی کے آخری لمحہ تک اسے فراموش نہ کر سکے۔ اس تمام ازدواجی زندگی کے دوران باوجود اختلافِ عمر کے محمد ﷺ اور خدیجہؓ میں کبھی کوئی اختلاف رونما نہ ہوا اور اس پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں وہ ایک محب اور محبوب کی طرح جیے۔

جب خدیجہؓ شعب میں وفات پا گئیں تو مسلمانوں کے پاس کفن تک نہیں تھا۔ خدیجہؓ کو ان کی صوقعہ ہی میں دفن کیا گیا۔ صوقعہ (بروزنِ حوصلہ) ایک بڑی سی اوڑھنی ہوتی تھی جسے عرب عورتیں سر پر اوڑھتی تھیں۔ ہمسرِ پیغمبرِ اسلام اپنی اوڑھنی ہی میں دفن کی گئیں۔

خدیجہؓ بڑے مضبوط ارادے والی تھیں۔ ان کی مالی مدد اسلام کے لیے خاصی تقویت کا باعث ہوئی۔ شروع کے برسوں میں جب کہ حضرت محمد ﷺ کے پاس کچھ نہ تھا، انھوں نے ہی مدد کی۔ اس دور میں وہ محمد ﷺ اور اسلام کی تنہا غم خوار تھیں۔ ہر روز حضرت محمد ﷺ جب زخمی گھر آتے، خدیجہؓ آپ کے زخموں کو دھوتیں۔ پٹی باندھتیں، لباس تبدیل کرواتیں، تسلی دیتیں اور دل داری فرماتیں۔

خدیجہؓ کی وفات کے دو روز بعد مسلمانوں کو دوسرا صدمہ پہنچا یعنی ابوطالب، پیغمبر ﷺ اسلام کے چچا، فوت ہو گئے۔ ان کی عمر اس وقت ۸۶ چھیاسی سال کی تھی۔ وہ بھی خدیجہؓ کی طرح شعب میں مسلسل فاقوں کی وجہ سے بیمار ہوئے، دوا دارو نہ ہونے کی وجہ سے بیماری کی حالت میں اس جہان کو خیر باد کہا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابوطالب مسلمان نہ ہوئے اور آخری وقت تک اجداد کے مذہب پر قائم رہے۔ جب ابولہب کو خبر دی گئی کہ تمھارا بھائی شعب میں حالتِ مرگ میں ہے تو وہ فوراً وہاں پہنچا اور ابوطالب کی پائنتی کی جانب کھڑے ہو کر کہا: قسم کھاؤ کہ تم نے دینِ محمدؐ کو قبول نہیں کیا اور یہ کہ تم اجداد کے دین پر مر رہے ہو؟ ابوطالب نے قسم کھائی کہ میں نے محمدؐ کے دین کو قبول نہیں کیا اور اجداد کے دین پر اس جہان سے کوچ کر رہا ہوں۔

اگر خدیجہؓ اور ابوطالب آپ ﷺ کے ساتھ شعب میں نہ جاتے تو ممکن تھا اس روز و شب کی فاقہ مستی سے نہ گزرتے اور کچھ زیادہ زندہ رہتے۔

خدیجہؓ کی پیغمبرِ اسلام کے لیے فداکاری اتنی تعجب خیز نہیں کیوں کہ وہ ان کے شوہر تھے لیکن ابوطالب کی اپنے بھتیجے کے لیے فداکاری حیرت انگیز اور ساتھ ہی ساتھ قابلِ ستائش بھی ہے، اس لیے کہ ابوطالب اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے، باوجود اس کے انھوں نے اپنی جان بھتیجے کے لیے فدا کر دی۔

بدوی عربوں میں عصبیت بہت زیادہ تھی، چنانچہ یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ ایک رئیس قبیلہ مثل ابوطالب ایک ایسے شخص کی خاطر جس کی پیغمبری کا وہ معتقد ہی نہیں، مکّہ کی شہری زندگی کو ترک کر دے اور اس سنِ کہولت میں شعب کی فاقہ زدہ زندگی بسر کرے، محض اس لیے کہ قبیلے کا ایک فرد بدونِ پشت پناہ نہ رہ جائے۔

ابوطالب کی وفات کے بعد قبیلہ کو دوسرا رئیس چننا تھا۔ قاعدے اور ضابطے کے مطابق ابوطالب کے بھائی ابولہب کو قبیلے کا رئیس منتخب کیا گیا یعنی اس کو جو پیغمبرِ اسلام ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

قضا و قدر کے اپنے کام ہوتے ہیں۔ جب ابوطالب فوت ہوئے، قریش کے لوگوں نے دیکھا خانہ کعبہ میں فرمان (صحیفہ) کو دیمک چاٹ گئی ہے اور اس کا صرف ایک کلمہ باقی رہ گیا ہے اور وہ کلمہ تھا ''......اس گھر کے مالک تیرے نام''۔ گھر سے مراد خانہ کعبہ اور مالک سے مراد خداوند یعنی مطلب یہ ہوا کہ خانہ کعبہ کا مالک (جیسے کوئی انسان اپنے گھر کا مالک ہو) جماعتِ قریش احکام از طرف مالکِ خانہ کعبہ صادر کیا کرتی تھی۔ آس پاس کے گرم علاقوں کی نسبت دیمک تمام عربستان میں بہت زیادہ ہے۔ کاغذ اور لکڑی دیمک کی مرغوب غذا ہے۔ آج بھی مکّہ میں اگر آپ ایک کتاب کو کچھ مدت کے لیے ایک جگہ پڑا رہنے دیں تو آپ دیکھیں گے کہ جلد کے سوا باقی کچھ نہیں بچا۔ دیمک تمام صفحات کو چٹ کر گئی ہے۔

جماعتِ قریش نے جب دیکھا کہ دیمک نے صحیفہ کا تمام مضمون جو محمد ﷺ اور پیروانِ محمد ﷺ کو طرد کرنے کے بارے میں تھا، کھا لیا ہے لیکن اسمِ صاحب خانہ کو نہیں چھیڑا تو ان کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا۔ اس واقعہ کی طرف ان کی توجہ اس وقت ہوئی جب ابوطالب فوت ہوئے اور ابولہب رئیس قبیلہ بنی ہاشم منتخب ہوا۔

ابولہب رئیس قبیلہ منتخب ہوا تو ریاست کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں اس کے اپنے قبیلہ نے اس سے کہا کہ محمد ﷺ کی حمایت کرو تاکہ وظیفۂ ریاست کی ادائیگی میں رخنہ نہ پڑے۔

جماعتِ قریش کے دلوں میں بھی فرمان کو بجز اسم صاحب خانہ کے دیمک کے چاٹ جانے سے خوف گزرا، لہٰذا جب ابولہب نے کہا کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی شعب کو چھوڑ کر مکہ واپس آجائیں تو جماعتِ قریش مزاحم نہ ہوئی۔ پس تین سال بعد مسلمان مکہ شہر میں دوبارہ داخل ہوئے۔

ظاہر ہے کہ اس مدت میں مسلمان سوداگروں کا بہت نقصان ہوا تھا۔ ان کے کاروبار تباہ ہو کر رہ گئے تھے اور وہ بالکل نادار ہو گئے تھے۔ ابوبکرؓ کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کی دولت باندازۂ قارون تھی مگر ان کے پاس بھی صرف پانچ ہزار درہم باقی بچے تھے۔

جب مسلمان شعب سے واپس آئے تو مسلسل فاقوں کی وجہ سے ان کے چہروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ انتہائی لاغر اور کمزور ہو چکے تھے اور دھوپ کی وجہ سے ان کی جلد سیاہ ہو چکی تھی۔

ابولہب سے لوگوں نے پوچھا کہ تُو تو محمد ﷺ کے سخت دشمنوں میں سے تھا، تو کیسے راضی ہوا کہ وہ شعب سے واپس جائے۔ ابولہب نے کہا: میں رئیس قبیلہ ہوں۔ اس کی حمایت مجھ پر واجب ہے لیکن میں اس کے دین کی مخالفت کروں گا۔ میری حمایت اس وقت تک ہوگی جب تک وہ (محمد ﷺ) قبیلے سے خیانت نہیں کرتا۔ اور اگر اس محمد ﷺ نے قبیلے سے خیانت کی تو اسے طرد کر دوں گا۔ میں ابوطالب کے مثل نہیں ہوں کہ شعب میں بھی محمد ﷺ کے ساتھ چلا جاؤں اور محمد ﷺ کی حمایت کرتا ہی چلا جاؤں۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ابولہب نے جو حضرت محمد ﷺ کا مخالف تھا، آپ ﷺ کو طرد کرنے کا بہانہ پیدا کر لیا جس کے اثرات محمد ﷺ کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔

واقعہ اس طرح ہے کہ ایک دن ابولہب نے قبیلہ ہاشم کے مردوں کو بشمول محمد ﷺ دعوت پر اپنے گھر بلایا، چنانچہ حضرت محمد ﷺ بھی تشریف لائے۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو ابولہب آپ ﷺ سے مخاطب ہوا اور کہا کہ میں تم سے ان سب کی موجودگی میں عبدالمطلب (جدامجد) کے متعلق تمھارا نظریہ جاننا چاہتا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ مشرک جہنم میں

جائیں گے۔ اب تم بتاؤ عبدالمطلب ہمارے جدامجد جہنم میں جائیں گے یا بہشت میں؟

حضرت محمد ﷺ نے اس کے جواب میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۴ کو پڑھا: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ "پیغمبر ﷺ اور دوسرے لوگ جو ایمان لے آئے ہیں یعنی مسلمان ہو گئے ہیں، خداوند سے مشرکوں کے لیے مغفرت طلب نہ کریں۔ خواہ وہ مشرکین پیغمبر اور مسلمانوں کے خویش (رشتہ دار) ہی کیوں نہ ہوں، اُن کے متعلق یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ بلاشبہ وہ دوزخی ہیں"۔ [توبہ ۹: ۱۱۳]

تمام مسلمان علما یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس آیت اور آیت مابعد کے مطابق اگر مسلمان کو علم ہو کہ نزدیک ترین عزیز مشرک ہے تو اس کی مغفرت کے لیے خداوند سے دعا نہ کرے، کیوں کہ مشرک کے لیے کوئی معافی نہیں، وہ یقیناً جہنم کا ایندھن ہے۔

پھر ابولہب نے اپنے بھائی ابوطالب کے متعلق پوچھا: اس کی بخشش ہے یا نہیں؟

محمد ﷺ نے فرمایا: جب ابوطالب نے اس جہان سے رحلت فرمائی، وہ ایمان نہیں لائے تھے اور اپنے اجداد کے دین کو نہیں چھوڑا تھا۔ ابولہب نے چند اور افراد کے نام لیے جو ابولہب اور محمد ﷺ کے اجداد میں سے تھے اور پوچھا: یہ جنتی ہیں یا نہیں؟

محمد ﷺ نے پھر وہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ یہ حکم قطعی ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں۔ چند لمحے سکوت رہا۔ سبھی خاموش اور محمد ﷺ کے کلام سے متحیر تھے۔

بدوی عربوں کے نزدیک اجداد کی بہت زیادہ قدر و منزلت تھی۔ اجداد کو عرب قبائل میں محترم شمار کیا جاتا تھا۔ بلکہ اہل عرب کے تمام قوانین اور رسوم و آداب کا سرچشمہ ان کے اجداد تھے۔ جب کبھی کسی قضیے کا تصفیہ نہ کر پاتے تو وہ اجداد کی روش کی طرف رجوع کرتے کہ انھوں نے اس طرح کے متشابہ مسائل میں کیا حل پیش کیا ہے۔ اجداد کو جھٹلانا ان کی بے حرمتی شمار ہوتا تھا۔ اسے عربوں کے رسوم و قوانین سے انکار مطلق تصور کیا جاتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ محمد ﷺ ایک جدید دین لائے تھے اور عربوں کو اس دین کو قبول کرنے کی

دعوت بھی دی جا رہی تھی۔ لیکن آج تک ان کے اجداد کو اس صراحت سے جھٹلایا نہیں گیا تھا اور اس محفل میں تو ہاشمی قبیلے کے تمام اجداد کو صریحاً جھٹلایا گیا تھا۔

حضرت محمد ﷺ ایک عرب تھے اور ڈپلومیسی سے نابلد۔ پیغمبر ﷺ اسلام اپنے عقیدے کا برملا اظہار کرتے تھے۔ انھیں کسی کا پاسِ خاطر نہیں ہوتا تھا۔ کوئی رنجور ہو یا شاداں۔ دنیا کی قدیم اقوام میں سے کسی کا بھی لب ولہجہ بدوی عربوں کی طرح صریح نہیں تھا۔ عرب جو کچھ کہتا خالصتاً وہی اس کا اندازِ فکر ہوتا تھا۔ وہ اپنی زبان پر اپنے افکار کے علاوہ کچھ لا ہی نہیں سکتا تھا۔ آج کی دنیا میں صراحتاً بیان کرنا عیب سمجھا جاتا ہے کیوں کہ صدیوں کی تربیت نے ہمیں اس کا عادی کر دیا ہوا ہے کہ ہم اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے موقع پر دوسروں کے جذبات اور اقدار کا خیال رکھیں اور الفاظ کچھ اس طرح زبان پر لائیں کہ کسی سے براہِ راست ٹکراؤ نہ ہو اور کوئی مخالفانہ تاثر نہ لے۔

جب ہم زبان سے یا قلم سے اپنے خیالات بیان کرتے ہیں تو کئی ایک کلمات (جن میں عورت و مرد کے بعض اعضا بھی شامل ہیں) زبان پر نہیں لاتے اور بیان میں استعارہ کا سہارا لیتے ہیں۔ برعکس اس کے اعرابِ بادیہ ان کلمات کو زبان پر لاتے تھے اور قرآن میں بھی وہ کلمات ہیں اور بعض بدوی عرب قبیلہ کا نام بعض اعضا پر رکھتے تھے۔ جو لوگ عربی زبان جانتے ہیں، وہ مطلع ہیں کہ گزشتہ ادوار میں عرب قبائل اپنے نام مرد کے اعضائے بدن کی مناسبت سے رکھتے تھے۔

جب محمد ﷺ نے قبیلہ ہاشم کے اجداد کو تمام سرکردہ افراد کی موجودگی میں جھٹلایا تو ابولہب نے جو رئیس قبیلہ تھا، حاضرین سے مشورہ مانگا کہ کیا اب میں محمد ﷺ کو قبیلے سے طرد کروں یا نہ!

سب حاضرین نے تائید کی اب ابولہب کو یہ حق حاصل ہے کہ محمد ﷺ کو قبیلے سے طرد کردے کیوں کہ ضابطے کے مطابق اس (محمد ﷺ) نے ان سب کو گناہ گار اور ناقابلِ بخشش کہا تھا۔

ابولہب نے کہا: ٹھیک ہے میں اسے قبیلے سے طرد کرتا ہوں۔ مجلس ختم ہوگئی اور لوگ منتشر ہوگئے۔

پہلی بار جو محمد ﷺ کو طرد کیا گیا، وہ قبائل قریش کا اقدام تھا نہ کہ خود ان کے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کا۔ اسی وجہ سے قبیلے کی حمایت برقرار رہی تھی اور ابوطالب بھی شعب میں چلے گئے اور وہیں وفات پائی تھی۔ لیکن اس دفعہ خود قبیلہ بنی ہاشم نے کہا کہ محمد ﷺ کو قبیلے سے نکال باہر کرو۔ جس گھڑی رئیس قبیلہ بنی ہاشم نے طرد کا ارادہ کیا اسی لمحہ محمد ﷺ کی سماجی حیثیت تبدیل ہوگئی اور انھیں قبیلے کے قانونی تحفظ سے محروم کر دیا گیا۔ یعنی محمد ﷺ نے چونکہ قبیلے کے دستورِ اساسی کی مخالفت کی، لہٰذا وہ دستور اس کی حمایت نہیں کرتا اور اسے اپنے دائرے سے خارج قرار دیتا ہے۔

مطرود (قبیلے سے خارج) ہونے کے بعد محمد ﷺ کی حیثیت ان لوگوں سے بھی زیادہ خراب ہوگئی جنھیں انقلاب فرانس میں اشتہاری قرار دیا گیا تھا، اس لیے کہ ان کے قضیے کی سماعت اور سزا فقط انقلابی عدالتوں کے اختیار میں تھی۔ اس کے برعکس مکّہ میں جب کبھی کسی کو قبیلے سے نکالا جاتا تھا، اس کا خون ہر ایک کے لیے مباح ہو جاتا۔ کوئی بھی شخص اسے قتل کر سکتا تھا۔ پکڑ کر بیچ سکتا تھا یا اسے اپنا غلام بنا سکتا تھا، حتیٰ کہ ایک مطرود کو زندہ بھی جلا دیا جاتا تھا تو جلانے والے کو نہ مجرم گنا جاتا نہ مستوجبِ سزا۔ قصہ کوتاہ جو آدمی قبیلے سے مطرود ہوتا تھا، اس کی کوئی حقیقت، کوئی وقعت نہیں رہتی تھی۔

پرانے وقتوں میں ہندستان (اب بھارت) کے شودر طبقے سے جو سلوک روا رکھا جاتا تھا اور اب بھی جس سلوک کی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے، عرب کے مطرود افراد سے بہرحال بہتر تھا، اس لیے کہ شودروں کا معاشرتی اور مجلسی مقاطعہ تھا لیکن وہ بھوکوں نہیں مرتے تھے۔ انھیں کام کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ وہ روٹی کما کھاتے تھے۔

ابولہب نے جو محمد ﷺ کو طرد کیا یعنی یک لخت آپ ﷺ کو زندہ لوگوں کی فہرست سے خارج کر کے بیابان خشک و غیر ذی زرع کے سپرد کر دیا تو طرد ہونے کے بعد محمد ﷺ یکسر تنہا رہ گئے تھے۔

بیتے دنوں میں جب کبھی روحانی یا جسمانی زخم پہنچتے تو حضرت خدیجہؓ زخموں کو دھوتی

تھیں، پٹی باندھتی تھیں، روحانی آلام کا مداوا کرتی تھیں۔ چچا ابوطالب پشت پناہی اور دلداری کیا کرتے تھے لیکن اب تو نہ حضرت خدیجہؓ تھیں اور نہ ابوطالب۔

پیغمبر ﷺ نے خود کو کلی تنہا پایا تو وہ ایک بار پھر متوسل خداوند ہوئے اور خدا سے دعا کی: ''اے اللہ! مجھے اپنی پناہ میں لے لے''۔ اور اس مرتبہ خداوند نے نہ صرف آپ ﷺ کو اپنی حمایت و پناہ میں لے لیا بلکہ آپ ﷺ کو اپنے پاس بلایا۔ پیغمبر ﷺ اسلام زمین سے آسمان پر گئے۔ مسلمان اس سفر کو ''معراج'' کہتے ہیں۔



معراج کی علمی توضیح کیا ہے؟

پیغمبر ﷺ اسلام کے معراج کے واقعے پر اپنے نظریے کا اظہار کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو اس بابت تذکرہ کیا ہے اس کا خلاصہ عرض کر دوں!

یہ خلاصہ ابنِ ہشام، بخاری، حمید اللہ، سہیلی، طبری، کتانی اور اسد بیگ کی کتابوں سے ماخوذ ہے: وہ لکھتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ماہِ رجب میں پیش آیا۔ رجب قمری سال کا ساتواں مہینہ ہے۔

حضرت محمد ﷺ رات کو آسمان پر تشریف لے گئے اور وہ رات ماہِ رجب کی ستائیسویں رات تھی۔ مسلمانوں کی روایات کے مطابق محمد ﷺ کے اس آسمانی سفر کے جس کو معراج کہا جاتا ہے، دو مراحل تھے۔ پہلا مرحلہ مکّہ سے بیت المقدس تک کا سفر اور دوسرا مرحلہ بیت المقدس سے آسمانوں کا سفر۔

مسلمان تذکرہ نویس اس رات کے کچھ واقعات خود آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

اس رات میں مکّہ میں سویا ہوا تھا۔ دیکھتا ہوں کہ گھر کی چھت میں شگاف پڑ گیا ہے اور اس شگاف سے جبریلؑ تشریف لائے۔ انھوں نے میرے سینے کو چاک کیا۔ آبِ زم زم سے دھویا۔ بعد ازاں ایک صراحی لائے کہ پُر از حکمت تھی۔ جو کچھ اس میں تھا نکال کر میرے سینے میں رکھا اور چاک بند کر دیا۔ میرے ہاتھ کو پکڑ کر کہا: ''اُٹھو''۔ اور پھر مجھے براق پر سوار کیا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے حرکت کرتا تھا۔ جب میں اس پر سوار ہوا تو میری حالت نیم بیداری اور نیم خوابی کی سی تھی۔

جب آپ ﷺ براق پر سوار ہو گئے تو وہ چل پڑا اور شہر ہبرون (الخلیل) میں توقف کیا، اس لیے کہ ابراہیمؑ کی قبر وہاں پر ہے۔ آپ ﷺ نے ابراہیمؑ کی قبر پر دعا مانگی۔

پیغمبر ﷺ اسلام دعا کے بعد پھر سوار براق ہوئے تو وہ چل پڑا اور اس مرتبہ بیت اللحم میں ٹھیرا کہ یہ مقامِ تولدِ مسیحؑ ہے۔ وہاں بھی دعا مانگی اور پھر سوار براق ہوئے۔ اس دفعہ براق نے بیت المقدس میں جا توقف کیا۔

یہاں حصہ اوّل مسافرت یعنی مسافرت خاکی کا خاتمہ ہوا اور حصہ دوم یعنی مسافرت آسمانی مسجد الاقصیٰ سے شروع ہوئی۔ (مسجد الاقصیٰ بیت المقدس میں واقع ہے)۔

اس سے قبل کہ محمد ﷺ اس رات آسمان کی طرف سفر شروع کریں، آپ ﷺ نے قبۃ الصخرہ کی چٹان پر اپنے پاؤں کا نشان چھوڑا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ابراہیمؑ کے پاؤں کا نشان مقام ابراہیم (مکہ) پر رہ گیا ہوا ہے۔

محمد ﷺ براق پر سوار آسمان کی طرف چل دیے اور پہلے آسمان پر پہنچے جو تمام آسمانوں کی نسبت نزدیک ترین آسمان ہے۔ آسمانِ اوّل پر محمد ﷺ حضرت آدمؑ سے ملے اور مشاہدہ کیا کہ آدمؑ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان ہیں جو زمین سے آئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک گروہ آدمؑ کے دائیں طرف اور دوسرا گروہ بائیں طرف ہے۔ جو داہنی طرف والے تھے ان کا شمار بہشت میں جانے والوں میں ہوتا تھا اور جو بائیں طرف والے تھے وہ جہنم میں جانے والے تھے۔

آدمؑ بالآخر انسان تھے جب راست والوں کو دیکھتے تو تبسم فرماتے اور جب چپ والوں کو دیکھتے تو رونے لگتے اس لیے کہ آدمؑ تمام افراد کے باپ ہیں۔ ایک باپ کی طرح بچوں کی خوشی پر خوش اور ان کی بدبختی اور بدحالی پر غمزدہ ہوتے۔

حضرت محمد ﷺ آسمانِ اوّل سے گزر کر آسمان دوم پر پہنچے۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات کے بعد آپ ﷺ نے تیسرے آسمان کی راہ لی۔ وہاں آپ ﷺ نے حضرتِ یوسفؑ کو موجود پایا۔ آپ ﷺ نے آسمان چہارم میں ادریسؑ اور آسمانِ پنجم میں ہارونؑ اور آسمانِ ششم میں حضرت موسیٰؑ کو دیکھا۔ آسمانِ ہفتم پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی۔ یہ بلند ترین آسمان ہے اور اس سے آگے کسی آسمان کا وجود نہیں۔

حضرت ابراہیمؑ ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ یہ گھر فرشتوں کا تھا اور معلوم ہوا اس گھر کا نقشہ خانہ کعبہ کے ہو بہو ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آسمانِ ہفتم کے بعد ایک منطقہ ہے مثلِ اطراف خانہ کعبہ یعنی حرم اور حرم کی انتہا پر سدرۃ المنتہیٰ کا وجود ہے۔ وہ ایک درخت ہے کہ اس سے آگے مجہول مطلق واقع ہوا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس درخت کے آگے وضع ملکوت کیسی ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ پر خدا نے بوسیلۂ جبریلؑ جناب محمد ﷺ سے گفتگو فرمائی اور کہا: میں جانتا ہوں تمھیں قبیلہ سے طرد کر دیا گیا ہے۔ تم حوصلہ رکھو اور جان لو کہ تم سے قبل بھی پیغمبر گزرے ہیں جنھوں نے تم سے زیادہ مصائب برداشت کیے ہیں۔ ان میں بعض شکنجوں پر کھینچے گئے اور مر گئے۔ پھر خداوند نے آپ ﷺ کے آئندہ فرائض کی بابت گفتگو فرمائی۔ کہا: جس طرح موسیٰؑ نے قوم کو اکٹھا کیا اور مصر سے ہجرت کی، اسی طرح تم بھی اپنے پیروؤں کو جمع کرو اور مکہ سے ہجرت کر جاؤ۔ فطری امر ہے کہ ایسے اقدام کے لیے ارادہ اور استقامت چاہیے۔ تمھارے ارادہ کو قوی کرنے اور تم میں استقامت بڑھانے کے لیے ہم تمھیں یہاں تک لائے ہیں۔

جب حضرت محمد ﷺ کو زمین پر واپسی کی اجازت ملی تو انھیں چودہ فرمان دیے گئے (موسیٰؑ کو دس فرمان عطا ہوئے تھے) اور انھیں مامور فرمایا کہ ان کی تبلیغ فرمائیں۔ یہ چودہ فرمان حسبِ ذیل ہیں:

۱- تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف خدائے واحد کی۔

۲- والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمھارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو۔ نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔ اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو: پروردگارا! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

۳- رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔

۴- فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچی کرنے والے لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

۵- اگر ان سے (یعنی حاجتمند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمھیں کترانا ہو اس بنا پر کہ تم بھی اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو انھیں نرم جواب دے دو۔

۶- نہ تو اپنا ہاتھ گریبان سے باندھ رکھو (بخل نہ برتو) نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو (فضول خرچ نہ بنو) کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے۔

۷- اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بہت بڑی خطا ہے۔

۸- زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بہت برا راستہ۔

۹- قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے۔ اس کی مدد کی جائے گی۔

۱۰- یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقہ سے یہاں تک کہ وہ شباب کو پہنچ جائے۔

۱۱- عہد کی پابندی کرو۔ بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔

۱۲- پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی بہتر ہے۔

۱۳- کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب کی ہی باز پرس ہوگی۔

۱۴- زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

حضرت محمد ﷺ نے واقعہ معراج کے بعد ان تمام لوگوں کا ذکر کیا جنھیں انھوں نے آسمانوں میں دیکھا تھا۔ سفر معراج میں محمد ﷺ نے آسمانوں میں نوع بشر کے تمام سرکردہ افراد کو دیکھا۔ محمد ﷺ نے ان اشخاص کو بھی دیکھا جو صاحب سیف و قلم تھے۔ محمد ﷺ نے تمام بڑے بڑے پیغمبروں اور عالموں کو جو زمانہ ہائے گزشتہ میں اس جہان سے رخصت ہو چکے تھے، آسمان میں دیکھا۔ یہ آپ ﷺ کے لیے ایک بہت بڑا موقع تھا کیوں کہ آپ ﷺ نے سب کو نزدیک سے دیکھا۔

یہ واقعہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) کے اُصولوں کے عین مطابق ہے جو کہ آج کل بہت معروف ہیں اور یہ موضوع کوئی بہت عجیب نہیں، اس لیے کہ ان اُصولوں کے مطابق دو انسانوں کو جن میں سے ایک ساکن اور دوسرا متحرک ہو، ''زمان'' ایک سا جلوہ نہیں دے گا۔ بنابراین یہ قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص گھر سے نکلے۔ آسمانوں کی سیر کے بعد واپس آئے اور ہنوز گھر کے کواڑ کی زنجیر ہل رہی ہو۔ اس مفروضہ میں خصوصیت سے اضافیت زمان (Relativity of Time) پر بہت زیادہ بحث ہو چکی ہے اور اس سے سب مطلع ہیں۔ ہم اس پر کچھ نہیں کہیں گے۔

علماءِ اسلام معراج محمد ﷺ کے متعلق دو نظریات کے قائل ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ خاکی جسم کے ساتھ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رُوح پرواز کر کے آسمانوں پر گئی۔ اور علمائے اسلام میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ ﷺ خواب کی حالت میں آسمان پر گئے اور رؤیا میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ وہ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ محمد ﷺ جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے، دلیل یہ دیتے ہیں

چونکہ آپ ﷺ پیغمبر تھے، یہ سب کچھ ممکنات میں سے ہے۔ مختصر یہ کہ آپ ﷺ قادر تھے یا آپ ﷺ کو یہ قدرت دی گئی کہ اسی جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر تشریف لائیں یا لے جائیں، حتیٰ کہ ساتویں آسمان سے بھی آگے چلے جائیں۔

دوسرے علما جو یہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے جسمِ خاکی کے ساتھ یہ سفر نہیں کیا اور پھر یہ لازم بھی نہیں تھا کہ آپ ﷺ جسمِ خاکی کے ساتھ آسمانوں کو تشریف لے جاتے۔ آپ ﷺ کا یہ روحانی سفر تھا۔ آپ ﷺ کی روح نے سفر کیا۔ ساتوں آسمانوں کو دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچی اور خداوند تعالیٰ سے گفتگو کی۔ ان علما کے عقیدے کے مطابق ہم بغیر اس کے کہ پیغمبر ہوں نیند کی حالت میں ایسی جگہوں پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان جگہوں کا ہم سے ہزاروں کلومیٹر فاصلہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو مردہ ہوتے ہیں۔ ہم خواب میں فقط ان مردہ لوگوں سے ملاقات نہیں کرتے جو ہمارے سامنے فوت ہوئے ہوں بلکہ ان سے بھی گفتگو ہوتی ہے جو صدیوں پہلے مر چکے ہوتے ہیں۔

ہم یہ جانتے ہوئے کہ یہ مر چکے ہیں ان مردوں سے گفتگو کرتے ہیں لیکن پھر بھی متحیر نہیں ہوتے۔ ہماری نظر میں یہ ایک عادی امر ہے۔ خواب میں ہم انھیں مردہ نہیں کہتے۔ جب ہم خواب دیکھتے ہیں ہمارا خاکی جسد ہچکولے نہیں کھاتا۔ اپنی اصلی حالت میں بستر پر پڑا رہتا ہے لیکن ہم ایک پر کی طرح سبک ہوتے ہیں۔ جہاں چاہیں جائیں۔ اس حالت میں قدیم قول کے مطابق روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے اور ہوا میں جولانیاں کرتی ہے۔ دور دراز شہروں کو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں سے جو ہم سے صدہا سال پہلے مر چکے ہوتے ہیں، رابطہ پیدا کرتی ہے اور خوشی محسوس کرتی ہے، اس لیے کہ اس ربط سے ہم ان لوگوں سے جو ہم سے قبل دُوسری مملکتوں میں زندگی بسر کر چکے ہوتے ہیں اور جو ہماری زبان نہیں سمجھتے اور ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے ہوتے گفتگو کرتے ہیں۔ زبان کا نہ جاننا مانع نہیں آتا۔ وہ ہماری زبان سمجھتے ہیں اور ہم ان کی۔ یا پھر ایسے ہے کہ روح بدن سے خارج نہیں ہوتی بلکہ خواب کی حالت میں ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ تمام حجاب ہماری آنکھوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ طویل

فاصلے چھوٹے ہو جاتے ہیں اور ہم خود کو ایک ایسا شخص محسوس کرتے ہیں جو ہر جگہ کو جانتا اور پہچانتا ہے اور ہر ایک سے آشنا۔

حالتِ بیداری میں ہمیں ایک چوڑی نالی کو پھلانگنا مشکل ہوتا ہے مگر حالت خواب میں درّوں کے اوپر سے پرواز کر جاتے ہیں۔ پہاڑوں پر سے گزر جاتے ہیں اور ہماری یہ پرواز ہماری نظر میں ایسے ہی ایک عادی امر ہوتی ہے جیسے شہر کی ایک سڑک کو عبور کر رہے ہوں۔ حالت خواب میں اُمورِ محال آسان اور عادی نظر آتے ہیں۔ ہم حالتِ خواب میں ایک ہی وقت میں اپنے گھر اور ہزارہا کلومیٹر دور کا بھی احساس کر سکتے ہیں۔

خواب کی حالت میں ہم وہ قوتیں ہوتے ہیں کہ ہم دوسروں کی زبان سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی زبان میں بات چیت کر سکتے ہیں اور اگر حالت خواب میں کسی غیر ملک کو جائیں تو ہر چیز کو آشنا تصور کرتے ہیں جیسے وہیں پیدا ہوئے ہوں اور وہیں نشوونما پائی ہو۔

ہم خواب میں، واقف کار، دوست اور دشمن بھی رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی حالتِ بیداری میں نہیں پہچانتے۔ لیکن جب سو جائیں تو خواب کی شگرفی دنیا میں وہ ہمارے اردگرد نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہم سے محبت کرتے ہیں اور کچھ وحشت انگیز ہوتے ہیں کہ ہم انھیں دیکھتے ہی چیخ اُٹھتے ہیں اور خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔

خوابوں کی دنیا میں ہم میں استقامت ہوتی ہے۔ آتش فشاں کے دہانے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دہانے سے واپس نکل سکتے ہیں اور جلتے بھی نہیں۔ اسی طرح خواب میں ہم قتل بھی کیے جاتے ہیں مگر زندگی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ خواب کی حالت میں وقت و زمانہ کی پیمائش کی حس زندہ ہوتی ہے۔ ہم خواب کے زمانے میں ساعت و روز کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہت سے اشخاص کو اتفاق ہوا ہوگا کہ انھوں نے رؤیا میں رات یا کسی دن خود کو کسی دوسرے ملک میں پایا ہوگا۔ اس ملک میں سالہا سال بسر کیے ہوں گے۔ کئی ایک حوادث پیش آئے ہوں گے اور ہر حادثہ ایک طویل مدت کے لیے ہوگا اور جیسے ہی وہ بیدار ہوں گے،

دیکھیں گے کہ یہ تو میں چند لمحے نیند کی حالت میں رہا ہوں۔ یہ تمام مسائل ثابت شدہ ہیں۔ زیادہ بحث کی احتیاج ہی نہیں۔ ہر شخص اپنی زندگی میں ان مسائل سے گزرا ہے اور جانتا ہے کہ رؤیا کی حالت میں "فاصلہ" کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ انسان آنِ واحد میں ہر جگہ ہوتا ہے۔ ہر چیز کو سن سکتا ہے۔ ہر غیر زبان کو سمجھ سکتا ہے اور ہر غیر زبان میں تکلم کر سکتا ہے۔

انسان حالتِ خواب میں ایسے ایسے آہنگ سنتا ہے کہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور بیداری میں ان کا سننا محال ہے۔ گویا یہ نغمے کسی دوسری دنیا سے کانوں تک پہنچے ہوں۔ بعض موسیقاروں نے انتہائی دلربا سر اور نغمے خواب کی حالت میں سنے اور بیدار ہو کر انھیں نوٹ کر لیا کہ بھول نہ جائیں۔

خواب کی دنیا میں ماضی، حال، مستقبل انسان کے لیے ایک ہی ہے۔ بعض اوقات اپنے میلانِ طبع کی بنا پر دو ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے اور کبھی ہزار یا دو ہزار سال آگے مستقبل میں چلا جاتا ہے اور گزرے ہوئے لوگوں سے یا جو ابھی تک اس دنیا میں آئے ہی نہیں، ان سب سے کلام کرتا ہے۔ بعض دانشور اپنے علمی مسائل کو حالت بیداری میں حل نہ کر سکے مگر حالتِ رؤیا میں وہ حل ہو گئے۔

دراصل بیداری کی حالت میں مغز پر کئی قسم کی قیود اور حجاب کا دباؤ ہوتا ہے جو آڑے آتا ہے مگر حالتِ خواب میں وہ دباؤ نہیں ہوتے۔ ان فوق العادہ نکات پر غور کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لینا کوئی مشکل نہیں اور یہ نتیجہ نکالنا بھی بعید از قیاس نہیں کہ محمد ﷺ پیغمبرِ اسلام جیسی شخصیت اس قابل ہوئی ہو کہ انھوں نے حالتِ بیداری میں اپنی رُوح کو اس جہان میں بھیج دیا جسے ہم اسے فقط رؤیا میں دیکھ سکتے ہیں؟

لیکن بعض اسلامی مفکر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کی صرف روح آسمانوں پر نہیں گئی تھی بلکہ آپ ﷺ کا جسمِ خاکی بھی فوق العادہ سرعت کے ساتھ آسمانوں پر گیا اور واپس آیا۔

اگر اس روایت کو زیرِ غور و فکر لایا جائے تو طبعیات (Physics) کی نظر میں دو حالتیں

سامنے آتی ہیں۔ ایک سرعت کا مسئلہ اور دوسرے یہ کہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جسدِ خاکی نور کی رفتار سے زیادہ یا اس کے مساوی سفر کر سکے۔

جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے سفرِ معراج میں محمد ﷺ کی سرعتِ مسافرت نور کی رفتار سے زیادہ تھی اور یہ رفتار تیزی میں تقریباً "سرعتِ کششِ ثقل" کے مساوی تھی کہ محمد ﷺ چند لمحوں میں فضائے بیکراں کے دور ترین نقطہ پر پہنچنے اور واپس آنے پر قادر ہوئے۔ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اس فضائے بیکراں کی وسعت (قطر) آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطابق تین ہزار ملین نوری سالوں پر مشتمل ہے یعنی اگر نور کی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہو اور فضائے بیکراں کے ایک طرف سے سفر شروع کیا جائے تو تین ارب سال بعد اس کی دوسری انتہا کو پہنچے گا۔

صرف ایک ہی ایسی سرعت کا وجود ہے جو "آنی" ہے اور ایک لمحے میں کائنات کی ایک طرف کی ابتدا سے دوسری انتہا تک اثر پذیر ہو جاتی ہے اور وہ ہے کششِ ثقل سے پیدا ہونے والی موجوں کی سرعت۔

اگر اس لمحہ کائنات کی انتہا پر ایک کہکشاں جس میں کہ کروڑوں خورشید ہیں، ناگہاں پھٹ جائے اور امواج میں تبدیل ہو جائے تو دنیا میں کششِ ثقل کا ردِ عمل اس طرح ظاہر ہوگا کہ اسی لمحہ نظامِ جہاں درہم برہم ہو جائے گا اور اگر اس طرح نہ ہوا تو اسی لمحہ جب وہ کہکشاں پھٹ کر امواج میں تبدیل ہوئی، ہمارا آفتابی نظام نابود ہو جائے گا۔

"قانون کششِ ثقل" جو کہ نیوٹن نے کشف کیا (حالانکہ یہ اس کا اپنا فکر نہیں تھا بلکہ اس نے پولش ماہرِ فلکیات کوپرنیکس کی تحقیقات سے استفادہ کیا تھا) اس کا اثر تمام جہان میں فوری ہے اور "کششِ ثقل کے ردِ عمل کی سرعت" آنی ہے۔

روایات کے مطابق اسلامی تذکرہ نویسوں نے جیسا کہ بیان کیا ہے محمد ﷺ کی سرعت مسافرت آسمانوں میں سرعت نور سے زیادہ تھی۔

ہاں اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ محمد ﷺ نے حالت بیداری میں روح کے ساتھ آسمانوں کا سفر

کیا تو پھر طبیعیات پر بحث کی مطلقاً ضرورت پیش نہیں آتی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے جسم خاکی کے ساتھ آسمانوں کا سفر کیا تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ آیا ایک جسم نور کی سی یا اس سے زیادہ رفتار پر سفر کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے؟ علم طبیعیات کہتا ہے کہ مادہ اس پر قادر نہیں ہے کہ سرعت نور کا متحمل ہو سکے مگر یہ کہ نور میں تبدیل ہو جائے اور نور کی انتہائی رفتار بھی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔



ایمان لانے والی مخلوق جو ظاہر نہ ہوئی

محمد ﷺ جب معراج سے واپس تشریف لائے تو خود کو اسی طرح دشمنوں میں گھرا ہوا پایا۔ اب یہ دشمن وہ تھے جنھیں آپ ﷺ کو قتل کرنے کا اختیار مل چکا تھا اور قصاص کا بھی کوئی خوف نہ تھا۔

اس موقع پر کچھ لوگ قبیلہ بنو حنیفہ سے برائے حج و عمرہ مکّہ آئے اور طائفہ قریش نے اس قبیلے کے ایک فرد سے محمد ﷺ کے قتل کا سودا ٹھیرایا۔ محمد ﷺ کو اس منصوبہ کا علم ہو گیا اور امرِ خداوندی بھی یہی تھا کہ مکّہ سے نکل جاؤ۔ آپ ﷺ رات کو مکّہ سے نکلے اور طائف کی راہ لی۔ طائف ایک شہر مکّہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ان دنوں اونٹ سے یہ مسافت دو روز میں طے کی جاتی تھی اور اگر خچر سے یہ سفر کیا جائے تو ایک دن میں طے ہو جاتا ہے۔

طائف سطح سمندر سے ایک ہزار آٹھ سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے، اس وجہ سے وہاں پانی بکثرت تھا اور بارش بھی ہوتی تھی۔ یہ شہر سرسبز و شاداب ہے اور مکّہ کے امیر لوگ اس شہر میں اپنا ایک ایک باغ رکھتے تھے۔

آج بھی جب انسان عربستان کے بیابانوں کو عبور کرتا ہوا طائف پہنچتا ہے تو اس کے بڑے بڑے باغوں کو دیکھتا اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضاؤں میں سانس لیتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ کسی اور دنیا میں آ گیا ہے۔

طائف کے لوگ ثروت مند تھے اور ان کا اصلی شغل سود خوری تھا۔ وہ روپیہ قرض پر چڑھاتے اور اپنی زمینوں کی کاشت کے لیے انھوں نے غلام رکھے ہوتے تھے۔

طائف کے لوگوں کا رواج یہ تھا کہ وہ گندم کی روٹی کھاتے تھے اور اسی بنا پر انھیں اونٹنی کے دودھ کو ایک مستقل غذا کے طور پر استعمال کی عادت نہ تھی۔

بدوی عرب جن کی غذا اونٹ کا دودھ تھی اور اب بھی ہے، جب کسی اونٹنی کا دودھ پیتے تھے تو بتا دیتے تھے کہ اس مادہ شتر کی عمر کیا ہے اور اس نے کون سی گھاس یا جڑی بوٹی کھائی ہے۔

میں نے خود ایک عرب بادیہ کو آزمایا، جو وہ دودھ پی رہا تھا، اس کی بابت دریافت کیا تو اس نے بغیر کسی تاخیر یا سوچ بچار کے مادہ شتر کی عمر کا تعین کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس (شتر) نے کس علاقے میں چرا ہے۔ صحرا کے مختلف علاقوں میں مختلف گھاس اور جڑی بوٹی ہوتی ہے اور دوسری جگھوں پر اس کا وجود نہیں ہوتا اور اعراب بادیہ مختلف مناطق کی گھاس اور جڑی بوٹیوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ طائف کے لوگ دولت مند ہونے کے باعث اپنا کچھ وقت ہنر اور علم و ادب کی تحصیل میں صرف کر سکتے تھے۔ شمالی جزیرہ نمائے عرب کا واحد طبیب طائف ہی میں رہتا تھا اور اس کا نام تھا حارث بن کلدہ۔ ایک مشہور مؤرخ ابن خلکان کہتا ہے: اس طبیب نے علمِ طب ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ ان دنوں طب ایرانی معروف تھی اور بڑے بڑے اطبا ان دنوں ایران میں ہی گزرے ہیں۔

شمالی جزیرہ نمائے عرب کا واحد منجم کہ علمِ نجوم کا ماہر اور ستاروں کی حرکات سے مطلع تھا، وہ بھی طائف ہی میں رہتا تھا اور اس کا نام تھا عمرو بن امیہ۔ طائف عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں ''دیوار''۔ یہ عربستان کا واحد شہر تھا جس کے اردگرد حصار تھا۔ اور اس دیوار کو عربوں نے تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ ایران کے ایک مہندس اور چند معماروں نے اس کی تعمیر کی تھی۔

طائف کے ایک شخص نے شاہِ ایران کی ایک خدمت بجالائی۔ شاہ ایران نے اس سے پوچھا: تمھیں کیا صلہ دوں؟ اس مرد نے کہا: آپ ہمارے لیے ایک مہندس اور چند معمار بھیج دیں تا کہ وہ ہمارے شہر (واج) کے گرد حصار تعمیر کر دیں۔ طائف میں جب تک حصار نہیں تعمیر ہوا تھا، اس کا نام واج تھا۔ حصار تعمیر ہونے کے بعد اس کا نام طائف ہو گیا۔ شاہِ ایران نے اس کی درخواست قبول کی اور شہر واج کے اردگرد حصار بنا دیا گیا۔

اس شہر طائف میں ایک پتھریلا ٹیلا تھا جس پر لات کا مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔ لات عربوں کے تین بڑے بتوں میں سے ایک تھا۔ ٹیلے اور اس کے اطراف کے علاقے کو ''بست'' کا نام دیا جاتا تھا اور کوئی شخص جو اس علاقہ میں داخل ہو جاتا چاہے وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو اس کا تعاقب نہیں کیا جاتا تھا۔

محمد ﷺ طائف پہنچنے کے بعد اپنے ایک عزیز کے گھر گئے۔ یہ عزیز عبدالمطلب کا چچیرا بھائی عبد یالیل تھا۔

جب اس شخص (عبد یالیل) نے سنا کہ محمد ﷺ تشریف لائے ہیں تو ان کی پذیرائی سے نہ صرف دست کش ہوا بلکہ اپنے چند غلاموں کو حکم دیا کہ جاؤ اور محمد ﷺ پر سنگ باری کرو۔ اسے معلوم تھا کہ محمد ﷺ کو قبیلہ قریش نے برادری سے نکال باہر کیا ہوا ہے۔ عبد یالیل کے غلاموں نے محمد ﷺ کا تعاقب کیا اور اس قدر پتھر مارے کہ محمد ﷺ ایک باغ میں درختوں کی اوٹ لینے پر مجبور ہو گئے اور عبد یالیل کے اوباش غلاموں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ غلام ان کی تلاش میں طائف کے گلی کوچوں میں چکر لگاتے رہے اور حضرت محمد ﷺ اسی باغ میں رہ گئے۔ یہ باغ مکہ میں رہنے والے دو بھائیوں کا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ محمد ﷺ کو پناہ دیں۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ پتھروں کی ضربات سے مجروح اور خون آلود ہیں تو انھوں نے آپ ﷺ پر رحم کھایا اور اپنے غلام سے جو کہ عیسائی تھا کہا کہ ایک خوشہ انگور آپ ﷺ کو دو کہ کھا لیں۔

غلام انگور کی بیل سے خوشہ توڑ کر محمد ﷺ کی طرف گیا اور خوشہ دیا کہ کھا لیں۔ آپ ﷺ نے کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھی۔ عیسائی غلام بڑا حیران ہوا اور کہا: اے زخمی! کیا تو عیسائی ہے؟

محمد ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ غلام نے کہا: یہ کلام جو تو زبان پر لایا ہے، یہ تو عیسائی کھانا شروع کرنے سے پہلے پڑھتے ہیں اور اگر تم عیسائی نہیں تو تم یہ کلمات زبان پر کیوں لائے ہو؟

محمد ﷺ نے فرمایا: میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ جس خدا نے مجھے مبعوث کیا وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی بنا پر یہ مجھے پتھر مارتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مجھے قتل کر دیں۔

غلام نے کہا: میں خدائے واحد کی پرستش کرتا ہوں اور عیسائی ہوں۔ پیغمبرِ اسلام اور عیسائی غلام (جس کا نام عداس تھا) میں رفاقت ہوگئی۔ اس نے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے کہا: یہ باغ جس میں تم پناہ گزین ہو، یہ مکّہ کے دو بھائیوں کا ہے۔ ایک کا نام عتبہ اور دوسرے کا نام شیبہ ہے۔ یہ دونوں ربیعہ کے فرزند ہیں جو قبیلہ قریش سے ہے۔ میرے آقا عتبہ نے مجھے تمھیں انگور کھلانے کا حکم دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ تمھیں اس باغ میں ٹھیرنے نہیں دے گا لہٰذا میں تمھیں آج رات اس باغ اور طائف سے اس طرح نکال لے جاؤں گا کہ وہ لوگ جو تمھیں قتل کرنے کے لیے گلی کوچوں میں گھات لگائے بیٹھے ہیں تمھیں نہ دیکھ سکیں گے۔

عداس عیسائی نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا۔ رات گئے وہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کو اس باغ سے اور پھر طائف سے باہر نکال لے گیا اور آپ ﷺ سے کہا: اے مردِ خدا! اس شہر سے دور چلا جا کیوں کہ یہاں تمھاری جان کو خطرہ ہے۔

محمد ﷺ نے طائف سے باہر آنے کے بعد مکّہ کی راہ لی یعنی پھر اسی شہر کی طرف چل دیے جہاں سے سفر کر کے آپ ﷺ آئے تھے۔ آپ ﷺ کے تمام اعضائے بدن پتھروں کی ضربات سے درد کر رہے تھے۔ بھوک اور پیاس بھی تھی لیکن درد، بھوک اور پیاس کو نظر انداز کر کے راہ چلتے رہے۔

ایک عرب بادیہ نشین کی جسمانی اور روحانی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ دکھ اور تکلیف پر صبر و تحمل کرتا ہے۔ اگر عرب صبر اور تحمل کے خوگر نہ ہوں تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ صحرا میں زندہ رہ سکیں۔ عربی کی مشہور ضرب المثل ہے کہ: الصبر مفتاح الفرج (صبر کشادگی کی کنجی ہے) یہ مثل عرب کے بادیہ نشینوں پر صادق آتی ہے۔ جب ایک عرب اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کی پہچان کر لیتا ہے، اس ضرب المثل کے مطلب سے پوری طرح آشنا ہو جاتا ہے اور اس پر عمل شروع کر دیتا ہے۔

عربستان میں جو لڑکے بھیڑ بکریاں چراتے ہیں وہ کبھی کبھی تو ایک ایک ماہ کے لیے بھیڑ

بکریوں کے ساتھ والدین سے بچھڑ جاتے ہیں اور اگر اس مدت میں بھیڑ بکریوں سے دودھ حاصل نہ ہو تو وہ بھوکے ہی رہتے ہیں۔

محمد ﷺ بیابان میں ایک جگہ بطنِ نخلہ میں سستانے ٹھیر گئے اور بڑی پرسوز آواز میں آیاتِ قرآنی کی تلاوت شروع کر دی۔ جنوں کا ایک گروہ تلاوت قرآن سے اس قدر متاثر ہوا کہ محمد ﷺ پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہوگیا۔ قرآن کی سورۃ الاحقاف کی انتیسویں آیت میں اس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے:

یعنی ''موقع آیا کہ ہم نے ایک گروہ جنوں کا تمھاری طرف موڑ دیا تا کہ قرآن کو سنیں اور جب وہ تمھارے نزدیک پہنچے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: چپ چاپ آرام سے سنو......''

مشرق کے بیابانوں میں (جن میں جزیرہ نمائے عرب بھی شامل ہے) کئی بار اتفاق ہوتا ہے کہ دو گروہ رات کے اوقات میں ایک ہی مقام پر سکونت کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ اگر اونٹ کی گھنٹی کی آواز کانوں میں نہ آئے اور رات کو جلتی آگ نشاندہی نہ کرے یا قافلے کے کتے نہ بھونکیں تو مسافروں کے گروہ ایک دوسرے سے چند میٹر کے فاصلے پر قیام کرنے کے باوجود ممکن ہے ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ محمد ﷺ اس رات اکیلے سفر کر رہے تھے۔ جب بطنِ نخلہ پہنچے خاصی رات گزر چکی تھی۔ اس مقام پر جو دوسرے لوگ قیام کر رہے تھے بیدار نہیں تھے اور اگر بیدار تھے تو وہ اس اکیلے مسافر کو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن انھوں نے آواز سنی اور کلام کی خوش الحانی سے بہت متاثر ہوئے اور جیسا کہ روایت ہے مسلمان ہو گئے۔

قرآن کی آیات اور روایات سے سمجھا نہیں جا سکتا کہ اس شب وہ لوگ یعنی (جن) جو نظر نہیں آ رہے تھے، قافلہ والے تھے یا بطن نخلہ کے رہنے والے۔ امرِ مسلّم یہ ہے کہ وہ لوگ اس رات تاریکی میں محمد ﷺ کو نظر نہیں آئے۔ صرف انھوں نے محمد ﷺ کی صدا سنی۔ کلام سے متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔

"جن" کا عربی زبان میں اطلاق ہوتا ہے اس چیز پر جو پوشیدہ اور مستور ہو اور دیکھی نہ جا سکے۔ اسی بنا پر بچہ جو شکم مادر میں ہوتا ہے اسے "جنین" کہتے ہیں کہ وہ بھی جن یعنی پوشیدہ اور مستور ہے۔ اس معنی کے علاوہ لفظ "جن" کا عربی زبان میں دوسرا مفہوم ہے "وحشت" یعنی دوسروں سے خوف کھانا۔ اس لحاظ سے اس لفظ (جن) کو "انس" کے مقابل استعمال کرتے ہیں۔

محمد ﷺ ایک عرب تھے اور ایک عرب کے لیے قبیلہ سے جدا زندگی بسر کرنا ممکن نہ تھا اور جب اس کا اپنا قبیلہ اسے طرد کر دیتا تھا تو اس کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلہ میں اپنے لیے جگہ بنائے۔

عرب بادیہ نشین، ایٹم (atom) کی طرح تنہا نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر ایٹم کے لیے جس طرح لازم ہے کہ کسی دوسرے ایٹم سے وحدت پیدا کرے تا کہ ایک مالیکیول تشکیل پائے اور زندگی کو تسلسل بخشے، اسی طرح بادیہ نشین اپنے قبیلے سے جڑا رہتا ہے۔

عرب بادیہ ایک شہد کی مکھی کی طرح ہوتا تھا اور قبیلہ اس کے لیے چھتے کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہد کی مکھی بغیر چھتے کے زندہ نہیں رہ سکتی اور اگر کچھ مدت اسے چھتے سے دور رہنا پڑے تو وہ مر جاتی ہے۔

خداوند نے محمد ﷺ سے فرمایا تھا کہ مکّہ سے باہر چلے جاؤ، لہٰذا وہ مکّہ سے طائف چلے گئے تا کہ یہ جائزہ لیں کہ آیا وہاں رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ لیکن معلوم یہ ہوا کہ شہر طائف مسلمانوں کو برداشت نہیں کرے گا لہٰذا آپ ﷺ مکّہ واپس آ گئے کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکالنے کی کوئی اور تدبیر کریں۔

ان حالات میں کسی نہ کسی قبیلے سے تعلق پیدا کرنا ناگزیر تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے ایک شخص کو قبیلہ زہرہ کے سردار اخنس بن شریق کے پاس بھیجا تا کہ اس سے حق جوار کا خواہاں ہو۔ جوار کے متعلق ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

اخنس بن شریق نے جواباً کہلا بھیجا: میری یہ خواہش ہے آپ کو حقِ جوار دوں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا اس لیے کہ میں قبیلہ قریش کا اتحادی ہوں لہٰذا میرے پاس وہ اختیار نہیں ہیں کہ میں راندۂ قریش کو اپنی حمایت (جوار) میں لے سکوں۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے سہیل بن عمرو کو پیغام بھجوایا اور خواہش کی کہ وہ اسے اپنے قبیلے میں قبول کر لے۔ سہیل بن عمرو قبیلہ قریش سے تھا مگر قریش کی اصلی شاخ سے نہیں تھا بلکہ فرعی شاخ سے شمار ہوتا تھا۔ اس نے بھی محمد ﷺ کو پناہ نہ دی۔ محمد ﷺ مکّہ سے باہر بیابان میں پڑے رہے۔

- یہ رجب کا مہینہ تھا اور اس موقع پر اہلِ عرب مکّہ میں عمرہ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ رجب میں اہلِ عرب عمرہ کیا کرتے تھے اور یہ عمرہ حجِ ذوالحج کی نسبت حجِ اصغر گنا جاتا تھا۔

قبائل عرب کے گروہ عمرہ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ محمد ﷺ رؤسا سے ملاقاتیں کر رہے تھے کہ میری بات سنو۔ لیکن کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔ بعض نے ان پر خندہ کیا اس لیے کہ وہ محمد ﷺ کو دیوانہ سمجھتے تھے۔ ویسے بھی ابولہب و ابوسفیان اور ابوجہل نے یہ پراپیگنڈہ کیا ہوا تھا کہ محمد ﷺ مجنون ہیں، ان کی بات پر کان نہ دھریں۔

محمد ﷺ نے پندرہ رؤسا سے منفی جواب سننے کے بعد سولہویں رئیس قبیلہ سے رجوع کیا۔ اب جس رئیس سے آپ نے رجوع فرمایا وہ اپنے قبیلے کے پانچ افراد کے ساتھ یثرب سے (جو بعد ازاں مدینہ کہلایا) عمرہ کرنے مکّہ آیا ہوا تھا۔ اس شخص نے محمد ﷺ کا تمسخر نہ اُڑایا، بلکہ بڑی توجہ سے آپ ﷺ کی بات کو سنا اور جب محمد ﷺ نے آیات قرآنی کی تلاوت فرمائی تو اس شخص کی قلبی کیفیت تبدیل ہو گئی۔ اس نے باقی پانچ ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا اور محمد ﷺ نے دوبارہ چند آیات ان کے لیے پڑھیں۔ وہ پانچوں افراد بھی اپنے رئیس کی طرح منقلب ہو گئے۔ یہ چھ افراد مسلمان ہو گئے اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد مدینہ (یثرب) روانہ ہو گئے۔ جاتی دفعہ آپ ﷺ سے عرض کی کہ ہم کوشش کریں گے کہ دوسرے لوگ بھی مسلمان ہو جائیں۔

آپ ﷺ کو مکّہ سے باہر زندگی بسر کرتے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ قبیلہ نوفل کا رئیس (یہ قبیلہ قریش کے دس قبائل میں سے ایک تھا) اس پر راضی ہوا کہ آپ ﷺ کو پناہ دے۔ اس قبیلے کی حمایت کے ساتھ ہی آپ ﷺ مکّہ میں واپس آگئے اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر ایک عورت سودہؓ کو اپنے نکاح میں لائے۔ یہ خاتون حبشہ سے مراجعت کر آئی تھی۔[1]



۱- سودہؓ کے پہلے شوہر سکرانؓ بن عمرو تھے جو حبشہ سے مکّہ واپس آکر فوت ہوگئے تھے۔ (اسد الغابہ)

اسلام میں 'اُمت' کا مفہوم

محمد ﷺ مزید ایک سال مکّہ میں رہے اور ہر اس مشقت کو جو آپ ﷺ پر وارد ہوئی، برداشت کرتے رہے۔ آپ ﷺ کو موت کا کوئی خوف نہ تھا۔ بدوی عرب اس وقت بھی اور آج بھی کہتے ہیں: "جب ہمارا اس دنیا میں آنا قرار پایا تھا تو ہم سے کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ آیا تمھاری یہ خواہش بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہم سے پوچھا جاتا تو شاید ہمارا جواب نفی میں ہوتا کہ ہم تو اس دنیا میں قدم رکھنے کے خواہش مند ہی نہیں"۔

جس روز ہمیں لے جانا ہوگا کوئی ہم سے نہیں پوچھے گا کہ آیا تم دنیا سے واپس جانے کے خواہش مند ہو یا نہیں؟ ہماری زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جس وقت وہ چاہتا ہے ہمیں اس دنیا میں بھیج دیتا ہے اور جب وہ مائل ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں سے لے جائے وہ لے جاتا ہے۔ ہمیں یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ ہم اپنی رضا سے اس جہان میں آئیں اور اپنی رضا سے جائیں۔

زندگی ایک سرمایہ ہے جو خداوند ہمیں عطا فرماتا ہے، اس طرح کہ ہم اس کے منافع سے فائدہ حاصل کرنے کے حقدار ہیں نہ کہ اصل سرمایہ سے، کیوں کہ خود سرمایہ ہم سے متعلق ہی نہیں لہٰذا موت کا تمنائی نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ مرگ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ دوسرے جب موت کا وقت آجائے تو ہمیں خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ موت سے خوف کھانا موت کی راہ نہیں روک سکتا۔

محمد ﷺ بحیثیت ایک عرب کے یہی عقیدہ رکھتے تھے اور موت سے خوفزدہ نہ تھے۔ لیکن موت کی تمنا بھی انھیں نہیں تھی۔ وہ جور و مشقت سہتے رہے۔ ایک سال بعد یعنی ۶۲۱ سن عیسوی میں عمرہ کے لیے ایک گروہ مدینہ والوں کا مکّہ آیا تو معلوم ہوا کہ گروہ کے ساتھ جو مسلمان آئے ہیں ان کی تعداد بارہ ہوچکی ہے۔ ان میں سے دس افراد ایک قبیلے اور دو دوسرے قبیلے سے تھے۔

ان بارہ افراد نے مکہ پہنچنے کے بعد عقبہ (یعنی دو پہاڑوں کے درمیان گھاٹی) میں آپ ﷺ سے ملاقات کی اور مشورہ کیا۔ یہ گھاٹی جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے، اسے قدیم وقتوں میں ایک ایسا مقام سمجھا جاتا تھا جہاں سے ابلیس اور خبیث روحوں کا گزر ہوتا تھا۔

کہتے ہیں جب ابراہیمؑ اپنے فرزند کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے جا رہے تھے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اطاعت گزاروں میں سے ہیں تو شیطان اسی گھاٹی میں ان کے پاس آیا اور چاہا کہ ابراہیمؑ کو خدا کی راہ میں فرزند کی قربانی سے باز رکھے۔ ابراہیمؑ نے شیطان کو پتھر مارے کہ وہ بھاگ جائے اور اس کا شر ان سے دور ہو۔ آج بھی جو لوگ حج پر جاتے ہیں، جب اس مقام پر پہنچتے ہیں تو رمی کرتے ہیں یعنی پتھر مارتے ہیں۔

یہ مدینہ کے بارہ مسلمان افراد (تاریخ میں ان کو اور مدینہ کے دوسرے مسلمانوں کو انصار کا نام دیا گیا ہے) جب اس گھاٹی میں محمد ﷺ سے ملے تو اطلاع دی کہ سال گزشتہ کی نسبت مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی ہے اور اس افزائش کا سبب قرآن کریم ہے۔

اس وقت ان بارہ افراد نے جو گھاٹی میں موجود تھے آپ ﷺ کو مدینہ کی سیاسی حالت سے آگاہ کیا اور کہا کہ مدینہ کے قبائل کے درمیان ایک بادشاہ کے انتخاب پر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ ایک زرگر نے مدینہ کے سرکردہ افراد میں سے عبداللہ بن ابی کے سر کا ناپ لیا ہے اس مقصد کے لیے کہ اس کے لیے تاج تیار کیا جائے لیکن مدینہ کے قبائل کے مختلف گروہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ رفع اختلاف کے خیال سے بجائے ایک بادشاہ کے ایک پیغمبر ﷺ کو منتخب کر لیں اور چونکہ محمد ﷺ قریش میں سے ہیں اور ان کا والد (عبداللہ) مدینہ کے نزدیک مدفون ہے اور خود وہ پیغمبر ہیں، اہلِ مدینہ اس بات پر آمادہ ہو رہے ہیں کہ آپ ﷺ کو دعوت دیں۔ نیز وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک پیغمبر بادشاہ پر فضیلت رکھتا ہے۔ پیغمبر سعادت خداوندی سے بھی بہرہ ور ہوتا ہے۔

محمد ﷺ نے ان انصار سے فرمایا: کیا تم آمادہ ہو کہ مجھ سے بیعت النسا کرو۔ بیعت النسا جزیرہ نمائے عرب میں حلف وفاداری سے عبارت تھی۔ جب چند قبیلے ایک قبیلہ سے وفاداری

کا اظہار کریں تو اس اعلان وفاداری کا رسمی نام بیعت النسا تھا۔ اس گھاٹی میں دو قبیلوں کے نمائندوں نے محمد ﷺ سے بیعت النسا کی۔ اسے بیعت النسا اس لیے کہا جاتا تھا کہ بیعت کنندہ حلف اُٹھاتا کہ اس شخص (جس سے بیعت کی گئی ہو) سے وفاداری کی راہ میں اس طرح فداکاری کروں گا جس طرح اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے لیے فداکاری کی جاتی ہے۔ ان بارہ افراد کے حلف وفاداری کے بعد محمد ﷺ نے ان سے فرمایا: اگر تم اپنے حلف پر ثابت قدم رہے تو بہشت تمھارا مقام ہوگا اور اگر تم اپنے حلف پر قائم نہ رہے تو یہ خدا پر ہے کہ تم پر گرفت کرے یا بخش دے۔

وہ بارہ افراد اس کے بعد مدینہ جانے کے خواستگار ہوئے تو محمد ﷺ نے ایک مسلمان بنام مصعبؓ ابنِ عمیر ان کے ساتھ بھیج دیا تا کہ وہ مدینہ میں مسلمانوں کو قرآن سکھائے۔ ابنِ عمیرؓ خوش بیان اور قرآن پڑھنے میں خوش الحان تھے۔ مدینہ آنے کے بعد انھوں نے بہت سے مشرکین کو مسلمان کیا۔

مدینہ میں اسلام نے اس طرح پیش رفت کی کہ ۶۲۱ سن عیسوی کے اختتام تک یہودیوں کے سوا تمام ساکنان مدینہ مسلمان ہو چکے تھے۔ یہودی گو اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن انھوں نے بھی محمد ﷺ کے مدینہ آنے سے موافقت ظاہر کی۔ یہ ایک سبب بھی تھا کہ وہ دوسروں سے اپنے اختلافات حل کروا سکتے تھے۔

محمد ﷺ مکہ میں مدینہ کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد خود کو مدینہ ہجرت کے لیے آمادہ کرتے رہے۔ آپ ﷺ کو یہ بھی احساس تھا کہ یہ فیصلہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔

اس وقت تک محمد ﷺ نے مکہ میں تمام مشقتیں برداشت کی تھیں مگر آج تک قریش سے جدا نہیں ہوئے تھے، نیز یہ بھی احساس تھا کہ اگر ایک بار مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو تمام روابط اپنے قبیلہ سے ہمیشہ کے لیے قطع ہو جائیں گے۔ عربی زبان میں اس طرح کے قطع روابط کے لیے ایک اصطلاح ہے جس کو دوسروں نے اصلی معنی کے بجائے غلط انداز میں استعمال کیا ہے۔ اور وہ اصطلاحی کلمہ ہے ''فتنہ'' عربی زبان میں ''فتنہ'' یعنی قطع روابط یہ ہے کہ

کوئی شخص تمام قدروں اور وابستگیوں کو اپنے قبیلہ یا طائفہ سے ختم کردے۔ یہ اصطلاح جب دوسرے غلط انداز اور غلط معنی میں استعمال ہوئی تو لوگوں نے اس کے معنی تولید فساد کے لیے۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔

پیغمبر ﷺ سمجھتے تھے کہ مکہ سے ان کی مدینہ کو ہجرت یعنی قطع روابط کے نتیجہ میں جو اثرات مرتب ہوں گے اس سے اہلِ عرب میں ایک جدید جمعیت وجود پکڑے گی جو کہ کلی طور پر قدیم یا موجودہ جمعیتوں سے مختلف ہوگی۔ اس نئی جمعیت میں حسب ونسب اور ثروت اور نسلی امتیاز وجہ تفاخر نہیں بلکہ گورے اور کالے، غنی اور فقیر، رئیس اور عامی سب برابر ہوں گے۔ اس اجتماع کو "امت" کہا گیا۔

اس نئی جمعیت یعنی امت کا رئیس "خدا" ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے، اس لیے خدا کی ریاست دائمی ہے۔ اس امت میں خدا کا نمائندہ پیغمبر ﷺ ہے۔

نئی جمعیت (امت) کے تمام افراد خدا کے سامنے ایک دوسرے کے مقابلہ میں مساوی ہیں، حتیٰ کہ زن ومرد میں تفاوت نہیں ہے اور سب مساوی حقوق سے بہرہ ور ہیں۔

امت ایک قبیلے کے مثل نہیں ہے کہ مبنی بر حسب ونسب ہو اور ان کا خون دوسرے افراد بشر سے جدا ہو۔ جو چیز امت کو دوسرے افراد بشر سے جدا کرتی ہے وہ اسلامی قانون ہے، یعنی قانونِ شریعت۔

امت اور دوسرے افراد بشر کے درمیان ایک دیوار ہے اور وہ قانونِ شریعت کی دیوار ہے لیکن یہ دیوار کسی کے لیے ناقابلِ عبور نہیں ہے، چاہے وہ شخص کسی بھی نسل، قوم، قبیلہ یا طائفہ کا کیوں نہ ہو۔ سب لوگ اس امت کا جزو ہو سکتے ہیں، فقط خداوند کی ریاست کو قبول کرلیں یعنی مسلمان ہوجائیں۔

خدا کی ریاست کو قبول کرنے کے بعد وہ فرد فوری طور پر امت کا جزو ہوجاتا ہے اور یکایک اسلامی معاشرے کے افراد کے مساوی ہوجاتا ہے۔ اگر ہم اس انقلاب کا مطالعہ جو اس موقع پر محمد ﷺ عربستان میں لانا چاہتے تھے، اس لحاظ سے کریں کہ اہلِ عرب کے رسوم و

شعائر کی معاشرے پر چھاپ نہایت گہری تھی اور قبائل میں رؤسا کا اثر ورسوخ فوق العادہ تھا، ہر قبیلہ بجائے خود اجتماعی وحدت تشکیل دیتا تھا، تو یہ ایک کلی انقلاب تھا۔ یہ انقلاب انقلابِ فرانس سے کہیں زیادہ عظیم تر اور ہمہ گیر تھا۔ فرانسیسیوں کا انقلاب ان کے مابین مساوات نہ لاسکا۔ لیکن محمد ﷺ کے انقلاب سے مسلمانوں کے مابین مساوات قائم ہوئی۔ اور ہر طرح کی خاندانی، طبقاتی اور مادی بالاتری ختم ہوکر رہ گئی۔

۶۲۲ سن عیسوی میں ایک بار پھر اہلِ مدینہ عمرہ کے لیے مکہ آئے اور محمد ﷺ سے مذکورہ درہ میں رات کے وقت ملاقات کی۔

اس موقع پر ان بارہ افراد کے علاوہ جنھوں نے سال قبل حلفِ وفاداری اُٹھایا تھا، مدینہ کے مسلمانوں کا دوسرا گروہ بہتر افراد (مرد وزن) پر مشتمل اسی گھاٹی میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ وہاں محمد ﷺ نے چند آیاتِ قرآنی ان کے لیے تلاوت کیں اور بعد ازاں نئے آنے والے لوگوں نے (مسافرین سال گزشتہ کی طرح) درخواست کی کہ ان سے بھی حلفِ وفاداری (بیعت النساء) لیں۔ پس ان نئے لوگوں نے بھی حلف وفاداری اُٹھایا۔

حلف کے بعد محمد ﷺ نے فرمایا: آپ لوگوں نے مجھ سے بیعت کی ہے کہ جب کبھی میں خطرہ میں ہوں گا تو آپ لوگ میرا اسی طرح دفاع کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے حالات پیش آئیں اور ہم مجبور کردیے جائیں کہ ہمیں اسلام کی پیش رفت کے لیے جنگ کرنی پڑے۔ آیا تم آمادہ ہو کہ خدا کی راہ میں جنگ کرو اور آمادہ ہو کہ مجھ سے بیعت حرب کرو؟

بیعت حرب اور بیعت النسا میں ایک فرق ہے۔ بیعت النسا ایک دفاعی معاہدہ تھا جب کہ بیعت حرب ایک جارحانہ پیمان تھا۔ بیعت النسا اس مفروضہ یا شرط پر مبنی ہوتی کہ وہ شخص جس کا دفاع مقصود ہے وہ لڑائی میں نہیں جائے گا اور اگر وہ موردِ حملہ قرار پاتا تو بیعت النسا کرنے والے اپنی تمام قوت سے اس شخص کے دفاع کی کوشش کرتے۔

محمد ﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ بعض حالات میں یہ ممکن ہے کہ ہمیں مجبوراً

چارۂ جنگ کرنا پڑے اور اسی لحاظ سے بیعت الحرب کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بیعت الحرب مفہوم کی وسعت کے لحاظ سے بیعت النسا سے بڑی بیعت تھی۔ آدمی جب کسی دوسرے سے بیعت الحرب کرتا تو پھر اسے جارحانہ ومدافعانہ دونوں جنگوں میں شریک ہونا پڑتا۔ مدینہ کے مسلمان بیعت الحرب پر رضامند ہو گئے یعنی آپ ﷺ سے جارحانہ ودفاعی پیمان باندھنے پر تیار ہو گئے۔ لیکن قبل از بیعت الحرب انھوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ جب آپ فاتح ہو جائیں گے تو ہمیں چھوڑ کر مکہ واپس آجائیں گے۔

اس وجہ سے محمد ﷺ نے بھی ان کے لیے وفاداری کا حلف اُٹھایا اور فرمایا: "اے مدینہ کے مسلمانو! تمھارا خون، میرا خون ہے اور میرا خون تمھارا خون۔ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ جو کوئی بھی تم سے جنگ کرے میں اس سے جنگ کروں گا اور جس شخص سے تم خدا کی راہ میں جنگ کرو گے میں بھی اس سے برسرِپیکار ہوں گا"۔

یہ سن کر ان تہتر مردوں نے بیعت الحرب کی (دو عورتیں ان کے علاوہ تھیں جب کہ کل موجود افراد کی تعداد پچھتر تھی) اور محمد ﷺ نے ان پچھتر افراد کے لیے بارہ رئیس منتخب کیے۔

محمد ﷺ نے ان بارہ افراد سے کہا: تم میرے نمائندے ہو۔ مدینہ مراجعت کرنے کے بعد احکامِ خداوندی مسلمانوں کو سمجھاؤ اور ان سے کہو کہ مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے۔ خداوند نے اس بابت فرمایا ہے ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾ [الحجرات ۴۹: ۱۰] "یعنی مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو دوسرے بھائی ان کی صلح کروائیں"۔

سورۂ حجرات مدینہ میں نازل ہوئی، اس لیے محمد ﷺ اس آیت کو اس موقع پر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کا مضمون پڑھا نہ کہ خود آیت۔

محمد ﷺ نے یہ آیت پڑھی ہو یا اس کا مضمون، یہ محقق ہے کہ آپ ﷺ جب مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے آمادہ ہوئے تو ہر طرح کا طبقاتی اور خاندانی امتیاز ختم کر دیا۔ اسی طرح

سورۂ حجرات کی تیرھویں آیت جو کہ مدینہ میں نازل ہوئی کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا۔ بنابرایں نسب کے لحاظ سے تم ایک دوسرے سے برابر ہو اور کوئی بالاتر نہیں۔ باپ اور ماں تمھارے ایک ہی ہیں۔ بعد ازیں تمھاری تعداد زیادہ ہو گئی، تم کو قبیلوں اور برادریوں کی شکل میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور اپنی احتیاجات آشنائی و معاشرت کی وجہ سے پوری کر سکو۔ تم میں سے خداوند کے نزدیک برگزیدہ شخص وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

ہر وہ شخص جو عربی زبان پر عبور رکھتا ہے، سمجھتا ہے کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ تقسیمِ نوعِ بشر (خاندانوں اور قبیلوں میں) اس لیے نہیں کی گئی کہ بعض دوسروں پر اپنی نخوت کا اظہار کریں اور برتری کا رعب جمائیں بلکہ یہ تقسیم اس لیے کی گئی ہے کہ جمعیت باہم معاشرت قائم کرے۔ کلمہ (تعارفوا) جو اس آیت میں مذکور ہے مجازی معنی رکھتا ہے اور اس سے عام سی شناسائی مقصود نہیں بلکہ شناسائی دوسروں کے مکمل احوال وکوائف سے تا کہ باہم دگر احتیاجات پوری کر سکیں۔

محمد ﷺ نے بارہ رؤسا کو سمجھایا کہ یہ عربستان میں ایک بڑے پروگرام کا ابتدائیہ ہے اور انھیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس پروگرام پر عمل کے لیے اپنے اندر لیاقت وصلاحیت پیدا کریں۔

اس دن تک محمد ﷺ ایک پیغمبر تھے لیکن اس دن کے بعد انھیں مقامِ رسالت کے علاوہ ایک ملت کی زمام داری (قیادت) کا بھی رتبہ حاصل ہوا۔ اسی بابت قرآن میں محمد ﷺ سے فرمایا گیا کہ موسیٰؑ کی زمام داری سے سبق لو۔ موسیٰؑ ایک لائق زمام دار (قائد) تھا۔

یہ گھاٹی جہاں دونوں سال محمد ﷺ نے مدینہ سے آئے ہوئے مسلمانوں سے بیعت لی، آج اس کا وجود نہیں ہے۔ اس جگہ پر ایک مسجد بنا دی گئی ہے۔



ہجرت: تاریخِ اسلام کا ایک فیصلہ کن واقعہ

بیعت الحرب ماہ رجب ۶۲۲ سن عیسوی میں انجام پائی۔ ازاں بعد دو اصطلاحیں عربی زبان میں اور بالخصوص مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئیں۔ ایک انصار اور دوسرے مہاجر۔ انصار سے مراد مدینہ کے وہ مسلمان تھے جنھوں نے ماہ رجب ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء میں محمد ﷺ سے بیعت کی اور مہاجرین سے مراد مکّہ کے وہ مسلمان تھے جنھوں نے محمد ﷺ کے حکم کے مطابق قریش کے آزار سے رہائی پانے کے لیے مدینہ کی راہ لی۔

اسلام کے تاریخ دانوں کے مطابق کوئی ایک بھی ان دو میں سے دوسرے پر برتری نہ رکھتا تھا، نیز انصار و مہاجرین دونوں نے اسلام کی راہ میں بہت رنج اُٹھائے۔

اصطلاح ''انصار'' کا اطلاق آغاز میں ان لوگوں تک محدود تھا جنھوں نے ماہ رجب ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء میں محمد ﷺ سے بیعت کی لیکن بعدازاں مدینہ میں رہنے والے تمام مسلمانوں پر اس کا اطلاق ہوا۔

بیعت الحرب جو ماہ رجب ۶۲۲ عیسوی میں انجام پائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ لیکن قریش کو کسی طور خبر ہوگئی کہ محمد ﷺ اور مدینہ سے آنے والے گروہ کے درمیان مذاکرات ہوئے ہیں اور معاہدہ قرار پا گیا ہے۔ اس خبر کی تصدیق کے لیے وہ مدینہ والوں کے کیمپ میں آئے اور ان سے پرسش کی کہ تم نے کس موقع پر اور کس جگہ محمد ﷺ سے ملاقات کی اور تم نے اس سے کیا کہا اور اس سے کیا سنا؟

مدینہ کے زائرین جو ابھی تک بت پرست تھے اور بتوں کی زیارت کے لیے مکّہ آئے تھے ان مذاکرات کی کوئی خبر نہ رکھتے تھے اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ انھیں کوئی علم نہیں۔

نیز وہ ۷۵ مسلمان جنھوں نے محمد ﷺ سے مذاکرات و بیعت کی تھی، صبحدم مدینہ کی

طرف چل دیے تھے اور چونکہ انھیں احساس تھا کہ قبائل قریش ان کا تعاقب کریں گے اس لیے وہ اپنی راہ کو بدل بدل کر سفر کر رہے تھے۔

مسلمانانِ مدینہ کے مکّہ سے چلے جانے کے تین دن بعد بالآخر قریش کو علم ہوگیا کہ محمد ﷺ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان معاہدہ حرب طے پا چکا ہے۔ پس انھوں نے ارادہ کیا کہ مدینہ کے مسلمانوں کے اس گروہ کو واپس پکڑ لائیں۔

کاروان مکّہ سے مدینہ کی راہ عموماً گیارہ روز میں طے کرتے تھے لیکن سفید شتر اس ساری راہ کو تین دن اور تین رات میں طے کرتے تھے۔ قریش کے کچھ لوگوں نے سفید شتر فراہم کیے۔ سوار ہوئے اور چل دیے تاکہ مدینہ کے مسلمانوں کو مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ کر واپس لے آئیں۔

مدینہ کے مسلمانوں کا گروہ چونکہ راہ کو بدل بدل کر سفر کر رہا تھا، قریش کے سریع السیر سواران کو تلاش نہ کر سکے۔ اس گروہ کے بجائے مدینہ کے ایک تاجر کو پکڑ لیا جو مسلمانوں کے کاروان کا ایک حصہ تھا اور اس کو واپس مکّہ لے آئے۔

مدنی تاجر سے پرسش کی گئی تو اس نے کہا: میں مدینہ کے کاروان کے ساتھ تھا مگر میں نے کاروان کے کسی فرد سے محمد ﷺ سے ملاقات یا مذاکرات کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ مدنی تاجر صحیح کہہ رہا تھا۔ کاروان والوں نے راز چھپائے رکھا اور فاش نہ کیا تھا۔

تاجر مذکور مرفع الحال اور ایک معزز قبیلہ کا فرد تھا۔ قریش اگر اس کو اذیت دیتے تو اس کے قبیلے کو اپنا دشمن بناتے۔

وہ تاجر مکّہ میں بھی بااثر افراد کو اپنا دوست رکھتا تھا۔ لہٰذا جماعتِ قریش نے اسے رہا کر دیا اور دو جاسوس مدینہ بھجوائے کہ مدینہ میں مسلمانوں سے اطلاعات حاصل کریں اور معلوم کریں کہ محمد ﷺ اور ان کے درمیان کیا قرارداد ہوئی ہے۔ ممکن ہے آپ پوچھیں کہ قریش مکّہ میں محمد ﷺ کو کیوں نہیں پکڑتے تھے اور ان سے کیوں تحقیق نہیں کرتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ محمد ﷺ مکّہ میں ایک رئیس قبیلہ کے تحتِ حمایت تھے (جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے) جماعتِ قریش اس پس منظر میں آپ ﷺ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی کہ آزار

پہنچا کر آپ ﷺ سے پوچھ سکیں کہ مسلمانانِ مدینہ سے کیا معاہدہ طے پایا ہے؟

جب یہ ۷۵ افراد مدینہ پہنچے، محمد ﷺ نے مکّہ کے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکّہ سے نکل جائیں اور مدینہ پہنچیں اور انصار کے گھروں میں قیام کریں۔

مکّہ کے مسلمان چھوٹے چھوٹے دستوں میں شہر سے نکلتے اور مدینہ کی راہ پکڑتے اور بہت زیادہ احتیاط برتتے کہ قریش کو ہجرت کا علم نہ ہو جائے۔ لیکن مکّہ میں جہاں ہر شخص ایک دوسرے کو پہچانتا تھا (آج بھی عربستان کے شہروں، حتیٰ کہ مکّہ وجدہ کے لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں) چند لوگوں کا چلے جانا قریش کو متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جماعتِ قریش سمجھ گئی کہ مسلمان جا رہے ہیں، لہٰذا انھوں نے ان کی راہ روکنے کا فیصلہ کیا۔

تین مسلمانوں نے جن میں سے ایک عیاشؓ بن ابی ربیعہ اور دو بھائی بنام ہاشمؓ و امیہؓ جو کہ عاص کے فرزند تھے، مکّہ سے اکٹھے ہی ہجرت کا ارادہ کیا۔[1] جس رات انھوں نے عازمِ سفر ہونا تھا، ہاشمؓ بن عاص گم ہو گیا۔

دوسرے دونوں مسلمان مجبوراً ہاشمؓ بن عاص کے بغیر ہی عازمِ مدینہ ہوئے۔ دوسرے دن تمام مکّہ والوں کو علم ہو گیا کہ ہاشمؓ مسلمان ہونے کی وجہ سے مکّہ سے فرار کا قصد رکھتا تھا۔ اسے قریش نے پکڑ لیا ہے۔ ان دنوں مکّہ میں زندان نہیں ہوتا تھا۔ عربستان میں پہلا زندان محمد ﷺ کی رحلت کے سالہا بعد کوفہ میں بنایا گیا۔ عرب ان دنوں جس کسی کو پکڑتے، زنجیریں پہنا کر صحرا میں چھوڑ دیتے تھے۔ نیز ہاشمؓ سے بھی انھوں نے یہی سلوک کیا۔ قریش کے افراد نے دوسرے مسلمانوں کا تعاقب کیا لیکن انھیں پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

قریش کے جاسوس جب مدینہ میں داخل ہوئے تو عائشہؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تیری ماں مکّہ میں بسترِ مرگ پر پڑی ہے اور اگر تم اپنی ماں سے ملنا چاہتی ہو تو اُٹھو، ہمارے ساتھ مکّہ

۱۔ مصنف نے عیاشؓ اور ہاشمؓ بن عاص کے ہمراہ اس کے بھائی "امیہ" کی ہجرت کا ذکر کیا ہے حالانکہ معتبر کتبِ سیرت میں عیاشؓ اور ہاشمؓ کی عمرؓ کے ہمراہ ہجرت کا ذکر ہے۔ (السیرۃ النبویہ از ابن ہشام: ۸۸/۲) بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہاشمؓ بن عاص کے کسی مسلمان بھائی کا نام امیہ نہیں تھا۔

چلو کیوں کہ ہم مکّہ جا رہے ہیں۔

عائشہؓ نے محسوس کیا کہ یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں لیکن چونکہ ان کے سچا ہونے کا بھی احتمال تھا، لہٰذا اس خیال سے کہ شاید والدہ کو موت سے پہلے پھر نہ دیکھ سکوں، ان کے ساتھ چل دیں۔ مکّہ پہنچتے ہی اسے بھی زنجیریں پہنا کر صحرا میں چھوڑ دیا گیا۔

ہاشمؓ بن عاص اور عائشہؓ کی یہ خوش بختی تھی کہ ان دنوں گرمی کا موسم ختم ہو چکا تھا اور آفتاب میں وہ حدت نہ تھی وگرنہ یہ دونوں آفتاب کی گرمی سے مر گئے ہوتے۔

جب ان دونوں کے پکڑے جانے اور پابہ زنجیر ہونے کی خبر مدینہ پہنچی تو کچھ انصار سریع السیر شتروں پر سوار ہو کر مکّہ پہنچے۔ راتوں رات ان دونوں کی زنجیریں کھولیں، شتر پر سوار کیا اور واپس مدینہ کی راہ لی۔ ہاشمؓ اور عائشہؓ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئے تھے۔

ایک ثروت مند مسلمان (بنو جحاش) نے مکّہ سے مہاجرت کی۔ جب قریش کو اس کی ہجرت کا علم ہوا تو اس کے بہت بڑے گھر پر ابوسفیانؓ نے قبضہ کر لیا۔

مکّہ کے ایک اور مالدار مسلمان نے ہجرت کا قصد کیا۔ اس کا نام صہیبؓ بن سنان الرومی تھا۔ قریش نے اسے روک لیا اور اس سے کہا: اے صہیب! جس دن تو مکّہ میں آیا تھا ایک فقیر تھا۔ اس شہر میں تو نے سوداگری شروع کی۔ ہماری مدد اور اس شہر کی سہولتوں سے تو دولت مند ہو گیا اور اب قصد رکھتا ہے کہ اس دولت کو جو تو نے یہاں رہ کر کمائی ہے، یہاں سے لے جائے۔ ہم تجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے کہ تو اس شہر سے نکل کر مدینہ چلا جائے۔

صہیبؓ نے اپنے تمام اموال سے صرفِ نظر کیا اور مدینہ کی راہ لی۔ اسی واقعہ کی بنا پر قرآن نے سورۃ بقرہ (آیت ۲۰۷) میں اسے (صہیبؓ کا نام لیے بغیر) مثال قرار دیا۔ تمام دانش مندانِ اسلامی نے اس کی تصدیق کی ہے کہ اس آیت میں مراد صہیبؓ کا عمل ہی ہے۔ آیت میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾

”مکّہ کے مہاجرین میں ایسے افراد بھی ہیں جنھوں نے خداوند کی رضا کے حصول کے لیے مال دنیا کو چھوڑ دیا۔ ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے“۔ [البقرۃ ۲: ۲۰۷]

قریش صہیبؓ کے اس عمل پر بہت متعجب ہوئے کیوں کہ ان کا ذہن کسی طور یہ قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کہ ایک آدمی مالِ دنیا سے صرف اس لیے صرفِ نظر کر جائے کہ دین سے وفادار رہے۔ قریشِ مکّہ کے لیے جائداد اور نقدی سے زیادہ کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی تھی کیوں کہ ان کی تو زندگی ہی یہی تھی کہ دولت پیدا کریں اور اپنی جاہ و ثروت میں اضافہ کریں۔ جماعتِ قریش نے صہیبؓ کو دیوانہ گردانا، اس لیے کہ ان کے خیال میں تاوقتیکہ انسان دیوانہ نہ ہوگیا ہو، دین کے لیے دولت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

لیکن صہیبؓ کے بعد کئی ایک دوسرے مسلمانوں نے گھروں کو چھوڑا اور عازمِ مدینہ ہوئے جب کہ انھیں یقین تھا کہ ان کے جانے کے بعد قریش ان کے گھروں پر قابض ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کی مکّہ سے ہجرت نے ایسا عروج پکڑا کہ قریش نے کہا: یہ مثل دریا ہے کہ اس میں سیلاب آیا ہو۔ پانی کناروں سے باہر نکل جائے اور اطراف کو پراگندہ کرتا چلا جائے اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر قریش نے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ کیا اور محمد ﷺ کی پیدا کردہ اس خطرناک صورتِ حال سے نجات پانے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے جمعیت قریش دس قبیلوں پر مشتمل تھی اور یہ دس قبیلے مکّہ ہی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ مکّہ اس وقت دو سو مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا تھا اور یہی مکّہ کی حدود تھیں۔ روایت میں ہے کہ اس دو سو مربع کلومیٹر علاقہ کو ابراہیمؑ نے کعبہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ حدود کی نشاندہی کی ہوئی ہے (واضح رہے کہ اس وقت مقیاس طول کیلومیٹر نہیں تھا۔ میں نے سہولت کے لیے اس پیمانے کو ذریعہ اظہار بنایا ہے)۔

قریش کے دس قبیلوں میں سے ہر ایک مکّہ کے مخصوص حصے میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر قبیلہ مکّہ سے باہر پہاڑی علاقہ میں ایک ایک شعب رکھتا تھا جہاں بیرونی لوگ اور قبیلے کے

غلام زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر قبیلے میں ارکان قبیلہ کے علاوہ تین طبقے اور ہوتے تھے:

اوّل: ”مولیٰ“ کہ جمع اس کی ”موالی“ ہوتی ہے، ارکان قبیلہ کے بھائیوں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ اصلی بھائیوں پر نہیں، ”رضاعی“ بھائیوں پر۔ اس لیے کہ قریش میں رواج تھا کہ ان کی عورتیں اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلایا کرتی تھیں۔ بچوں کو دایہ کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اور اگر اس وقت دایہ کا بچہ بھی ہوتا تو وہ بچہ قریش کا برادر رضاعی شمار ہوتا تھا۔

دوم: طبقہ دوم حلیفوں میں شمار ہوتا تھا۔ حلیف وہ شخص ہوتا تھا جو بیرونی ہو لیکن قبیلے نے اسے پناہ دی ہوئی ہو اور وہ مستقلاً اس قبیلے میں زندگی بسر کرنے کا خواہش مند ہو۔

سوم: طبقہ سوم کو ”جار“ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو قبیلے کی پناہ میں آ کر عارضی طور پر قبیلے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ اشخاص ہر دس قبیلوں کے جزو تھے لیکن یہ سب اور غلام اور کنیزیں شعب میں رکھے جاتے تھے۔ قبیلے میں ان کی پذیرائی نہیں کی جاتی تھی۔

بردگان (غلام) ان تینوں طبقوں کے علاوہ تھے۔ انھیں اس قابل نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان تینوں طبقوں کا جزو بنائے جائیں کیوں کہ قریش غلاموں کو گھر کے سامان یا جانور کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

ہر قبیلہ اپنی ایک مجلس مشاورت تشکیل دیتا تھا جسے نادیٰ کہا جاتا تھا اور پھر تمام دس قبیلوں کی ایک مجلسِ شوریٰ ہوتی جسے ”دارالندوہ“ کہا جاتا تھا۔

دارالندوہ میں صرف ممبرانِ نادیٰ شرکت کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ قبائل قریش کا ہر وہ فرد جس کی عمر ۴۰ سال سے تجاوز کر چکی ہو شریک ہو سکتا تھا لیکن ابولہب اس شرط سے مستثنیٰ تھا۔ وہ سنِ چہل سالگی سے پہلے ہی دارالندوہ کے اجلاسوں میں شرکت کیا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ ایک ہوش مند اور با استعداد آدمی تھا اور جماعتِ قریش کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ شرکت کرے تا کہ وہ اس کی استعداد سے مستفید ہو سکیں۔ مجلسِ شوریٰ (دارالندوہ) کے اجلاس ایک بہت بڑے ہال میں ہوا کرتے تھے اور یہی ہال بیاہ شادی کے موقعوں پر بھی استعمال ہوتا تھا۔

بیاہ شادی کے موقعوں پر قریش کی عورتیں بہترین زیور پہن کر جو کہ بیشتر سونے اور جواہرات کے بنے ہوتے تھے اس بڑے ہال میں آتیں۔ جن عورتوں کے پاس زیورات نہیں ہوتے تھے وہ خیبر جا کر جوہریوں سے کرایہ پر حاصل کرتیں۔ خیبر میں جوہری سامان آرائش کرایہ پر مہیا کرتے تھے۔ یہ بحث بہرحال آگے آئے گی کہ خیبر کہاں ہے اور وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

جب قریش کو فکر دامن گیر ہوئی کہ مسلمانوں کی ہجرت نے ایک خطرناک صورت اختیار کرلی ہے تو انھوں نے دارالندوہ کا اجلاس بلایا تا کہ کوئی چارہ جوئی کریں۔ پہلے یہ تجویز ہوا کہ محمد ﷺ کو بھی عائشہؓ اور ہاشمؓ کی طرح پابہ زنجیر کریں اور صحرا میں چھوڑ آئیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مدینہ کے مسلمانوں کو اس واقعہ کا علم ہوجائے گا اور وہ آکر عائشہؓ اور ہاشمؓ کی طرح محمد ﷺ کو آزاد کر کے ہمراہ لے جائیں گے۔ پھر تجویز ہوئی کہ محمد ﷺ کو مکّہ سے نکال دیں لیکن اس میں بھی خطرہ تھا۔ اگر محمد ﷺ کو مکّہ سے نکالا جاتا تو لامحالہ وہ مدینہ ہی جاتے اور وہاں ایک لشکر تیار کر کے مکّہ پر حملہ آور ہوتے اور مکّہ کو فتح کرنے کی کوشش کرتے۔

بالآخر وہ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ محمد ﷺ کو قتل کیے بغیر اس خطرہ سے نہیں نمٹا جاسکتا۔ یعنی وہی فیصلہ جو پہلے کیا گیا تھا لیکن اس پر عمل نہ ہوا اور بروقت اس کا اجرا نہ کیا جاسکا۔

عربستان میں ایک آدمی کا قتل نہ مذہبی نقطہ نظر سے مذموم تھا نہ اخلاقی لحاظ سے۔ اس میں فقط مادی نقصان کا احتمال ہوتا تھا۔ انسان کا قتل اسلام کے بعد ہی گناہ متصور ہوا ہے اور ازنظرِ مذہبی واخلاقی مذموم سمجھا جاتا ہے۔

عرب چونکہ ایک فرد کو مالِ دنیا سمجھتے تھے اس لیے جب ایک آدمی قتل ہوتا تو قاتل اس کے خون کے بدلے نقد رقم یا شتر یا بھیڑیں دے دیتا اور بری الذمہ ہوجاتا تھا۔ خون بہا کی شرح چھوٹے اور بڑے اشخاص اور اسی طرح چھوٹے اور بڑے قبیلے کے اشخاص کے لیے مختلف ہوتی۔

محمد ﷺ کا قتل قبائل قریش کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا تھا لیکن خطرہ صرف یہ تھا کہ ابولہب کی وفات کے بعد اس کا جانشین (جو بھی رئیس قبیلہ ہاشم منتخب ہوتا) کہیں مطالبۂ خون بہانہ کردے۔

جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے ابولہب نے محمد ﷺ کو قبیلۂ ہاشم سے طرد کردیا تھا۔ نتیجتاً آپ ﷺ کا قتل مباح تھا۔ اگر جماعتِ قریش محمد ﷺ کو قتل کردیتی تو خون بہا لازم نہیں تھا لیکن اب (طرد ہونے کے بعد) محمد ﷺ ایک مقامی فرد کے زیرِ حمایت تھے۔ جب تک وہ شخص حمایت سے دستبردار نہ ہوتا قریش آپ ﷺ کو قتل نہیں کرسکتے تھے۔

جس شخص نے محمد ﷺ کو اپنی حمایت میں رکھا ہوا تھا وہ قریش سے متفق ہوگیا کہ اب وہ محمد ﷺ کی حمایت نہیں کرے گا۔ یہ وقت تھا کہ مجلسِ شوریٰ (دارالندوہ) نے محمد ﷺ کے قتل کا قطعی ارادہ کرلیا۔ مستقبل میں بعد از مرگ ابولہب نئے رئیس قبیلہ کے مطالبہ کی صورت کے سدِ باب کے لیے یہ طے پایا کہ محمد ﷺ کے قتل میں تمام قبائل مل کر حصہ لیں اور رئیس قبیلۂ ہاشم ابولہب بھی شرکت کرے۔ مقصود یہ تھا کہ جب سب قبیلوں کے ساتھ ابولہب بھی شریک ہوگا تو پھر آئندہ کے لیے کوئی طاقت خون بہا کا مطالبہ نہیں کرسکے گی۔

نیز جب سب اکٹھے (بلوے کی صورت میں) یہ اقدام کریں گے تو قاتل کا تعین کرنا مشکل ہوگا اور اس کی نشان دہی نہ ہوسکے گی اور اگر بفرضِ محال کسی فرد نے نشاندہی کر بھی دی تو اس کے لیے دس قبائل کی متحدہ قوت کا سامنا کرنا محال ہوگا۔ قطعی فیصلہ ہوجانے پر محمد ﷺ کے قتل میں شرکت کے لیے قبیلوں کے نمائندوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ اس میں تمام قبیلوں کے بزرگوں کے نام شامل تھے۔ ان کا خیال تھا قاتلوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی (اگر کل کو خون بہا دینا ہی پڑا) اتنا ہی ہر ایک کا مالی نقصان کم ہوگا۔

آج ہم اس دور اندیشی پر تعجب کریں گے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اہلِ مکّہ تاجر تھے اور تاجروں کے ذہن مآل اندیش ہوتے ہیں اور ہر حالت میں حسابِ سود و زیاں ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ محمد ﷺ کے منصوبۂ قتل میں بھی انھوں نے یہ پہلو ملحوظ رکھا کہ اگر کبھی خون بہا کی ادائیگی پر مجبور ہوجائیں تو یہ تمام دس قبیلوں کو ادا کرنا پڑے۔

محمد ﷺ کی ایک پھوپھی کو جن کا نام رُقیقہ بنت ابی صیفی تھا یہ اطلاع مل گئی کہ جماعتِ

قریش نے اگلی شب محمد ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔[۲]

قتل کا منصوبہ اس طرح مرتب ہوا کہ سب ہجوم کی صورت میں آپ ﷺ کے گھر پہنچیں اور آپ ﷺ جہاں بھی ہوں تلواروں سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردیں۔

رُقیقہ، محمد ﷺ کی پھوپھی فوراً آپ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا کہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کرلو۔ اگر کل رات تک تم نے کوئی بندوبست نہ کیا تو تم قتل کردیے جاؤ گے۔

آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ اب صورت حال سنگین تر ہو چکی ہے۔ ابوبکرؓ کے گھر کو چل دیے اور تمام واقعہ ان کو سنایا۔ ابوبکرؓ نے اسی رات (یعنی منصوبۂ قتل کی رات سے ایک رات پہلے) آپ ﷺ کو مکہ سے نکال کر کوہِ ثور کے ایک غار میں چھپا دیا اور عرض کی کہ یہاں سے باہر نہ جائیں اور کہا کہ میرے پاس دو تیز رفتار سفید اونٹنیاں ہیں۔ ان دونوں پر میں آپ ﷺ کو مکہ سے دور لے جاؤں گا۔ اگر ابھی اونٹوں کو شہر سے لاؤں تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ میں کچھ اس طرح کروں گا کہ قریش کو خبر نہ ہونے پائے کہ میں آپ ﷺ کو مکہ سے دور لے جا رہا ہوں یا لے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ محمد ﷺ نے ابوبکرؓ سے کہا: شہر جاؤ اور علیؓ کو میرے پاس بھجوا دو۔

علیؓ غار میں آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے اپنے عم زاد سے فرمایا: تم میری چادر اوڑھ کر آج رات میرے سونے کی جگہ تمام مدت پیٹھ کھڑکی کی طرف کر کے لیٹے رہنا اور کل رات بھی اسی طرح لیٹ جانا تاکہ قریش یہی سمجھیں کہ میں گھر پر ہی ہوں۔

علیؓ نے ابوبکرؓ کی موجودگی میں عرض کی: اے محمد ﷺ! آپ نے میرے ساتھ بڑی شفقت کا برتاؤ اور بڑی نیکیاں کی ہوئی ہیں۔ مجھے اپنے فرزند کی طرح پرورش کیا ہے۔ اگر آپ ﷺ کی نجات کے لیے میری جان چلی جائے تو میں خود کو خوش بخت سمجھوں گا۔

محمد ﷺ اور علیؓ کی مشورت سے یہ پروگرام بنا کہ اگلی رات محمد ﷺ اور ابوبکرؓ دونوں غارِ ثور

۲- رقیقہؓ بنت ابی صیفی بن ہاشم صحابی مخرمہؓ بن نوفل کی والدہ تھیں۔ انھوں نے نبی ﷺ کو خبردار کیا تھا (طبقات ابن سعد: ۲۲۳/۸) رقیقہؓ بنت صیفی، عبدالمطلب کے ساتھ بچپن میں کھیلا کرتی تھیں (اسد الغابہ) یوں رقیقہ نبی ﷺ کے والد عبداللہ کی پھوپھی لگتی تھیں۔

سے نکل کر ایک دور افتادہ غار میں جو مکہ سے زیادہ فاصلہ پر ہے، منتقل ہو جائیں گے اور چند روز و شب وہیں بسر کریں گے۔

لیکن محمد ﷺ اور ابوبکرؓ اس غار سے اس وقت تک کوچ نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ جماعتِ قریش تلاش سے تھک کر صحرا سے واپس نہ چلی جائے اور قریش کے تھک ہار کر چلے جانے کے بعد جب تک علیؓ دو بااعتماد افراد کے ساتھ دونوں مادہ اونٹوں کو غار تک نہ لے آئیں تاکہ محمد ﷺ اور ابوبکرؓ ان پر سوار ہو کر عازمِ مدینہ ہوں۔

اس روز علیؓ محمد ﷺ کے حکم کے مطابق پیغمبر ﷺ اسلام کی چادر اوڑھے پیٹھ کھڑکی کی طرف کیے پڑے رہے تاکہ قریش کی جماعت دیکھ لے۔ اسی روز صبحدم محمد ﷺ اور ابوبکرؓ غارِ ثور سے خارج ہوئے اور بیابان میں ایک دوسرے غار کی طرف چل دیے۔

ابوبکرؓ پیغمبر ﷺ اسلام کو اصلی راستے سے ہٹ کر لے جا رہے تھے تاکہ کسی کاروان یا مسافر کا سامنا نہ ہو جائے۔

اس روز رات گئے تک یہ دونوں سفر کرتے رہے یہاں تک کہ ایک دوسرے غار میں پہنچے۔[۳] راہ چونکہ سنگلاخ تھی، آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہو گئے لیکن آپ ﷺ نے پاؤں کے زخموں یا درد کی پروا نہ کی۔ ابوبکرؓ دیکھ رہے تھے کہ پیغمبر ﷺ فکرمند ہیں، اس لیے خاموش رہے لیکن انھیں یہ علم تھا کہ محمد ﷺ کس کی بابت فکرمند ہیں۔



۳- کتب سیر میں نبی ﷺ اور ابوبکرؓ کے ایک ہی غار (غارِ ثور) میں پناہ گزین ہونے کا ذکر ہے۔ (دیکھیے السیرۃ النبویہ از ابن ہشام: ۹۹/۲)

محمد ﷺ کی عظیم ترین فداکاری

پیغمبرِ اسلام ﷺ کو یہ فکر لاحق تھی کہ آج کے بعد شجرۂ حسب ونسب اور عزیزوں سے ان کا تعلق ختم ہوگیا ہے۔ صورت یہ تھی کہ عرب میں اجداد کے مجموعہ سے شجرۂ حسب ونسب مرتب ہوتا تھا اور وہ ایک بدوی عرب کے لیے آج کے شناخت نامے سے زیادہ قابلِ قدر تھا۔

آج اگر ہم اپنا شناخت نامہ گم کردیں تو دوسرا حاصل کرسکتے ہیں لیکن جب ایک بدوی عرب اپنے خاندانی شجرہ سے منقطع ہوجاتا تھا تو وسیلۂ معاش کیا خود کو بھی سالم نہیں دیکھتا تھا۔ شجرۂ خانوادگی اور قبیلہ ایک ہی چیز تھے۔ جو شخص اپنا رابطہ قبیلے سے منقطع کردیتا تھا، مفلس ترین شخص گردانا جاتا تھا اور وہ مادی وروحانی لحاظ سے خود کو اس جہان ہی سے نابود سمجھتا تھا۔

میں اس موضوع کو اس لیے زیادہ طول دے رہا ہوں کیوں کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ اسلامی مؤرخوں نے محمد ﷺ کی اس فداکاری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

میرے خیال میں ایمان کی راہ میں محمد ﷺ کی سب سے بڑی فداکاری یہی تھی کہ اپنے قبیلے سے رابطہ قطع کیا اور مکّہ سے بطرف مدینہ ہجرت کی۔ محمد ﷺ بہت بڑی فداکاری کرکے خوش تھے کہ میں نے خدا کے حکم کی اطاعت میں قبیلے سے قطع روابط کیا ہے۔

رات کی تاریکی ہر طرف پھیل گئی۔ محمد ﷺ اور ابوبکرؓ ابھی تک راہ چل رہے تھے۔ سنگلاخ راستہ ختم ہوچکا تھا، اس لیے چلنے میں اب آسانی ہوگئی تھی۔

بالآخر صبح کی پہلی کرنوں کے ساتھ وہ اس غار تک پہنچ گئے، جہاں ابوبکرؓ، محمد ﷺ کے ساتھ پناہ لینا چاہتے تھے۔ ابوبکرؓ مکّہ کے مالدار افراد میں شمار ہوتے تھے، گو کہ اپنے مال وجائیداد کو خدا کی راہ میں خرچ کرچکے تھے اور دولت میں اب کمی واقع ہوچکی تھی۔ تاہم اب بھی دولت مند سمجھے جاتے تھے۔ جب وہ غار میں پہنچے تو ابوبکرؓ نے اس کو اپنے ہاتھوں صاف کیا اور

اپنی چادر پھاڑ کر مختلف سوراخ بند کیے کہ سوراخوں سے سانپ نکل کر محمد ﷺ کو ڈس نہ لیں۔ جب ہر طرح سے مطمئن ہوگئے تو محمد ﷺ کو غار میں داخل ہونے کی دعوت دی۔

جب محمد ﷺ غار میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے پاؤں زخمی تھے، چنانچہ پاؤں پر ابوبکرؓ نے کپڑا باندھا۔ کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جس پر آرام کرنے کے لیے آپ ﷺ تکیہ کرتے، لہٰذا ابوبکرؓ نے خواہش کی کہ آپ ﷺ میری گود میں سر رکھ کر استراحت فرمالیں۔

لیکن محمد ﷺ جانتے تھے کہ ابوبکرؓ بھی تھکے ماندے ہیں اور انھیں بھی آرام کی ضرورت ہے، لہٰذا اسی طرح سر کو زمین پر رکھ کر استراحت فرمانے لگے۔

روایت ہے کہ ابوبکرؓ سونے سے پہلے ایک سوراخ پر جسے بند کرنے کو کپڑا کافی نہیں ہوا تھا اور وہ کھلا رہ گیا تھا، اپنا پاؤں رکھ کر سوگئے۔ سانپ جو اس سوراخ میں تھا، باہر نکلنا چاہتا تھا مگر سوراخ کا منہ ابوبکرؓ کی ایڑی سے بند تھا، لہٰذا اس نے ایڑی پر ڈس لیا۔ درد کی وجہ سے ابوبکرؓ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ چہرہ پسینہ سے تر ہوگیا اور محمد ﷺ جو کہ ساتھ ہی سوئے ہوئے تھے، چہرے پر پسینے کے قطرے گرنے سے بیدار ہوگئے۔

بیدار ہونے پر محمد ﷺ نے جب ابوبکرؓ کی حالت متغیر دیکھی تو پوچھا: آپ کو کیا ہوا ہے؟ جب معلوم ہوا کہ سانپ نے ڈس لیا ہے تو جس جگہ سانپ نے ڈسا تھا، اس جگہ لعابِ دہن لگادیا۔ ابوبکرؓ نے آرام محسوس کیا اور سوگئے۔

اس رات جب کہ محمد ﷺ ان سانپوں والے غار (غارِ مار) تک پہنچنے کے لیے سفر کر رہے تھے، قریش کے افراد نے محمد ﷺ کے گھر پر حملہ کیا تاکہ آپ ﷺ کا کام تمام کردیں۔ لیکن محمد ﷺ کو گھر میں نہ پاکر علیؓ سے پوچھا کہ آیا محمد ﷺ مکّہ سے جاچکے ہیں؟

علیؓ راست گو آدمی تھے اور جھوٹ نہیں بول سکتے تھے لہٰذا کہا: ہاں وہ جاچکے ہیں۔

جماعتِ قریش اسی لمحے آپ ﷺ کی جستجو میں مکّہ سے نکل کھڑی ہوئی اور اطراف کے بیابانوں میں پھیل گئی۔ ضمناً مکّہ میں اعلان کردیا گیا کہ ہر اس شخص کو جو محمد ﷺ کے متعلق مصدقہ اطلاع فراہم کرے گا تاکہ ہم اسے گرفتار کرسکیں، ایک سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔

قبائل قریش کا ایک گروہ جن کے پاس تیز رفتار اونٹ تھے، دوسرے روز غارِ ثور والے علاقہ میں پہنچ گئے۔ غارِ ثور کے سامنے سے گزرے۔ غار کو دیکھا مگر اس میں داخل نہ ہوئے۔ ایک روایت ہے کہ خداوند کے حکم سے ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر اپنے تاروں سے پردہ بن دیا تھا۔ افرادِ قریش نے جب تاروں کا پردہ دیکھا تو سمجھے کہ اس غار میں کبھی کوئی داخل ہی نہیں ہوا۔ اگر کوئی داخل ہوتا تو مکڑی کے جالے کا پردہ ٹوٹ چکا ہوتا۔ پس پہلا گروہ گزر گیا۔ دوسرا گروہ پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ غار کے دہانے میں پرندوں نے اپنے گھونسلے میں انڈے دیے ہوئے ہیں، لہٰذا انھوں نے ایک دوسرے سے کہا: یقیناً محمد ﷺ اس غار میں نہیں، اس لیے کہ پرندوں کا گھونسلا اور تارِ عنکبوت کا پردہ دونوں صحیح سالم حالت میں ہیں۔ اگر کوئی غار میں داخل ہوا ہوتا تو یہ دونوں تباہ ہو چکے ہوتے"۔

مطابقِ روایت دوسرے گروہ کے گزر جانے کے بعد بحکمِ خداوندی ایک پتھر پہاڑ کے اوپر سے سرکا اور غار کے دہانہ پر آ ٹھیرا کہ اس میں کوئی داخل نہ ہو سکے۔

غار کے اندر ابوبکرؓ پر جو تھکے ہوئے اور سانپ کے ڈسنے سے تکلیف میں تھے، وحشت و خوف طاری ہوا جاتا تھا۔ پیغمبر ﷺ نے انھیں تسلی دی اور خدا کی مدد کے امیدوار ہوئے۔

سورۂ توبہ کی آیت ۴۰ میں اسی بابت خداوند نے فرمایا ہے:

﴿ إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ ...... الی اخر﴾ "اگر تم لوگ پیغمبر کی مدد نہیں کرو گے (تو کوئی پروا نہیں) اللہ نے تو آپ ﷺ کی اس وقت بھی مدد کی تھی جب کفار نے آپ کو (مکہ سے) جلاوطن کر دیا تھا اور دو افراد میں سے ایک آپ تھے جو غار میں بسیرا کیے ہوئے تھے۔ پیغمبر ﷺ نے اپنے رفیق سے کہا: غم نہ کر اس لیے کہ خداوند ہمارے ساتھ ہے اور ایسا ہوا کہ خداوند نے اس پر اپنی سکینت نازل کی (ابوبکرؓ کو قرار آ گیا)........." (سورۂ توبہ: ۴۰)

محمد ﷺ اور ابوبکرؓ تین دن رات اس غار میں رہے۔

تین روز کی مسلسل تلاش کے بعد قریش تھک ہار کر مکہ واپس چلے گئے تو ابوبکرؓ کا غلام عامر بن فہیرہ دو سفید اونٹنیوں کے ساتھ غار پر پہنچا۔

محمد ﷺ اور ابوبکرؓ اونٹنیوں پر سوار ہو گئے اور مدینہ کی راہ لی۔ اس خطرے سے کہ تعاقب کرنے والوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں، بہتر سمجھا کہ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کریں۔

ابوبکرؓ کے پاس چادر نہ تھی۔ محمد ﷺ بھی مکہ میں جب جلدی سے ابوبکرؓ کے گھر گئے تھے تو اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ لباس ساتھ لے لیتے۔

دونوں کے جسموں پر لباس میلا چکٹ ہو چکا تھا۔ جو کوئی بھی انھیں راہ میں دیکھتا، متعجب ہوتا کہ یہ کیسے بوسیدہ اور میلے لباس والے انسان ہیں جو عربستان کی بہترین سواری یعنی سفید مادہ اونٹوں پر سوار ہیں۔ قریش نے ہر جگہ اپنے ڈھنڈورچیوں کے ذریعے اعلان کروا دیا تھا کہ جو کوئی بھی محمد ﷺ کو پکڑوائے گا یا پکڑ کر ہماری تحویل میں دے گا، اسے ایک سو اونٹ انعام ملے گا۔

اسی دن قبیلہ بنی مدلج کا رئیس سراقہ بن مالک کچھ افرادِ قبیلہ کے ساتھ اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دو افراد آئے اور کہا کہ آج ہم نے دو افراد دیکھے ہیں جو سفید اونٹنیوں پر سوار تھے اور ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے ان میں سے ایک محمد ﷺ تھا۔ سراقہ بن مالک رئیس قبیلہ بنی مدلج سنتے ہی سمجھ گیا کہ ان دو میں سے ایک محمد ﷺ ہے جس کے سر کی قیمت ایک سو اونٹ مقرر ہوئی ہے اور چونکہ رئیس قبیلہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں بھی انعام کی رقم میں شریک ہوں، ان سے کہا کہ تمھیں اشتباہ ہوا ہے، وہ دونوں سوار کل رات میرے مہمان تھے اور آج یہاں سے گئے ہیں۔

جب وہ دونوں اشخاص چلے گئے۔ سراقہ بن مالک اپنے قبیلے کے چند افراد کے ساتھ (قبیلہ بنی مدلج، قریش کے حلیفوں میں سے تھا) گھوڑوں پر سوار ہو کر محمد ﷺ کو پکڑنے کے لیے نکل پڑا تا کہ انھیں ﷺ قریش کے حوالے کر کے انعام حاصل کر سکے۔ چونکہ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اس لیے جلد ہی محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کو جا لیا۔ گھوڑے کی لگام کھینچی کہ محمد ﷺ کے نزدیک ہو مگر گھوڑے نے اگلے پاؤں اٹھا لیے۔

سراقہ بن مالک نے تین بار گھوڑے کو ایڑ لگائی مگر وہ اگلے پاؤں اُٹھالیتا۔ اعراب اس جاہلیت کے دور میں فال پر بہت عقیدہ رکھتے تھے۔ جب گھوڑے نے تین بار یہی حرکت کی تو سراقہ نے فال نکالی کہ محمد ﷺ کو پکڑ کر قریش کے حوالے کرے یا نہ کرے، فال بری نکلی۔

لیکن پھر بھی چوتھی بار گھوڑے کو ایڑ لگائی مگر اس بار بھی گھوڑے نے وہی حرکت کی اور اونٹوں کے نزدیک نہ ہوا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ابوبکرؓ کا غلام (عامر بن فہیرہ) اور ایک دوسرا غلام (جو آزاد کردہ غلام تھا) محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کے ہمراہ تھے۔ عامر رہنما تھا۔ ابوبکرؓ اسی لیے اسے ساتھ لائے تھے کہ وہ اس راہ سے آشنا تھا۔

جس وقت سراقہ نے دیکھا کہ چوتھی بار بھی گھوڑے نے وہی حرکت کی ہے اور ساتھ نہیں دیا اور فال بھی بد نکلی ہے تو گھوڑے سے اترا اور محمد ﷺ کو آواز دی: یا محمد ﷺ! ٹھیرو میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

سراقہ نے اپنا گھوڑا ایک ساتھی کو دیا۔ پیادہ پا محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کے نزدیک گیا اور کہا: یا محمد ﷺ! میں قریش کا اتحادی ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کو گرفتار کر کے قریش کے حوالے کردوں اور ایک سو اونٹ حاصل کروں۔ لیکن مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم مردِ برحق ہو، اس لیے کہ میرا گھوڑا چار بار رک گیا اور تمھارے نزدیک نہیں آیا۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ایک دن تم قریش پر تسلط حاصل کرلو گے اور اس دن کے لیے میں تم سے امان چاہتا ہوں۔

محمد ﷺ نے پوچھا: تمھارا عندیہ کیا ہے؟

سراقہ بن مالک نے کہا: میرا عندیہ یہ ہے کہ اس روز جب تم قریش پر غلبہ حاصل کرو، مجھے ان کے حلیف ہونے کے ناطے قریش کے ساتھ قتل نہیں کرو گے اور میرے قبیلے کو تباہ نہیں کرو گے۔

محمد ﷺ نے جواب میں فرمایا: تُو اس دن امان میں ہوگا اور تیرے قبیلے کو کوئی آزار نہیں پہنچے گا۔

سراقہ بن مالک جو محمد ﷺ کے تعاقب میں آیا تھا، اس کے بعد جس کسی کو محمد ﷺ کے تعاقب میں آتے دیکھتا، گمراہ کردیتا اور کہتا کہ محمد ﷺ دوسرے راستے سے چلے گئے ہیں۔ سراقہ بن مالک بعد میں مسلمان ہوگیا تھا اور اسلام کے نامور سرداروں میں سے ہوا۔

دو روز بعد محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کا ایک کاروان سے سامنا ہوا۔ اس کاروان کے ساتھ آپ ﷺ کا چچازاد بھائی (زبیر بن العوام) بھی سفر کر رہا تھا۔ محمد ﷺ نے اس سے لباس اور کھانے کا سامان حاصل کیا۔

دو روز اور گزرنے پر وہ قبیلہ اسلم میں پہنچے تو ان کے ایک ذیلی قبیلہ اوس نے رضاکارانہ طور پر ایک رہنما جس کا نام مسعود تھا، آپ ﷺ کے ہمراہ کردیا کہ آپ ﷺ کو مدینہ کی راہ پر لے جائے۔

صحرائے عربستان میں ایک راہنما فقط راہ ہی نہیں پہچانتا تھا بلکہ ایک طرح کا پاسپورٹ ہوتا تھا اور وہ بھوک پیاس کے وقت بھی کام آتا تھا۔ وہ شخص جو کہ صحرا میں رہنما کی معیت میں سفر کرتا، راہ کو گم نہیں کرتا تھا۔ وہ راہزنوں سے محفوظ رہتا اور بھوکا اور تشنہ نہیں رہتا تھا۔ اس لیے کہ صحرا میں راہنما کو سبھی پہچانتے ہوتے ہیں۔ وہ جب دور سے ہی آواز دے کر اپنا تعارف کرواتا تو راہ روکنے والے راہ چھوڑ دیتے تھے، لہٰذا جو شخص صحرائے عرب میں راہنما کے ساتھ سفر کرے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی اور کوئی شخص اس کی جان و مال کے درپے نہیں ہوتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے رئیس قبیلہ اوس کی پیشکش قبول فرمائی اور مسعود کو بطور راہنما ساتھ لیا۔ مسعود نے آپ ﷺ سے کہا کہ وہ صرف اپنے قبیلے کی حدود تک آپ کی راہنمائی کرسکتا ہے اس کے بعد واپس چلا جائے گا اور مدینہ تک کی بقیہ راہ آپ کو بغیر راہنما کے طے کرنا ہوگی۔

محمد ﷺ نے اس بات کو بھی قبول کیا۔ مسعود کی راہنمائی میں سفر شروع کردیا۔ مسعود اپنے قبیلے کی حدود تک ساتھ آیا اور آخری حد پر کہا کہ اس سے آگے وہ نہیں جاسکتا، اس لیے کہ قبیلے کی حدود یہاں ختم ہیں۔ محمد ﷺ اور ابوبکرؓ نے اسے واپسی کی اجازت دے دی۔

آپ ﷺ قبیلہ اوس کی حدود سے نکلنے کے بعد قبا کی حدود میں داخل ہوئے۔ قبا پہنچ کر محمد ﷺ ٹھیر گئے اور ابوبکرؓ سے کہا: یہ مادہ شتر جس پر میں سوار ہوں، میرے ہاتھ بیچ دیں۔ ابوبکرؓ نے عرض کی: میں آپ ﷺ کے ہاتھ کیوں بیچوں؟ میں یہ قصیہ بطور ہدیہ آپ ﷺ کو دیتا ہوں (قصیہ عربی میں شتر اصیل کو کہتے ہیں اور اس سے بارکشی کا کام نہیں لیتے بلکہ اسے سواری اور دوڑ کے مقابلوں میں شرکت کے لیے رکھتے تھے)۔

آپ ﷺ نے ابوبکرؓ کے جواب میں فرمایا: میں جانتا ہوں آپ نے اپنا مال واسباب خدا کی راہ میں اسلام کی پیش رفت کے لیے خرچ کیا ہے، لیکن یہ مادہ شتر (قَصواء) میں اپنے لیے چاہتا ہوں کہ اس پر سواری کروں۔ اس کو بہر حال ہبہ نہ کریں بلکہ اس کی قیمت بتائیں تا کہ میں ادا کروں۔

عربستان میں مادہ شتر اصیل جو کہ سواری یا دوڑ کے لیے رکھی جاتی، اس کے کان تھوڑے سے کاٹ دیا کرتے تھے، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ تھوڑے کان کٹ جانے سے وہ تیز تر دوڑتے ہیں۔ اس قسم کے کان کٹے مادہ اونٹ کو قَصواء کہتے تھے۔ محمد ﷺ جس مادہ شتر پر سوار تھے وہ گوش بریدہ تھی، اس لیے اس کو گفتگو میں (قَصواء) کا نام دے رہے تھے۔

ابوبکرؓ نے جب محسوس کیا کہ آپ ﷺ اسے بطور ہدیہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں تو اس (قَصواء) کو بعوض چہار صد درہم محمد ﷺ کو بیچ دیا۔ مادہ شُتر محمد ﷺ کی ملکیت ہوگئی۔ اور اسی مادہ شتر کا نام تاریخِ اسلام میں قَصواء مشہور ہوا اور باقی رہا۔ تمام وہ مسلمان جو آپ ﷺ کی ہجرت کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ محمد ﷺ ایک مادہ شتر باسم قَصواء پر سوار ہو کر مکّہ سے مدینہ تشریف لائے تھے۔



اسلام اور دنیا میں ہجرت کی اہمیت

محمد ﷺ کی ہجرت تاریخِ اسلام کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ہجرت کے بعد ہی اسلامی جمعیت نے ایک امت کی شکل اختیار کی۔ نسلی اور طبقاتی اختلافات مٹ گئے، خصوصاً اشراف کی بڑائی اور رؤسائے قبائل کے حقوق، اور اسی طرح مختلف قبائل سے وابستگیاں ختم ہوگئیں۔ تمام مسلمان حقوق میں مساوی ہوگئے۔

ہجرت قدیم اور جدید کے درمیان حدِ فاصل ثابت ہوئی اور عہد جاہلیت کو اسلامی دور سے جدا کر گئی اور اس نے ہر طرح کے طبقاتی و قبائلی برتری کی بیخ کنی کی۔ جب محمد ﷺ نے قبا میں قیام فرمایا، عمرؓ بن الخطاب جیسے شخص جو مکہ کے درجہ اوّل کے افراد میں سے تھے۔ جو قامت میں دو میٹر لمبے اور جن کی آواز میں بجلی کی سی کڑک تھی اور لوگوں میں مشہور تھا کہ ابلیس بھی ان سے وحشت زدہ رہتا ہے، وہ مسجد کی تعمیر کے لیے مٹی اور پتھر اُٹھاتے تھے۔ عمر جو مٹی لاتے، محمد ﷺ اور ابوبکرؓ اس سے گارا تیار کر کے دیتے تھے۔

قبل از اسلام کیسی ہی صورت کیوں نہ ہوتی، عمرؓ بن الخطاب کو تمام عرب کی دولت ہی کیوں نہ دے دی جاتی، وہ کبھی ایک پتھر بھی اُٹھا کر دوسری جگہ لے جانے پر آمادہ نہ ہوتے کجا یہ کہ وہ مٹی ڈھوئیں، اس لیے کہ تمام تعمیراتی کام مکہ کے اشراف کے گھروں میں غلاموں کے ذمہ ہوتا تھا۔ اور اشراف خود کو اس سے بہت بالاتر سمجھتے تھے کہ اپنے ہاتھ گارے سے آلودہ کریں۔ قبا، مدینہ کے جنوب میں واقع تھا اور جزو یثرب شمار ہوتا تھا۔

مغرب کے مؤرخین کہتے ہیں کہ محمد ﷺ ۲ ستمبر ۶۲۲ عیسوی کو وارِدِ قبا ہوئے تھے لیکن مؤرخین اسلامی قبا میں ورود کی تاریخ ۱۶ر جولائی ۶۲۲ عیسوی بتاتے ہیں اور چونکہ وہ دن ماہِ محرم کا تھا، لہٰذا مسلمانوں نے اوّل ماہِ محرم کو ہجری سال کی ابتدا قرار دیا۔ تمام مسلمان قومیں اس سن سے ہجری سن شمار کرتی ہیں۔

ہجرت نبوی
(۱۶ جولائی ۶۲۲ء)

مدینہ منورہ

قبا

حجاز

مکہ مکرمہ

مسلمان مؤرخین کے مطابق اگر محمد ﷺ ۱۶ر جولائی کو وارد قبا ہوئے تو ان دنوں موسم گرما کی مناسبت سے ہوا بہت گرم تھی۔ قبا کے لوگوں کو اطلاع مل چکی تھی کہ محمد ﷺ اس دن قبا کی حدود میں داخل ہوں گے۔ وہ صبحدم گھروں سے باہر جمع ہو کر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آفتاب بلند ہوا۔ ہوا گرم ہوگئی تو لوگ گرمی کو برداشت نہ کر سکے اور گھروں کو چلے گئے۔

جب آفتاب نصف النہار پر پہنچا۔ زمین آفتاب کی تپش سے اس قدر گرم ہو چکی تھی کہ ننگے پاؤں گھر سے باہر نکلنا محال تھا۔ اس گرم دوپہر میں آپ ﷺ اور ابوبکرؓ قبا میں داخل ہوئے۔ کوئی شخص گلیوں میں نہیں تھا کہ آپ ﷺ کے ورود کا شاہد ہوتا، بجز ایک یہودی کے جس کا تاریخ نے نام ثبت نہیں کیا ہے، وہ اس موقع پر ایک گلی میں موجود تھا۔

دوسرے لوگوں کی طرح یہ یہودی بھی جانتا تھا کہ آج محمد ﷺ وارد قبا ہوں گے۔ جیسے ہی اس نے دو مادہ شتر سفید دیکھے اور دونوں سواروں کا مشاہدہ کیا تو وہ جان گیا کہ محمد ﷺ آگئے ہیں۔ اس وقت وہ قبا کی گلیوں میں آوازیں لگاتا ہوا دوڑا: ''اے یہودیو! آگاہ رہو تمھارا اقبال آگیا ہے''۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، مسلمانوں کی طرح مدینہ کے یہودی بھی آپ ﷺ کی آمد کے منتظر تھے تاکہ ان اختلافات کا خاتمہ ہو جنھوں نے ان کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔

لوگوں نے جب اس کی آواز سنی تو گھروں سے دوڑتے ہوئے باہر آئے۔

نہ صرف مرد وزن بلکہ بچے بھی اس گرم دوپہر میں گھروں سے باہر آگئے کہ محمد ﷺ کا دیدار کر سکیں اور مشاہدہ کریں کہ خدا کے پیغمبر کی شکل و شباہت کیسی ہے۔

آپ ﷺ اور ابوبکرؓ نے کھجور کے دو درختوں کے مقابل دونوں اونٹوں کو بٹھایا اور نیچے تشریف لے آئے اور کھجوروں کے سائے میں بیٹھ گئے۔

قبا کے تمام لوگ کیا مسلمان کیا یہودی، محمد ﷺ و ابوبکرؓ کے مقابل اکٹھے ہو گئے، مگر وہ یہ نہ جانتے تھے کہ دونوں میں سے پیغمبر ﷺ کون ہے۔

ابوبکرؓ نے خیال کیا ممکن ہے کہ لوگ اشتباہ میں پڑ جائیں اور انھیں پیغمبر ﷺ اسلام تصور

کر لیں، چنانچہ وہ محمد ﷺ کے پیچھے ہو گئے اور ایک چادر کو جو دورانِ سفر (زبیر بن العوام) سے لی تھی، سایہ بان کی طرح آپ ﷺ کے سر پر پھیلا کر کھڑے ہو گئے کہ آفتاب کی تپش آپ ﷺ تک نہ پہنچے۔

ویسے بھی کھجور کے دونوں درختوں کا سایہ اس قدر نہ تھا کہ ان دونوں کو آفتاب سے محفوظ رکھ سکے، لہٰذا چادر کے تن جانے سے سایہ بہتر ہو گیا۔

جب لوگوں نے محمد ﷺ کو پہچان لیا اور عربوں کی رسم کے مطابق ہلہلہ (سلام) کیا۔

وہ جگہ جہاں محمد ﷺ اور ابوبکرؓ نے ورود فرمایا، اس محلّہ کا نام (بنی عمرو بن عوف) تھا۔

محمد ﷺ نے پوچھا: یہ جگہ کس کی ہے؟

ہجوم میں سے ایک نوجوان آگے بڑھا اور کہا: یہ زمین میری ہے اور ان دونوں درختوں کو میں نے لگایا تھا۔ محمد ﷺ نے فرمایا: میرا مطلب صرف صاحبِ زمین (جو معلوم ہوا کہ تم ہو) سے اجازت حاصل کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں ان دونوں نخل (درختوں) کے نیچے سکونت کر لیں۔

نوجوان نے عرض کی: ''ہاں، یا محمد ﷺ! آپ جب تک چاہیں یہاں ٹھیر سکتے ہیں''۔

لیکن ان قبا کے مسلمانوں میں سے ایک فرد جس کا نام کلثوم تھا آگے بڑھا اور محمد ﷺ و ابوبکرؓ کو دعوت دی کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور آرام فرمائیں۔

محمد ﷺ اس کی دعوت کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے، پس فرمایا: تمھارے لیے باعثِ زحمت ہوں گے۔ لیکن کلثوم نے عرض کی: یا محمد ﷺ! میرے گھر میں ایک حجرہ خالی ہے اور اس میں ہماری سکونت نہیں ہے۔ ہم اس سے کچھ استفادہ بھی نہیں کر رہے۔ آپ ﷺ اور ابوبکرؓ وہاں قیام کر سکتے ہیں۔ میں آپ ﷺ کے اونٹوں کی حفاظت کرتا ہوں اور چارہ وغیرہ ڈالتا ہوں۔

محمد ﷺ نے کلثوم کی دعوت قبول فرمائی۔ اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس حجرے میں قیام فرمایا۔ اسی دن مدینہ والوں کو خبر ہو گئی کہ محمد ﷺ تشریف لا چکے ہیں تو سب سے پہلے جو صاحب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ عمرؓ بن الخطاب تھے۔ عمرؓ بن خطاب کے بعد باقی سب مسلمان آنے شروع ہو گئے۔ لوگ اتنی تعداد میں جمع ہو گئے کہ حجرہ ناکافی ثابت

ہوا۔ لہٰذا ایک اور مسلمان سعد بن خیثمہ نے اپنا گھر خالی کروایا جو کہ خاصا وسیع تھا اور محمد ﷺ کی تحویل میں دے دیا تا کہ آپ ﷺ وہاں مسلمانوں کی پذیرائی فرمائیں۔ محمد ﷺ اس وسیع مکان میں مسلمانوں کی پذیرائی میں مصروف ہو گئے لیکن وقتِ خواب و استراحت کلثوم کے گھر چھوٹے حجرے میں واپس تشریف لے جاتے۔

قبا میں تشریف لانے کے تیسرے دن پیغمبر ﷺ اسلام نے ارادہ فرمایا کہ اس جگہ ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ ایک مسلمان نے زمین پیش کرنا چاہی لیکن آپ ﷺ نے اس کے ہدیہ کو قبول نہ فرمایا اور فرمایا کہ یہ زمین میں تم سے خریدوں گا اور پھر خرید کر لی۔

زمین کی قیمت کا اسلامی تاریخوں میں ذکر نہیں ہے لیکن اس پر تمام متفق ہیں کہ محمد ﷺ نے مسجد قبا کی زمین خرید کی تھی۔ مسجد قبا پہلی مسجد ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کی اور اس مسجد کی تعمیر میں تمام مسلمانوں نے، کیا انصار کیا مہاجر، سب نے شرکت کی۔ خود محمد ﷺ ابوبکرؓ کے ساتھ مل کر گارا اور اینٹیں بناتے تھے۔ عمرؓ بن الخطاب کندھوں پر پتھر اُٹھا کر لاتے یا مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر کر لاتے تا کہ گارا اور اینٹیں تیار ہوں۔

مسجد قبا اس لحاظ سے بھی اوّلین مسجد ہے کہ اس کی تعمیر میں تمام مسلمانوں نے شرکت فرمائی اور وہ بھی اشراف مثل ابوبکرؓ، عمرؓ تھے۔ صہیب بن سنان رُومی مزدوروں کی طرح مسجد کی تعمیر کے لیے پتھر ڈھوتے اور محمد ﷺ بھی دوسروں کی طرح صبح سے شام تک برابر کام کرتے تھے۔

محمد ﷺ نے بیس دن قبا میں قیام کیا یہاں تک کہ مسجد مکمل ہو گئی۔ پھر مدینہ شہر میں قدم رکھا۔ اس وقت مدینہ کا نام یثرب تھا۔ یثرب عربی زبان میں اس جگہ کو کہتے ہیں جو انسان کو آزار پہنچانے والی ہو یا وہ جگہ جہاں انسان صحت مند نہ رہ سکتا ہو۔

بدوی عربوں نے اس شہر کا یہ نام رکھا تھا۔ عربوں نے چونکہ صحرا میں بارش نہیں دیکھی تھی جو کبھی کبھار ہوتی، وہ بھی فصلِ بہار میں، لہٰذا عرب جب مدینہ میں داخل ہوتے تو اس کی بارشوں کی وجہ سے بیمار ہو جاتے۔ اسی وجہ سے بدوی عرب اس شہر کو بری آب و ہوا والا شہر سمجھتے تھے اور اسے یثرب کہتے تھے، حالانکہ مقامی لوگ اسے "طیبہ" کہتے تھے یعنی "شہر مطلوب"۔

شہر مدینہ کا پہلا نام "طیبہ" تھا۔ جب انسان عربستان کے بیابانوں سے اس شہر میں قدم رکھتا تو محسوس کرتا جیسے وارد بہشت ہو گیا ہو۔

بدوی لوگ جو بیابان کی خشک ہواؤں میں زندگی بسر کرتے تھے، جب "طیبہ" میں داخل ہوتے تو اس کی مرطوب آب و ہوا میں بیمار ہو جاتے تھے لیکن کچھ مدت قیام کے بعد عادی ہو جانے پر یہاں کی آب و ہوا ان کے لیے مزید بیماری کا باعث نہ بنتی تھی۔

اکثر مہاجرین جو مکّہ سے آئے تھے اسی وجہ سے بیمار ہو گئے تھے، حتیٰ کہ محمد ﷺ اور ابوبکرؓ اور ان کے آزاد کردہ غلام عامرؓ بن فہیرہ بھی مدینہ میں آنے کے بعد بیمار ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ اس شہر کے متضاد نام انتخاب کیے گئے۔

محمد ﷺ جب اس شہر میں مقیم ہوئے تو ان دو ناموں کے تضاد کو ختم کرنے کے لیے کہ کسی وقت انصار اور مسلمین مکّہ (مہاجروں) کے مابین اختلاف کا باعث نہ ہو، دونوں ناموں کو ختم کر کے اس کا نام مدینہ رکھا۔ "مدینہ" سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ یہ نام خوبیوں والا ہے نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بری آب و ہوا والا ہے۔

محمد ﷺ کے ورودِ مدینہ کے وقت اس شہر کی مساحت تیس کلومیٹر مربع تھی۔ شہر مدینہ میں معمولی گھروں کے علاوہ ۷۲ قلعے تھے جن میں سے ۵۹ یہودیوں کے اور ۱۳ عربوں کے تھے۔

قلاع مذکور مضبوط دیوار والے شمار ہوتے اور بوقتِ خطر ان کے مکین دشمن کے حملے سے محفوظ رہتے تھے۔ مدینہ ایک مرتفع وادی (فلات) میں واقع ہے کہ ان دنوں اس کا طول ایک دن میں طے کیا جاتا تھا اور عرض بھی اونٹ سے ایک دن کی راہ تھی۔

مدینہ میں دو پہاڑ شمالاً جنوباً واقع ہیں اور تین دشت آتش فشانی مادہ کے شرقاً غرباً اور جنوباً واقع ہیں۔[1] مدینہ کی آب و ہوا آج کی طرح ان دنوں بھی معتدل تھی۔ بارشیں دوسرے مقامات

۱- یہ آتش فشانی دشت حرات کہلاتے ہیں۔ مشرق میں حرہ واقم ہے اور مغرب میں حرہ وبرہ واقع ہے جب کہ تیسرا حرہ الکرماء قبا کے جنوب میں ہے۔ [اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، لاہور]

کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔ شہر کے کنارے ایک جوہڑ (برکہ) تھا کہ اس میں بارش کا پانی جمع رہتا اور یہ سارا سال خشک نہیں ہوتا تھا۔ محمد ﷺ جب خردسال تھے (آغاز میں ذکر آچکا ہے) تو تیرنا اسی جوہڑ میں سیکھا تھا۔ وہ طفل جس کے لیے مکّہ میں ایسے مواقع میسر نہ تھے، اس نے مدینے کے اس جوہڑ میں تیرنے اور نہانے میں بڑی لذت حاصل کی۔ ساکنان مدینہ بھی مثل مکّہ مختلف قبائل میں منقسم تھے اور ہر شخص کسی نہ کسی قبیلہ سے منسوب تھا۔ مدینہ میں بھی مثلِ مکّہ نہ پولیس، نہ زنداں اور نہ عدالت ہی تھی۔ اگر کسی پر ظلم ہوتا تو وہ اپنے قبیلے سے رفع ظلم کے لیے مدد مانگتا۔

مدینہ میں بھی مکّہ کی مثل قتل کوئی گناہ شمار نہیں ہوتا تھا۔ صرف ایک نقصان تصور ہوتا تھا اور دستور یہی تھا کہ قاتل کا قبیلہ مقتول کو خون بہا ادا کرے۔

ایک عام آدمی کا خون بہا کم از کم ایک سو اونٹ ہوتا تھا لیکن بڑے لوگوں یعنی اشراف، امرا اور روسا کا خون بہا بہت زیادہ مانگا جاتا تھا۔

مدینہ میں عربوں اور یہودیوں کی آبادی تقریباً مساوی تھی۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے تھے اور اسی طرح عربوں کے بھی تین ہی بڑے قبیلے مدینہ میں رہائش پذیر تھے۔

مدینہ کے عرب زراعت پیشہ تھے یا جانور پالتے تھے۔ بہت تھوڑے افراد نے تجارت کو بطور پیشہ اپنایا ہوا تھا۔ یہودیوں کے تینوں قبیلے پیشہ کے لحاظ سے مختلف تھے۔ ان میں سے ایک زراعت پیشہ، دوسرا زرگر اور تیسرا قبیلہ دباغ (کھالوں سے چمڑہ تیار کرنے والا) تھا۔

عرب قبائل گاہے بہ گاہے آپس میں برسرِ پیکار ہو جایا کرتے تھے۔ ان میں ایک بنیادی وجہ نزاع (قبل از اسلام) زمین تھی۔ لیکن اس نزاع سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا، بجز ایک شخص عبداللہ بن ابی کے۔ اس کے لیے قبیلوں کا لڑائی جھگڑا سودمند تھا۔ کچھ ساکنانِ مدینہ نے یہ طے کیا کہ اسے اپنا بادشاہ بنالیں، حتیٰ کہ زرگر اس کے سر کا ماپ بھی لے گئے تاکہ اس کے لیے تاج بنائیں۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ محمد ﷺ مدینہ آجائیں گے اور ہم سب کے حاکم ہوں گے اور وہ جھگڑوں اور اختلافات کو ختم کردیں گے تو وہ عبداللہ بن ابی کے انتخاب سے صرفِ نظر کر گئے۔

محمد ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے قبل اس شہر میں ایک شخص بنام اشلق قتل کی نوعیت کے لحاظ سے خون بہا کا تعین کیا کرتا تھا، نیز جرائم کے سلسلہ میں قصاص کا تعین کیا کرتا تھا۔

ہجرت سے قبل مکّہ میں یہی عہدہ ابوبکرؓ کو تفویض کیا گیا تھا۔ جب کبھی قتل، آنکھ کا ضائع ہونا یا دانت کا ٹوٹ جانا یا کوئی اور جرم وقوع پذیر ہوتا تو لوگ ابوبکرؓ کی طرف رجوع کیا کرتے اور وہ میزانِ خون بہا یا دیت کا تعین فرماتے۔

میزان دیت یا خون بہا مدینہ میں بھی مثل مکّہ تھی اور اس میں کوئی تفاوت نہیں تھا۔ ہر دو جگہ ایک عام شخص کے قتل کا خون بہا ایک سو اونٹ تھا۔ ایک آنکھ کے ضائع ہونے پر پچاس اونٹوں کا مطالبہ کیا جاتا۔ لیکن دانت توڑنے کا بدلہ یا قصاص یہی تھا کہ ضارب کا دانت توڑ دیا جائے۔

یہودی، محمد ﷺ کے مدینہ تشریف لانے پر خوش تھے، اس لیے کہ ان کی ایک بہت بڑی امید آپ ﷺ سے وابستہ تھی اور وہ یہ کہ محمد ﷺ ان کے دین کو پذیرائی بخشیں گے۔ محمد ﷺ حسب حکم خداوندی مدینہ تشریف لائے اور جو روش اختیار کی اس سے یہودیوں کو امید بر آتی نظر آئی۔ حتیٰ کہ جب مسجد قبا تعمیر کی گئی تو اس کی محراب بیت المقدس کے رُخ تھی۔

یہودیوں نے جب دیکھا کہ مسجدِ قبا کی محراب بیت المقدس کے رُخ ہے اور قرآن میں گزشتہ پیغمبروں (جن پر کتاب اتری تھی) مثلِ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ سب کا ذکر بڑے احترام سے کیا گیا ہے تو یقین پیدا کرلیا کہ محمد ﷺ دینِ موسوی کو پذیرائی بخشیں گے۔

یہودی تو اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیا میں وہی ایک ملت ہے جو یہ لیاقت رکھتی ہے کہ ان میں سے پیغمبرِ خدا پیدا ہوں یعنی ملتِ یہودیہ۔

جس وقت محمد ﷺ قبا میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر مسجد تعمیر کرنے میں مشغول تھے، یہودیوں کے چند علمانے محمد ﷺ سے مذاکرہ کیا تھا تاکہ وہ جان سکیں کہ کب اور کس وقت یہ دین موسیٰ کو اپنائیں گے۔ محمد ﷺ کے جوابات سے جب یہودی علما سمجھ گئے کہ آپ ﷺ یہودی ہونا پسند نہیں کرتے تو آپ ﷺ سے کہا: یاد رکھیو اگر آپ پیغمبر بننا چاہتے ہیں تو پہلے یہودی مذہب اختیار کریں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو پیغمبر آج تک مبعوث ہوا ہے،

یہودی قوم سے پیدا ہوا ہے، اس لیے کہ فقط ایک قوم یہود ہی ہے جس کے برگزیدہ اس قابل ہوئے کہ خدا سے کلام کریں۔ ممکن ہے خداوند کبھی کسی اور ملت سے بھی کلام کریں لیکن اس قسم کا واقعہ ہوگا تو قوم یہود ہی کے توسط سے۔ نیز یہودی درجہ اوّل کی قوم ہیں اور باقی اقوامِ جہاں دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجے پر ہیں"۔

محمد ﷺ نے یہودی علما سے فرمایا: پیغمبر ہونا میری خواہش سے نہیں ہے بلکہ خداوند نے مجھے پیغمبری پر مبعوث کیا ہے اور رب کریم کی نظر میں کوئی قوم کسی دوسری سے بالاتر نہیں ہے اور تمام اقوام و افراد خداوند کی نظر میں مساوی ہیں۔ خداوند جب چاہے اور جس قوم سے چاہے کلام کرسکتا ہے۔

پہلی مرتبہ جب مسجدِ قبا میں نماز باجماعت ادا کی گئی وہ جمعہ کا روز تھا، لہٰذا پیغمبرِ اسلام نے جمعہ کا دن عبادت کے لیے معین فرمایا۔

یہ فیصلہ بھی یہودیوں پر گراں گزرا، اس لیے کہ وہ تو منتظر تھے کہ محمد ﷺ ہفتہ کے دن کو جو یہودیوں کا عبادت کا دن ہے، مسلمانوں کی عبادت کے لیے مقرر کریں گے۔

قبا میں کسی یہودی نے دینِ اسلام کو قبول نہ کیا مگر ایک فرد نے۔ یہ وہی شخص تھا کہ جب محمد ﷺ نے قبا میں ورود فرمایا تو وہ گلیوں میں آپ ﷺ کی آمد کی پکار کرتا پھرا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ تاریخ میں اس آدمی کا نام نہیں آیا لیکن کچھ تذکرہ نویسوں نے اس کا نام شلوم لکھا ہے۔ اس روز جمعہ کو جب مسلمان عبادت کے لیے مسجد قبا میں جمع تھے تو کچھ یہودی افراد بھی وہاں حاضر تھے۔ مسجد میں محمد ﷺ نے یہودیوں کی بابت بھی کلام کیا اور چاہا کہ انھیں سمجھائیں کہ وہ دوسری قوموں کی نسبت کوئی امتیازی حیثیت نہیں رکھتے۔ خداوند نے کوئی قوم کسی دوسری قوم سے ممتاز پیدا نہیں کی۔ تمام اقوام خداوند کی نظر میں یکساں ہیں، فقط پرہیزگاری ہی سے قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے۔

یہودی یہ کلام سن کر جب مسجد سے باہر نکلے تو انھیں یقین ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ کبھی بھی یہودی نہیں بنیں گے، چنانچہ انھوں نے اسی دن تہیہ کرلیا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مسلمانوں کی

مخالفت کریں گے اور مخالفت کا آغاز افواہ سازی سے ہوگا، لہٰذا یہ افواہ پھیلائی گئی کہ مسلمانوں کی تمام عورتیں عقیم (بانجھ) ہو جائیں گی اور اگر کسی دوسری عورت نے بھی اسلام قبول کیا تو وہ بھی عقیم ہو جائے گی۔ یہ افواہ جب پھیلی تو مسلمان مکہ سے مدینہ ہجرت کر چکے تھے اور آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے بیمار ہو گئے تھے۔

مسلمان مردوں کی طرح مسلمان عورتیں بھی تبدیلیِ آب و ہوا کی وجہ سے بیمار پڑ گئی تھیں۔ جس وقت سنا کہ وہ عقیم ہو جائیں گی تو خوفزدہ ہو گئیں۔ محمد ﷺ نے مسلمانوں کو مسجد قبا میں جمع ہونے کے لیے کہا اور وہاں یہ وضاحت فرمائی کہ مسلمان عورتوں کے متعلق جو افواہ پھیلائی گئی ہے یہ فرمانِ خدا نہیں۔ تم مردوں کو چاہیے کہ ان کی دلداری کرو اور انھیں سمجھاؤ کہ یہ افواہ ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو نہیں چاہتے کہ دینِ اسلام کی پیش رفت ہو اور جان لو کہ اچھی گفتگو سے جو شخص عورتوں کے لیے سکونِ قلب فراہم کرے گا خداوند اسے اجر دیں گے۔

بعد ازاں خداوند نے اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دیا کہ مسلمانوں کا قبلہ جو اَب تک بیت المقدس تھا، تبدیل کرو اور اب قبلہ خانہ کعبہ ٹھیرا۔ پس مسجدِ قبا کی محراب بھی خانہ کعبہ کے رُخ بنا دی گئی۔ مسجد قبا کا قبلہ ابتدا میں بیت المقدس کی طرف تھا، لہٰذا اسلامی تذکرہ نویسوں نے اسے دو قبلوں والی مسجد بھی کہا ہے۔



قبا سے مدینہ میں آمد

محمد ﷺ مسجد قبا کی تعمیر کے بعد عازمِ مدینہ ہوئے۔ اپنی اونٹنی موسوم بہ قصوا پر سوار ہوئے اور مدینہ کی راہ پر چل دیے۔ جس دن محمد ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے تمام مسلمانان مدینہ گلی کوچوں میں نکل آئے تھے اور تمام مرد جو استقبال کے لیے شہر سے باہر آگئے تھے، پیغمبرِ اسلام کی اونٹنی کی طرف بڑھتے اور اس کی عنان کو پکڑ کر درخواست کرتے کہ میرے گھر تشریف لے چلیے یا بعض عرض کرتے ہمارے محلّہ میں تشریف لے چلیے۔

محمد ﷺ نے جب یہ جوش اور محبت کا مظاہرہ دیکھا تو سوچا کہ اگر اب میں کسی مسلمان کے گھر جاؤں یا کسی محلّہ میں اونٹنی لے جاؤں تو ممکن ہے یہ عمل کدورت کا باعث بنے اور لوگ تصور کریں کہ محمد ﷺ ان میں سے ایک پر خصوصی نظرِ محبت رکھتے ہیں۔

اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ نے کہا میری اونٹنی کی عنان چھوڑ دو۔ اسے آزادانہ جانے دو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مجھے وہاں پہنچا دے گی جہاں میرے خدا کی رضا ہوگی۔

قصواء، محمد ﷺ کی اونٹنی مدینہ کے چند محلوں سے گزرتی ہوئی محلّہ بنوالنجار میں پہنچی تو دور سے ایک سفید عمارت نظر آئی۔ محمد ﷺ نے اس عمارت کو پہچان لیا۔ عبدالمطلب کی والدہ یعنی ہاشم کی بیوی اس مکان میں رہتی تھیں۔ مسلمان اس بات سے آگاہ تھے اور خیال کر رہے تھے کہ قصوا اسی گھر کے سامنے ٹھیرے گی لیکن وہ وہاں نہ ٹھیری اور آگے بڑھ گئی۔ مدینہ کے سبھی مسلمان اونٹنی کے عقب میں آ رہے تھے کہ دیکھیں یہ حیوان کہاں ٹھیرتا ہے۔ ناقہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں محمد ﷺ کے والد عبداللہ کی قبر تھی۔ لوگوں کو علم تھا کہ پیغمبر ﷺ کی والدہ ماجدہ کی قبر وہاں نہیں ہے۔ آمنہ پیغمبر ﷺ کی والدہ کو مدینہ سے باہر دفن کیا گیا تھا۔ بعض مسلمانوں نے یہ سوچا کہ قصوا عبداللہ کی قبر کے پاس ٹھیرے گی لیکن وہ اس قبر کے پاس سے بھی گزر گئی اور

ایک جگہ پہنچی جہاں ایک عورت انیسہ کا گھر تھا۔ جب محمد ﷺ کی والدہ حیات تھیں اور محمد ﷺ مدینہ میں ان کے پاس تھے تو انیسہ ایک خردسال لڑکی تھی اور محمد ﷺ سے کھیلا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ ایک بے میل مرام عورت شمار ہوتی تھی۔ پیغمبر ﷺ کی ناقہ اس کے گھر کے سامنے بھی نہ ٹھیری مگر محلّہ بنوالنجار سے باہر نہ گئی۔ محمد ﷺ نے جب مشاہدہ کیا کہ اونٹنی اس محلّہ سے باہر نہیں جا رہی تو انھیں اپنی والدہ ماجدہ کا خانوادہ یاد آگیا، اس لیے کہ شجرہ خانوادگی والدہ کی طرف سے قبیلہ بنوالنجار سے جاملتا تھا اور ہم کہہ چکے ہیں کہ اعراب بادیہ کے نزدیک شجرہ خانوادگی بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اگرچہ محمد ﷺ نے والد کے خانوادہ سے قطع تعلق کر لیا تھا لیکن مدینہ میں تشریف لانے اور سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے والدہ کے خانوادہ سے ربط قائم رہا۔

قصوا کافی دیر تک محلّہ بنوالنجار میں سرگرداں رہی، اور پھر ایک بنجر قطعہ زمین (موات) کے پاس رکی، پھر تھوڑی آگے بڑھی۔ توقف کیا اور بیٹھ گئی۔ محمد ﷺ نے اپنے اطمینان کے لیے کہ اونٹنی کہیں ایسے ہی نہ بیٹھ گئی ہو کوشش کی کہ اسے اُٹھائیں لیکن وہ بیٹھی ہی رہی۔

جس جگہ ناقہ بیٹھی تھی وہاں کوئی گھر نہیں تھا یہ ایک میدان سا تھا جسے کھجوریں سکھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں سے نزدیک ترین گھر بھی خاصی دور تھا اور مسلمان جو محمد ﷺ کے ساتھ تھے انھوں نے بتایا کہ وہ گھر ابوایوب کا ہے۔

اونٹنی کے بیٹھنے کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ پیغمبر ﷺ اسلام عبادت کے لیے مسجد اور اپنا گھر وہیں بنائیں گے اور وہ جگہ آج کی اصطلاح میں مرکزِ عالمِ اسلام ہوگی۔ محمد ﷺ نے پوچھا یہ زمین کس کی ہے؟ ایک مسلمان نے آگے بڑھ کر عرض کی، اے محمد ﷺ! یہ زمین دو یتیم بھائیوں کی ہے۔ میں ان کا سرپرست ہوں۔ میرا نام اسعد بن زرارہ ہے۔ میں یہ زمین پیش کرتا ہوں کہ اس جگہ مسجد بنائیں۔ محمد ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ زمین تمھاری بھی ہوتی تو میں اسے مفت قبول نہ کرتا کجا یہ زمین دو یتیم بچوں کی ہے۔ میں بچپن میں یتیم تھا۔ میرے ماں اور باپ دونوں ہی نہیں تھے، اس لیے میں جانتا ہوں کہ یتیم کتنے دکھ اُٹھاتا اور غمزدہ ہوتا ہے۔ میں اس زمین کو ایک شرط پر حاصل

کروں گا کہ زمین کی قیمت عام قیمت سے زیادہ لگائی جائے۔

اسعد بن زرارہ نے کہا: اس زمین کی قیمت سات دینار ہے۔

محمد ﷺ نے قیمت کی بابت مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اسعد بن زرارہ کی تصدیق کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس زمین کی قیمت دس دینار ادا کروں گا تاکہ اسعد بن زرارہ اس رقم سے ایک بہتر قطعہ زمین ان دو یتیم بھائیوں کے لیے خرید لے۔

ابوبکرؓ خزانہ دار اسلام نے جو عقب میں کھڑے تھے، فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس عدد سکہ زر گن کر صاحب زمین کو دے دیے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس وقت دس دینار یعنی دس سکہ طلائی ایک خطیر رقم تھی۔

اس دور میں نہ مکہ کا اور نہ مدینہ کا کوئی اپنا سکہ تھا۔ ان دونوں شہروں میں ایرانی اور رومی سکوں سے کاروبار ہوا کرتا تھا۔ سلطنت روم کا پایہ تخت بیزنطیم تھا، چنانچہ اس کے سکوں کو پایہ تخت کی مناسبت سے بیزانس کہتے تھے۔ اس شہر بیزنطیم کا موجودہ نام استنبول ہے۔

دینار ایک طلائی سکہ تھا۔ ایرانی اسے شاہ خسرو کے نام کی مناسبت سے دینار خسرو کہتے تھے۔ دوسرا دینار رومی تھا اور یہ نام بھی ہرقل بادشاہ روم کی نسبت سے تھا۔ خرید کے دوسرے دن محمد ﷺ نے مسلمانوں کی مدد سے مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔ تمام مرد حتیٰ کہ خود محمد ﷺ اپنے ہاتھوں مٹی اور پتھر لاتے، گارا تیار کرتے اور مسجد کی بنا کرتے۔ مسجد کی تعمیر ایک نمونہ کے طور پر کی گئی اور صدر اسلام میں دوسری تمام مساجد اسی نمونہ و اُسلوب پر تعمیر ہوئیں۔

ترتیب ایسے تھی کہ تین تہیں پتھروں کی بنیادوں میں چنی گئیں اور دیواروں کی چنائی اینٹوں سے کی گئی۔ مسجد کی چھت میں شہتیر کھجور کے تنوں کے ڈالے گئے اور کھجور کے پتے اوپر ڈال کر چھت ڈھانپ دی گئی۔

مسجد مذکور کی تعمیر میں سات ماہ صرف ہوئے۔ مسجد کو بنیادوں پر بنایا گیا، اس لیے کہ مدینہ میں برسات بہت ہوتی تھی۔ اگر مسجد کو بنیادوں پر نہ بنایا جاتا تو وہ بارشوں کی وجہ سے جلد گر جاتی۔ اس مسجد کا قبلہ بھی بیت المقدس ہی تھا کیونکہ ابھی تک خداوند کا حکم نہیں آیا تھا کہ قبلہ کعبے کے رُخ کر لو۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے کچھ مسلمانوں کے پاس رات گزارنے کو جگہ نہیں تھی۔ لہٰذا پیغمبر ﷺ نے مدینہ کی مسجد میں ایک بہت بڑا چبوترا یعنی ایک طرح کا برآمدہ بنایا کہ مذکورہ بے گھر افراد وہاں رات کو آرام کر سکیں۔ اس برآمدے پر سایہ کے لیے کھجور کی شاخیں اور پتے ڈال دیے گئے کہ یہ فقرا بارش اور آفتاب کی گرمی سے محفوظ رہیں۔ چونکہ یہ جگہ موسوم بہ صفہ ہوئی، اس لیے یہاں جو لوگ سوتے تھے انھیں "اہل صفہ" کہا جانے لگا۔ یہ اشخاص جو اس وقت فقیرانہ حالت میں تھے، بعد میں مشاہیر اسلام ہوئے اور ہر وہ شخص جو اہل صفہ میں سے تھا بزرگان اسلام میں شمار ہوتا تھا۔

یہ صفہ جو اول فقرا کی خواب گاہ تھی اسلام کا دارالعلوم بن گیا اور سب سے پہلی اسلامی دانش گاہ نے سلسلہ تدریس صفہ ہی میں شروع کیا۔

محمد ﷺ نے مدینہ میں جب ناقہ سے زمین پر قدم رکھا، اونٹنی سے اپنا سامان خود اُتارا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ رہائش کہاں رکھی جائے۔

ابوایوب کا پورا نام ابوایوب خالد بن زیدؓ تھا۔ ان کا گھر اس جگہ سے نزدیک تھا۔ وہ محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سامان آپ ﷺ کے ہاتھوں سے لے لیا اور عرض کی: یا محمد ﷺ! میرے گھر میں سکونت فرمائیے۔ محمد ﷺ نے ان سے پوچھا: کیا تمھارے گھر میں اتنی گنجائش ہے کہ مجھے جگہ دے سکو؟

انھوں نے جواب دیا: "ہاں محمد ﷺ!"

محمد ﷺ نے فرمایا: تمھارے گھر میں ایک شرط پر سوؤں گا کہ خورد و نوش کا بوجھ تم پر نہیں ہوگا۔

ابوایوب نے کہا: یا محمد ﷺ! آپ اکیلے کتنی غذا کھا لیں گے کہ مجھ پر بوجھ بنیں گے۔

محمد ﷺ نے فرمایا: ہر چند کہ میری غذا کم ہے، اس کے باوجود میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گا۔

جب ابوایوب نے دیکھا کہ آپ ﷺ مصر ہیں کہ غذا اپنی کھائیں گے تو سر تسلیم خم کیا۔ محمد ﷺ رات کو اس کے گھر جا کر سو جاتے۔ اس دوران مسجد مدینہ کی تعمیر جاری تھی اور جمعیت اسلام کو ایک ترتیب دینے کے لیے اقدام کیے جا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ جو مکہ سے مدینہ

ہجرت کر کے آئے تھے فقیر ہو چکے تھے اس لیے کہ اپنا سب کچھ لٹا کر آئے تھے۔ اپنے قبیلوں سے جدا ہوئے تھے اور مدینہ میں انتہائی مشکل حالات میں رہ رہے تھے۔ نیز یہودیوں کی اس افواہ سے کہ مسلمان عورتیں عقیم ہوگئی ہیں، متفکر بھی تھے۔

لیکن انھی دنوں زبیرؓ کی زوجہ نے کہ وہ مسلمان تھیں ایک خوبصورت صحت مند بچہ کو جنم دیا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ مسلمان اس واقعہ پر خوش ہو گئے اور سمجھ گئے کہ یہ فقط افواہ تھی۔ مسلمان جو مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے تھے فقیر ہو چکے تھے۔ پیغمبر ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ ہر ایک مدنی مسلمان ایک مکی مسلمان سے عہد اخوت باندھے اور اس کو اپنے گھر میں جگہ دے اور اکٹھے کام و تحصیل معاش کریں تا کہ مکی مسلمانوں کی زندگی بہتر وضع اختیار کر جائے اور وہ اپنے لیے جائے رہائش فراہم کر سکیں اور اس قابل ہوں کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں، پھر وہ تم (مسلمانانِ مدینہ) سے جدا رہائش کر لیں گے۔

محمد ﷺ کے اس حکم کو مدینہ والوں نے بسر و چشم قبول کیا اور ۱۸۶ مہاجر افراد سے انصار نے عہد اخوت باندھا اور ان کو اپنے گھروں میں سکونت کے لیے جگہ دی۔ خداوند نے سورہ انفال کی آیت ۷۴ میں ان انصار مسلمانوں کی قدر افزائی کی، فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ ''وہ لوگ کہ ایمان لائے اور ہجرت کی انھوں نے اللہ کی راہ میں اور جہاد کیا اور جن لوگوں نے انھیں مسکن فراہم کیا اور مدد کی، وہ حقیقی مومنوں میں سے ہیں۔ خداوند انھیں موردِ مغفرت قرار دے گا اور ان کا رزق کشادہ کرے گا۔''

مسلمان چونکہ مسجد کی تعمیر میں بھی حصہ لے رہے تھے، اس لیے عہد اخوت کے بعد کام کو ترتیب اس طرح دیا گیا: ہر وہ شخص جو کسی انصاری کے گھر میں رہتا ہو، ایک دن مسجد میں بلا اُجرت کام کرے اور دوسرے دن اپنی اور جس کے گھر میں رہتا ہو اس کی معاش کے لیے کام کرے۔ مسلمانانِ مدینہ (انصار) جنھوں نے مہاجرین کو اپنے گھروں میں جگہ دی تھی، انھوں نے

بھی یہی طریقہ اپنا لیا کہ ایک دن وہ مسجد کی تعمیر میں حصہ لیتے اور دوسرے دن سعی روزگار کرتے۔

محمد ﷺ نے خود کسی انصاری سے عہد اخوت نہ باندھا۔ آپ ﷺ کے یہ پیشِ نظر تھا کہ اگر آپ کسی ایک سے یہ عہد باندھ لیتے تو ممکن تھا دوسرے مسلمانوں کے لیے باعث رنج ہوتا اور وہ یہ خیال کرتے کہ پیغمبر ﷺ نے ہمیں اس قابل نہیں سمجھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے کسی سے بھی عہد اخوت استوار نہ کیا۔

بدیں حالات محمد ﷺ نے اپنے چچازاد علیؓ بن ابوطالب سے تحصیل معاش کے لیے عہد اخوت استوار کیا اور ان سے کہا: اے علیؓ! ایک دن تم ہم دونوں کے لیے سعی معاش کرو گے اور دوسرے دن میں یہ کام کروں گا۔ علیؓ نے عرض کی: یا محمد ﷺ! آپ کی موجودگی مسجد میں تعمیری کاموں کی پیش رفت کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دن نہیں جاتا کہ مسلمان کسی نہ کسی کام کے لیے آپ ﷺ کے پاس نہ آتے ہوں اور اپنے ضروری مسائل آپ ﷺ کے سامنے پیش نہ کرتے ہوں۔ لہٰذا آپ روزانہ مسجد میں رہیں، تعمیراتی کام کی نگرانی کریں اور مسلمانوں کے مسائل کا جواب دیں۔ میں آپ ﷺ کی معاش کے لیے بھی کام کروں گا۔

محمد ﷺ نے علیؓ کی یہ پیش کش قبول فرمائی۔ پیغمبر ﷺ اسلام کے چچازاد صبحدم کام کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ممکن ہے آپ خیال کریں کہ علیؓ جو کام کرتے تھے وہ ان کے خانوادہ کے شایانِ شان تھا۔

علیؓ بھی مثلِ محمد ﷺ قبیلہ ہاشم سے تھے، مگر مدینہ میں اپنی معاش کے لیے پانی بھر کر لایا کرتے تھے۔ مدینہ میں ایک شخص اپنا مکان بنا رہا تھا۔ علیؓ پانی بھر کر لاتے اور دوسرے مزدور تعمیر کے لیے گارا اور اینٹیں تیار کرتے تھے۔ ذخیرۂ آب اور زیرِ تعمیر مکان میں فاصلہ اس قدر تھا کہ علیؓ صبح سے شام تک سولہ ڈول پانی کام تک پہنچاتے اور ہر ڈول پانی کے عوض ایک دانہ کھجور سے زیادہ مزدوری نہیں ملتی تھی۔ لہٰذا علیؓ کی مزدوری دن بھر میں سولہ کھجوریں ہوتی۔ آٹھ کھجوریں محمد ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے اور آٹھ خود کھاتے۔ ایک مدت تک دونوں نے روزانہ آٹھ آٹھ کھجوروں پر بسر کی۔

ایسے تھے وہ لوگ جنھوں نے اسلام کی بنیادوں کو استوار کیا۔ لیکن یہ خصلت جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ایک بدوی عرب کے بچپن سے ہی اس کی فطرت کا جزو ہو جاتی تھی۔ بچپن ہی سے وہ بھوک اور پیاس کے عادی ہو جایا کرتے تھے۔ بھوک اور پیاس ان پر شاق نہیں گزرتی تھی۔

مدینہ کی نصف آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی۔ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد محمد ﷺ کی یہ کوشش رہی کہ انھیں اسلام سے تعاون پر آمادہ کر سکیں۔

اسلام کی آمد کے بعد قوانین اسلامی ایک ہی مرتبہ نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ بتدریج ۲۳ سال نازل ہوتے رہے۔

علماءِ اسلام کے کہنے کے مطابق جب کسی مسئلہ میں خداوند کے احکام موجود نہ ہوتے تو محمد ﷺ اس کے مکلّف تھے کہ قوانین توریت سے اخذ کریں تاوقتیکہ خداوند کی طرف سے جدید قانون نازل ہو۔ اس تدریجی عمل کی علت سمجھ میں آتی ہے۔ اگر ایک ہی مرتبہ تمام سابقہ قوانین مسلمانوں کے لیے منسوخ ہو جاتے اور جدید قوانین نازل ہوتے تو وہ خود کو گم کر بیٹھتے اور قوانینِ جدید کا بروقت اجرا نہ کر پاتے۔ تازہ قوانین بتدریج لاگو ہونے چاہئیں تاکہ لوگ آہستہ آہستہ بتدریج ان قوانین سے مانوس ہوتے چلے جائیں۔

آج جب کہ مغربی ممالک جزیرہ نمائے عرب کے دورِ جاہلیت کی بہ نسبت بہت زیادہ متمدن اور تعلیم یافتہ ہیں، وسائل اطلاعات اور ذرائع ابلاغ مثلِ اخبارات، کتب و رسائل، ریڈیو، ٹیلیویژن اس قدر زیادہ ہیں، پھر بھی کوئی ملک اس پر قادر نہیں کہ چند دنوں کے اندر اندر جدید قانون وضع کرے اور بروقت اس کا اجرا کر سکے اور اگر اس کا ارادہ کر ہی لے تو لوگوں کے اعصاب جواب دے جائیں گے اور سر رشتۂ زندگی ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور اجتماعی مفاسد جگہ پکڑ لیں گے۔

جزیرہ نمائے عرب کے صحرا نشین اس قدر استعداد نہیں رکھتے تھے کہ یک لخت اور تھوڑی سی مدت میں اسلام کے جدید قوانین کا ادراک کر سکیں اور قبول کر لیں۔ یہی وجہ تھی کہ بعثت رسالت کے بعد بھی سابقہ قوانین منسوخ نہیں ہوئے تھے۔ اسی لحاظ سے نماز ادا کرتے وقت بیت المقدس

کی طرف رُخ کرنے کا طریقہ باقی رہا۔ خداوند نے بھی اس قانون کو منسوخ نہیں کیا تھا۔

قوانین سابقہ کے ساتھ رعایت کی وجہ ہی سے یہودی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ محمد ﷺ یہودی ہو جائیں گے۔ یہودی آپ ﷺ سے کہا کرتے "یا محمد ﷺ! تم پیغمبر نہیں ہو اس لیے کہ تم ابھی تک عرب ہو اور یہودی نہیں ہوئے۔ تمام سابقہ انبیا یہودی قوم سے اُٹھے ہیں۔ تمھارا پیغمبر ہونا بھی ممکن ہے اگر تم یہودیوں کے درمیان آجاؤ۔ تمھارے مقدر میں پیغمبری اس وقت ہوگی جب تم دینِ موسیٰ کے پیروکار ہو جاؤ گے۔

قبلۂ مسلمین تبدیل ہونے سے تھوڑی دیر پہلے قرآن کی دوسری سورۃ کی آیت ۱۱۰ محمد ﷺ پر نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ "مشرق و مغرب خدا کے ہیں اور جس طرف بھی رُخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔" [سورۃ البقرہ ۲: ۱۱۵]

جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہودی مسلمانوں سے پیوستہ نہیں ہوں گے۔ خداوند نے اسی دوسری سورت کی آیات ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۰ میں مسلمانوں کو حکم دیا کہ نماز پڑھنے کے وقت اپنا رُخ خانہ کعبہ کی طرف کر لیا کرو اور نماز پڑھو۔

سورۃ بقرہ کی آیت ۱۴۲ میں نے فرمایا:

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ "کم فہم لوگ کہتے ہیں کہ کیا چیز باعث ہوئی کہ انھیں اس قبلے سے پھیر دیا جس کی جانب وہ نماز پڑھتے تھے۔ ان سے کہہ دو کہ مشرق ہو یا مغرب سب اللہ کا ہے اور اللہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے"۔

ان آیات میں جو نکتہ واضح کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ شرق و غرب خداوند کی نظر میں ایک ہے لیکن جس وقت خداوند نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ کعبہ رُخ نماز ادا کرو تو شرق و غرب کے ایک ہونے پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

انھی آیات میں خداوند نے یہودیوں اور عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہا: ''ہم نے قبلہ کی سمت کو بدل دیا ہے تاکہ دیکھیں کہ کون لوگ رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہیں''۔ قبلہ کو بدل دیا کہ وہ اشخاص جو رسولِ ﷺ خدا کی پیروی پر آمادہ نہیں وہ کفر میں ہی آلودہ رہ جائیں۔

تحویلِ قبلہ کا حکمِ خداوندی تاریخِ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کلی طور پر یہودیوں اور عیسائیوں سے جدا ہو گئے اور اسلام کو ان دو دینوں بالخصوص دینِ یہود سے ممیّز کر دیا۔

اسلام دین تھا کہ زبان عربی میں ایک عربی پیغمبر پر نازل ہوا اور کعبہ بھی ایک خانۂ عربی تھا جسے عربوں کے جدِ امجد ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ نے بنا کیا۔ جس وقت خداوند نے حکم دیا کہ مسلمان اپنا رُخ کعبہ کی طرف موڑ لیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بعد ازیں دینِ اسلام دینِ مسیحی و یہودی سے کوئی وابستگی نہیں رکھتا بلکہ اسلام ایک مستقل اور کامل دین ہے۔



اسلام کا پہلا اساسی قانون

خداوند نے قرآن میں ملتِ ابراہیمؑ کا متعدد بار نام لیا ہے اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے پہلے گزرے ہیں۔ وہی تھے جنھوں نے موسیٰؑ و عیسیٰؑ سے پہلے خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھی، لہٰذا ملتِ ابراہیمؑ جو اساسِ دینِ اسلام کو تشکیل دیتی ہے، اس کی مبادیات دین موسیٰؑ و عیسیٰؑ میں شامل ہو سکتی تھیں۔ چونکہ اساس دینِ اسلام ملتِ ابراہیمی تھی لہٰذا دینِ اسلام عمومی و عالمی دین ٹھیرا۔

یہودی مذہب کی اساس نسلی برتری پر تھی۔ یہودی کہتے تھے کہ بنی اسرائیل ہی دنیا کے مالک و آقا ہیں۔ فقط یہود ہی اس لائق ہیں کہ خداوند ان سے ہم کلام ہو۔ لہٰذا دین یہود پورے عالم کا دین نہ بن سکا۔

دین مسیحی جو یہودی دین کی تکمیل کے لیے آیا تھا، وہ بھی عالمگیر نہ ہوا۔ مگر دینِ اسلام جو کلی طور پر موسوی اور عیسوی دین سے جدا ہو گیا اور جس نے اپنا مستقل قبلہ اپنا لیا اور اپنے اندر عمومی اور آفاقی رنگ پیدا کر لیا، اس کے اندر یہ صلاحیت رہی کہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں رہنے والا انسان چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل کا ہو حلقۂ دینِ اسلام میں شامل ہو سکتا ہے۔

عرب اور خصوصاً مسلمان جو مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ گئے تھے، تحویلِ قبلہ اور کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کے حکم سے بہت مسرور تھے۔ علاوہ ازیں کعبہ تمام عربوں کے لیے مقدس تھا۔ مسلمان جو مکّہ سے ہجرت کر گئے تھے کعبہ کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ تحویلِ قبلہ کے بعد کعبہ رُخ نماز کی ادائیگی سے مسلمانوں نے گویا اپنے اجداد کی سنت پر عمل شروع کر دیا۔

دورِ جاہلیت میں اسلام سے قبل ایک قصیدہ ''فخر'' کے نام سے پڑھا جاتا تھا، جس میں اجداد کی مدح سرائی اور ان کی شان بیان کی جاتی تھی۔ پس بعد ازیں کہ خداوند نے مسلمانوں کو کعبہ رُخ نماز پڑھنے کا حکم دیا، ہر مرتبہ جب وہ نماز پڑھتے انھیں اپنے اجداد ابراہیمؑ اور

اسماعیلؑ کی بزرگی کا احساس ہوتا (اس لیے کہ خانہ کعبہ کی بنا اسماعیلؑ اور ان کے والد ابراہیمؑ نے رکھی تھی اور وہ لوگ خود کو اسماعیلؑ کی اولاد سے سمجھتے تھے) اور ان کی تکریم سے تمام اجداد خویش کی تکریم ہوتی تھی۔

محمد ﷺ مسلمانوں کی مدد سے مسجد مدینہ کی تعمیر میں مشغول ہونے کے ساتھ ساتھ مسجد کے جوار میں چھوٹے چھوٹے گھر مسلمانوں کے لیے بنا رہے تھے۔

مسلمانوں میں سے بعض (بشمول پیغمبرِ اسلام ﷺ) نے مکّہ سے ہجرت کے وقت اپنے افراد خاندان کو وہیں مکّہ میں چھوڑ دیا تھا۔ انھیں بھی بہرحال مدینہ آنا تھا تاکہ خاندان کے سربراہ سے پیوستہ ہوں۔ نیز خاندان کے افراد درخت کی شاخوں کی طرح ہوتے ہیں۔ تمام شاخیں درخت کے تنے سے متصل ہوتی ہیں اور اگر کوئی شاخ تنے سے جدا ہو جائے تو اس طرح ہوتا ہے جیسے ہاتھ بدن سے جدا ہو جائے۔ محمد ﷺ کا ارادہ تھا کہ اپنے خاندان کے افراد کو مکّہ سے مدینہ لے آئیں۔ لیکن اس سے قبل چھوٹے گھروں کی تعمیر مکمل ہونا ضروری تھی۔ اتفاقاً آپ ﷺ ایک دن ابوبکرؓ کے ہمراہ مدینہ کے بازار میں گئے اور تین مادہ شتر خرید کر لیے۔ ان اونٹوں کی قیمت ابوبکرؓ نے ادا کی۔

محمد ﷺ اور ابوبکرؓ جب مدینہ میں آئے تو وہ دو مادہ شتر رکھتے تھے۔ ان تین اونٹنیوں کی خرید کے بعد ان کے پاس پانچ اونٹنیاں ہو گئیں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اپنے چچازاد بھائی علیؓ کو طلب کیا اور فرمایا: اے علیؓ! تمھیں علم ہے کہ میری بیٹیاں اور میری بیویاں سودہ اور عائشہ مکّہ میں ہیں۔ اب تم جاؤ اور انھیں اونٹوں پر سوار کر کے مدینہ لے آؤ۔ زید (آزاد شدہ غلام جو آپ ﷺ کا متبنّیٰ تھا) کو اپنے ہمراہ لے جاؤ اور واپسی پر ام ایمن، زید کی بیوی کو بھی ہمراہ لیتے آنا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے آپ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں: فاطمہؓ، ام کلثومؓ، رقیہؓ اور زینبؓ۔ ان چاروں میں سے رقیہؓ اپنے شوہر عثمانؓ کے ساتھ مدینہ آ چکی تھیں، لیکن باقی تینوں مکّہ ہی میں تھیں۔

علیؓ زیدؓ کے ساتھ عازمِ مکّہ ہوئے اور واپسی پر سودہؓ و عائشہؓ ہر دو زوجۂ پیغمبر ﷺ، دو بیٹیوں فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور ام ایمن زوجہ زیدؓ کو لے آئے۔ چوتھی بیٹی زینبؓ نہ آسکیں اس لیے کہ ان کا شوہر ابوالعاص مسلمان نہ ہوا تھا۔ اس نے اجازت نہ دی کہ اس کی بیوی مکّہ سے جائے۔

یوں خانوادۂ پیغمبر ﷺ اسلام میں سے فقط زینبؓ مکّہ میں رہ گئی تھیں۔ باقی سارا خاندان مدینہ میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے بعض دوسرے خاندانوں میں بھی اس طرح کے واقعات پیش آئے تھے۔ زن و شوہر چونکہ باہم ایک مذہب نہیں رکھتے تھے، اس لیے اکٹھے نہ ہو سکے۔

بعض دوسرے افراد جن کی بیویاں مسلمان تھیں، اپنی ازواج کو مدینہ لے آئے۔ نتیجتاً مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا۔

محمد ﷺ نے پانچوں اونٹنیاں مکّہ سے مسلمانوں کے گھرانوں کو مدینہ منتقل کرنے کے لیے مخصوص کر دی تھیں، لہٰذا ہر دفعہ کہ مذکورہ اونٹنیاں مدینہ میں ہوتیں موردِ اکرام ٹھہرتیں یعنی کوئی مسلمان ان کی راہ نہیں روکتا تھا۔ وہ جہاں چاہتیں چرتیں، جہاں چاہتیں پانی پیتیں۔

مسجدِ مدینہ کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد مسلمان اپنے بیوی بچوں کو مکّہ سے مدینہ لے آئے تو آپ ﷺ نے مدینہ شہر کے لیے پہلا قانونِ اساسی وضع کیا۔

یہ قانونِ اساسی باون نِکات پر مشتمل تھا جو محمد ﷺ کی طرف سے تدوین ہوا (یعنی یہ مثل آیاتِ قرآن وحی نہیں ہے):

ان باون نِکات میں سے پچیس مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ستائیس نکات دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے لیے تھے، وہ یہودی ہوں یا بت پرست۔

اس قانون اساسی کی اس طرح تدوین کی گئی کہ دوسرے ادیان کے پیروکار مسلمانوں کے ساتھ مدینہ میں زندگی بسر کر سکتے تھے اور ہر ایک اپنے مذہبی وظائف کی بجا آوری میں آزاد تھا، بغیر اس کے کہ کوئی ایک دوسرے کے مزاحم ہو۔

یہ قانون اساسی ہجرت کے پہلے سال (۶۲۳ء) میں جب محمد ﷺ کو مدینہ ہجرت کیے ایک برس گزر چکا تھا، نافذ ہوا۔

قانون اساسی کے مطابق مدینہ شہر کا رہنے والا ہر قبیلہ مجاز تھا کہ اپنی دینی اقدار کی حفاظت کرے۔ کوئی شخص اعتراض نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اپنے دینی وظائف کی ادائیگی کیوں کر رہا ہے۔

لیکن تمام مختلف ادیان کے پیروکار جو مدینہ کے شہری تھے، ہنگامِ جنگ ان پر فرض ہوا کہ مدینہ پر حملہ کی صورت میں باہم مل کر اپنی قوت کو دشمن کا منہ توڑنے کے لیے استعمال کریں۔

ہم اس قانون اساسی کا مواد جو محمد ﷺ نے مدینہ میں وضع کیا، قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ محمد ﷺ نے اس قانون اساسی میں جو تمام مذاہب کو آزادی دی ہے وہ قرآن سے الہامی طور پر اخذ کی گئی ہے۔ خداوند سورۂ بقرہ، آیت ۶۲ میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ، مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ یعنی ”وہ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی، عیسائی اور صابی ہو چکے ہیں ان میں سے جو بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہوں اور روزِ جزا پر یقین رکھتے ہوں اور انھوں نے صالح عمل کیے ہوں، ان کا اجر اللہ کے پاس ہے اور انھیں کوئی خوف نہیں اور انھیں کوئی غم نہیں ہونا چاہیے“۔

صابئین جن کا آیت مذکورہ میں ذکر آتا ہے وہ لوگ تھے جو ستاروں اور فرشتوں کی پرستش کرتے تھے اور خدا پر بھی عقیدہ رکھتے تھے۔

جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہے، خداوند نے یہودیوں، عیسائیوں حتیٰ کہ صابئین کو بھی اپنی رحمت کے سایہ سے محروم نہیں کیا، بشرطیکہ ایمان رکھتے ہوں، اور صالح عمل کرتے ہوں یعنی ان کا ایمان واقعی ہو نہ کہ ریاکارانہ۔[1] خداوند ایک اور آیت سورۃ المائدہ کی ۶۶ویں آیت

۱- اس آیت سے وحدتِ ادیان کا مفہوم ہرگز نہیں نکلتا۔ اللہ کے ساتھ نبی ﷺ پر ایمان لانا لازم ہے اور یہود و نصاریٰ اور صابئین کی اُخروی نجات بھی توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان لانے سے مشروط ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۸۵ میں ہے کہ ”جو شخص دینِ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اپنانا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا“۔ نیز نبی ﷺ کا فرمان ہے: ”مجھ پر ایمان نہ لانے والا جہنمی ہے“۔ [مسلم، کتاب الایمان، ح:۱۵۳]۔ محسن فارانی

میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں یوں فرماتا ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ﴾ ”اگر وہ لوگ (یہودی، عیسائی) توریت اور انجیل اور ان احکام پر عمل کریں جو خدا نے ان پر نازل فرمائے، ان کو حق ہوگا کہ خدا کی نعمتوں سے اوپر سے نیچے تک بہرہ مند ہوں اور کھائیں۔ ان (یہودیوں اور عیسائیوں) میں کچھ لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن ان میں اکثریت برے اعمال والوں کی ہے“۔

ان آیات کا ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ قانون اساسی جو مدینہ میں تدوین ہوا اور ہجرت کے پہلے سال مشتہر ہوا، احکامِ قرآنی سے الہامی طور ماخوذ تھا لیکن جزوِ آیاتِ آسمانی نہیں تھا۔ سابقہ ادیان کے بانیوں میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی مثل دوسرے ادیان کی نسبت رواداری اور مدارات کا قائل نہیں گزرا۔ آپ ﷺ کی یہ ایک اعلیٰ کوشش تھی کہ دوسرے مذاہب کے لوگ مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ پوری مذہبی آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ مزید اطمینان انھیں دلایا گیا کہ کوئی ان کے مزاحم نہ ہوگا۔ محمد ﷺ جانتے تھے کہ ان کا مذہب آزادی اور مساوات پر استوار ہوا ہے، اس لیے انھیں دوسرے مذاہب سے کوئی خوف وبیم نہیں تھا۔ ممکن ہے دینِ اسلام دوسروں پر اپنی ضیاپاشی کرے لیکن دوسرے دینِ اسلام پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس قانون اساسی کی پچیس شقیں مسلمانوں سے متعلق ہیں اور ستائیس شقیں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں ہیں۔

شق اوّل و دوم میں مدینہ کے قبائل کے نام شمار کرنے کے بعد محمد ﷺ پیغمبرِ اسلام نے فرمایا: مومنین ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ ان میں سے کسی ایک پر عہدنامے کے ایفا کی ذمہ داریوں کا بوجھ اتنا پڑے کہ اس کی کمر ہی ٹوٹ جائے۔

مومنین کا یہ فرض ہے کہ وہ صمیم قلب کے ساتھ ہر مومن کی بھاری ذمہ داریوں مثلِ فدیہ، دیت یا خون بہا کی ادائیگی میں مدد کریں۔

اسلام سے قبل جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، عربستان میں ہر فرد قبیلہ کا عضو تھا۔ اگر کوئی قتل کر دیتا تو خون بہا کی ادائگی کی ذمہ داری قبیلہ پر ہوتی تھی۔

محمد ﷺ نے اسلام میں سب کو مساوی قرار دیا اور قبیلہ کے تعصب اور اس سے وابستگی سے پیدا شدہ سب امتیازات بھی مٹا دیے۔

مگر قانون اساسی کے تحت ان امتیازات کی جگہ ایک اور امتیاز نے لے لی، یعنی انسان کا مومن ہونا اور امتِ مسلمہ سے وابستہ ہونا۔

اگر ایک شخص جو امت کا رُکن یعنی مسلمان ہے اور گرفتار ہو جاتا ہے اور حریف اس کی آزادی کے لیے فدیہ مانگتے ہیں تو تمام مسلمان اس کا فدیہ ادا کر کے اسے آزاد کرائیں۔ اور ہرگاہ کہ مسلمان کسی شخص کو قتل کرے (بشرطیکہ یہ قتل جنایت نہ ہو) تو مسلمان باہم مل کر خون بہا ادا کریں۔

شق (۱۳) قانون اساسی اس طرح ہے:

ہرگاہ کوئی مومن اگر قہر و ظلم یا جنایت کرے یا کسی کا حق پامال کرے یا مومنین میں نفاق پیدا کرے، شق اوّل و دوم میں جو حق اسے حاصل ہے اس سے محروم ہو جائے گا۔ اس نوعیت کے مواقع پر تمام مسلمانوں کا ہاتھ اسے سزا دینے کے لیے اُٹھے گا، چاہے گنہگار ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ شق (۱۵) قانون اساسی میں مرقوم ہے:

ایک فقیر ترین مومن کا حق ایک غنی ترین مسلمان کے حق کے مساوی ہے۔

شق (۱۶) میں قاتل کی بابت لکھا ہے:

جو کوئی عمداً قتل کا ارتکاب کرے، پس قتل کیا جاوے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ایک قاتل کی حمایت کرے۔

شق (۲۳) میں مذکور ہے: ''ہر نوع کے اختلافات پر خدا سے رجوع کرو اور بوسیلۂ نمائندۂ خدا یعنی پیغمبر ﷺ ان اختلافات کو حل کرو''۔ شق (۲۶) میں لکھا ہے:

یہودیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی دینی اقدار کی حفاظت کریں اور مسلمان اپنے دین کی نگہداری کریں۔ ان اشخاص کی بابت جو ان کے مولا یا آقا ہیں یا ان کی پناہ میں ہیں، اسی ترتیب سے عمل ہوگا۔

مولا، آقا یا پناہ لینے والوں کے متعلق گزشتہ ابواب میں توضیح کر دی گئی ہے۔

ایک اور شق میں لکھا ہوا ہے:

حزینہ جو یہودیوں کے ذمہ ہوگا وہ خود ادا کریں گے اور جو حزینہ مسلمانوں کے ذمہ ہوگا اس کی ادائگی مسلمان کریں گے۔ جو کوئی اس نوشتہ کے برعکس عمل کرے گا یہودی اور مسلمان مل کر اس سے جنگ کریں گے۔ مسلمان اور یہودی مکلف ہیں کہ ایک دوسرے سے نیک برتاؤ کریں اور باہم حد سے تجاوز نہ کریں۔

شق (۴۳) میں مرقوم ہے:

ساکنین مدینہ (مسلمان اور یہودی) افراد قبیلۂ قریش اور ان کے حلیفوں کی حمایت کا ارتکاب ہرگز نہیں کریں گے۔

اس شق میں قبیلہ قریش سے وہ لوگ مراد ہیں جو مکّہ میں مسلمانوں کو رنج پہنچاتے ہیں اور اسلام قبول نہیں کرتے۔

ایک اور شق قانون اساسی یہ ہے:

کہ سرزمین شہر مدینہ (یثرب) حرم تصور ہوگی اور اس میں جدال نہ کیا جائے گا۔

مدینہ کے عوام اس قانون اساسی سے خوش ہوئے، اس لیے کہ اس قانون کی وجہ سے مدینہ کے رہنے والے سب افراد کی حیثیت مساوی ہوگئی تھی۔

عرب جو مدینہ میں زندگی بسر کرتے تھے، تمام مسلمان تھے، بجز عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ کہ قرآن نے انھیں منافق گردانا ہے۔

منافقین برخلاف اس کے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے تصور کیا، مخالفِ اسلام کے معنی میں

نہیں۔ منافقین مخالفِ اسلام نہیں تھے لیکن وہ اسلام کی طرفداری میں سنجیدہ بھی نہیں تھے اور انھوں نے خود کو وسط قرار دیا ہوا تھا۔

خداوند نے سورۃ نسا کی آیت ۱۳۷ میں منافقین کی نسبت فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ﴾ ''یہ (منافقین) وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، بعد میں کافر ہوئے، پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہوئے اور یہ حالتِ کفر پر ثابت رہے۔ ایسے لوگوں کی خداوند مغفرت نہیں کرے گا۔ انھیں رشد و ہدایت نہیں کرے گا''۔

اسی سورۃ نسا کی آیت ۱۴۵ میں دوبارہ منافقین کی بابت فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴾ ''منافقین کو جہنم کے سب سے نچلے درجے میں رکھا جائے گا اور اے محمد ﷺ تو کسی کو ان کا مددگار نہ پائے گا''۔

یہاں اس چیز کی توضیح ضروری ہے کہ خداوند نے منافقوں کے لیے معمولی عذاب نہیں رکھا، یعنی ایک منافق کہ نہ طرفدارِ اسلام ہے اور نہ مخالفِ اسلام، یعنی جو مسلمان ہو کر بھی بے طرف (غیر جانبدار) رہے، اس کے لیے ایسا عذاب تیار کیا گیا ہے جو ایک ایسے کافر کے عذاب سے بدرجہا شدید تر ہے جو اسلام کا صریح مخالف ہے۔

خداوند کا جو فرمان محمد ﷺ پر نازل ہوا اس پر توجہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دین کے معاملہ میں بے طرفی، انصاف کے لحاظ سے خداوند کے نزدیک بدترین گناہوں میں سے ہے۔

محمد ﷺ کے مکّہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد قبائل قریش کا بغض اور کینہ اور زیادہ ہو گیا اور قریش کے دو سرداروں (ابوسفیانؓ، ابی بن خلف) نے مسلمانانِ مدینہ کو ایک الٹی میٹم دیا جس کی عبارت درج ذیل ہے:

تم سے ہمارے روابط کا منقطع ہونا بہت زیادہ افسوس ناک ہے یہاں تک کہ اگر قبائل عرب کا کوئی بھی قبیلہ ہم سے قطع روابط کرتا تو ہمارے لیے اس قدر اہم نہ تھا۔ لیکن جو

قدم تم نے اُٹھایا اس سے تمھارے اور ہمارے تعلقات خراب تر ہو گئے ہیں۔ تم نے اس شخص کو پناہ دی ہے جو مکّہ کے بزرگوں میں سے ایک تھا۔ تمھارے اسے پناہ دینے کے سبب ہم مداخلت پر مجبور ہوئے ہیں اور تمھیں متنبہ کرتے ہیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان مت آؤ۔ اگر وہ شخص نیکوکار ہے تو اس صورت میں ہم اسے بہتر پہچانتے ہیں کہ کیسے اس کی شخصیت سے فائدہ اُٹھایا جائے اور اگر بدکار ہے تو بھی ہم بہتر جانتے ہیں کہ کس طرح اسے اس کے عملوں کی سزا دیں۔

انصار کو جب یہ الٹی میٹم ملا تو انھوں نے ایک شاعر کعب بن مالک سے قریش کی ہجو لکھنے کے لیے کہا۔ ہم نے کہا ہے کہ کلام خواہ منثور ہو یا منظوم، عربستان میں قدر اور تاثیر رکھتا تھا حتیٰ کہ مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ ہجو ایک پیکان (تیر) کا کام کرتی ہے۔

کعب بن مالک نے قریش کی ہجو لکھی اور انھیں بھجوا دی۔ لیکن قریش پھر بھی باز نہ آئے اور دوسری بار پھر ایک نامہ مدینہ والوں کو بھجوایا۔ لیکن اس دفعہ ان کا مخاطب عبداللہ بن ابی (منافقوں کا سردار) تھا۔ اس خط میں قریش نے عبداللہ بن ابی کو خطاب کر کے کہا کہ تم نے ہم میں سے ایک فرد کو جو مکّہ سے بھاگ کر مدینہ گیا ہے اور وہاں اس نے سکونت اختیار کر لی ہوئی ہے، پناہ دی ہوئی ہے۔ اگر تم اسے ہماری تحویل میں نہ دو گے تو ہم مدینہ پر ہجوم کی صورت میں چڑھ آویں گے اور تمھیں قتل کر دیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنے تصرف میں لے لیں گے۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے اس خط کے جواب میں کوئی قدم نہ اُٹھایا اور اگر وہ کوئی قدم اُٹھاتے تو منافق قرار نہ پاتے۔

عربوں کا قول ہے کہ منافق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا کردار آغاز سے آخر عمر تک نہ مثبت ہو اور نہ منفی۔ وہ فقط بحث کرتے ہیں کہ کیا قدم اُٹھایا جائے تاکہ ظاہراً وہ سوسائٹی میں اچھے دکھائی دیں۔ لیکن بوقتِ رائے شماری خاموش ہو جاتے ہیں۔

جب قریش نے دیکھا کہ دونوں خطوط لاحاصل ثابت ہوئے ہیں تو ایک خط یہودیوں کے نام لکھا اور ان سے مدد چاہی۔ یہودیوں نے صریحاً تو جواب نہ دیا کہ وہ محمد ﷺ سے

برسرِ پیکار ہوں گے اور ان کو گرفتار کر کے قریش کے حوالے کریں گے۔ لیکن یہ وعدہ کر لیا کہ ضرورت پڑنے پر ممکن ہے وہ قریش کی مدد کریں۔

قریش نے جب دیکھا کہ تینوں خطوط کا نتیجہ حسب منشا نہیں تو انھوں نے ارادہ کیا کہ محمد ﷺ کے خلاف اقتصادی جنگ کا آغاز کیا جائے۔

قریش سب تاجر تھے اور ایک تاجر کا مؤثر ترین ہتھیار اقتصادی جنگ ہی ہو سکتا ہے جس میں اقتصادی محاصرہ لازمی ہوتا ہے۔

قریش دس قبیلوں پر مشتمل تھے اور تمام شمالی جزیرہ نمائے عرب کے تجارتی راستوں پر ان کا کنٹرول تھا، اس لیے وہ مدینہ کا اقتصادی محاصرہ کرنے کی پوزیشن میں تھے کہ کسی قسم کی اشیا مدینہ نہ پہنچ سکیں۔

اگر ایسا واقعہ مکّہ والوں کو پیش آیا ہوتا تو وہ سب بھوکوں مر جاتے، اس لیے کہ مکّہ میں زراعت نہیں تھی مگر مدینہ کا علاقہ سرسبز تھا وہاں سے اناج مکّہ میں آتا لیکن پھر بھی مدینہ کے لوگوں کو دشواری پیش آرہی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کے نرخ بہت بلند ہو گئے تھے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ مسجد مدینہ سے ملحق حجرہ میں رہتے تھے۔ اس اقتصادی محاصرے سے بہت متاثر اور فکر مند تھے اس لیے کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ قریش صرف میری ذات سے دشمنی کی وجہ سے پورے شہر کے لوگوں کو بھوکوں مار رہے ہیں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ مدینہ میں بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا گھر کھجور کی شاخوں اور پتوں سے بنا ہوا تھا۔ اس خیال سے کہ گزرنے والوں کی اندرونِ خانہ نگاہ نہ پڑے، کھجور کے تنوں پر کھال لٹکا دی گئی تھی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے گھر میں بھیڑ کی ایک کھال بچھائی ہوئی تھی جس پر وہ سوتے بھی تھے اور اسی سے دسترخوان کا کام لیتے۔ ان کی خوراک جو کی روٹی تھی یا کھجوریں لیکن کبھی بھی دونوں اکٹھا نہ کھایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ زوجہ پیغمبر ﷺ اسلام فرماتی ہیں: جب مدینہ اقتصادی محاصرہ میں تھا کھانے پینے کی اشیا کی قیمتیں بہت چڑھ گئی تھیں۔ ہم گھر میں پکانے کے لیے آگ نہیں

جلاتے تھے اس لیے کہ پکانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں اور کبھی دو روز متواتر روٹی نہیں کھائی تھی۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کے گھر میں بیوی تھیں مگر پھر بھی آپ ﷺ گھر کے کام کاج میں عار نہ فرماتے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے۔ جب کبھی گھر میں کچھ پکانے کے لیے ہوتا تو چولہے میں آگ جلاتے۔ اس گھر کی پکی غذا ایک قسم کی حلیم (آش) ہوتی تھی اور چونکہ اہلِ خانہ کو کبھی گوشت کھانے کی بھی خواہش ہوتی تھی لہٰذا کبھی کبھی اس گھر میں گوشت بھی پکتا تھا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ اپنا لباس خود ہی سی لیتے۔ جوتا خود بنا لیتے یا مرمت کر لیتے اور چونکہ طبیعت میں بہت نظافت تھی، اپنے لباس کو خود ہی دھو لیتے۔ مسواک ہر روز کا معمول تھا۔ آپ ﷺ کا قول ہے کہ "صفائی آدھا ایمان ہے"۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زندگی میں اگر کسی قسم کی شان و شوکت کو دخل تھا تو وہ صرف تولیہ تھا کہ خرما تناول فرمانے کے بعد اس سے ہاتھ صاف فرماتے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو شانِ امارت کی تعریف میں آتی ہو۔

آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سب کھجور کی بنی ہوئی چٹائی پر ہی بیٹھتے تھے اور دسترخوان بھی کھجور کے پتوں کا ہی بنا ہوا ہوتا تھا۔

جب اقتصادی محاصرہ شدت اختیار کر گیا اور لوگوں کو کھانے پینے کی اشیا کی دستیابی مشکل ہو گئی تو محمد ﷺ جو پیغمبرِ اسلام تھے مجبور ہوئے کہ ایک سیاسی زمامدار (حکمران) کے وظائف بھی اپنے سر لیں اور کوئی اقدام کریں۔ جس دن سے زمامداری وجود میں آئی ہے، ایک زمامدار کی روش ایک حریف کے مقابلہ میں دو طرح کی ہوتی ہے: ایک سیاست، دوسرے جنگ۔

تاریخ کے آغاز سے آج تک رئیس حکومت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ دشمن کا مقابلہ کرنے میں ان دو وسیلوں میں سے کسی ایک سے کام لے۔ بالکل اسی طرح جیسے آغازِ تمدن سے آج تک ہر وہ شخص جو لباس بنانا چاہتا ہو مجبور ہوتا ہے کہ سوئی دھاگہ اور قینچی کا وسیلہ اختیار کرے۔ کوئی دوسرا طریقہ لباس دوزی کے لیے ہے ہی نہیں۔

محمد ﷺ نے سوچا کہ قریش سے سیاسی مقابلہ بہت مشکل ہے لہٰذا دوسرے طریقہ یعنی جنگ کو ترجیح دی اور ارادہ کرلیا کہ اب تلوار نیام سے نکالنی ہوگی۔

ایک عرب شاعر نے تلوار کی یوں تعریف کی ہے:

لوہار نے تمھیں مرغ کے پر کی طرح سبک، بید کی طرح لچکدار اور مانند سنگ خارا بنایا ہے اور ایک دلیر جنگجو کی رُوح بھی تم میں رکھ دی ہے۔ اور تیری آواز ایسی ہے جیسے کوئی چشمہ بہہ رہا ہو یا کوئی سانپ پھنکار رہا ہو۔

اس دن کے بعد آپ ﷺ نے تہیہ کرلیا کہ جہاں لازم ہو خدا کی راہ میں تلوار کا استعمال کرنا ہوگا۔



اقتصادی اور تجارتی محاصرے کا جواب

پیغمبر ﷺ اسلام نے قریش کو پیغام بھجوایا: ”چونکہ تم نے مدینہ کا اقتصادی محاصرہ کیا ہوا ہے اس لیے اس کے بعد تمھارے کاروانوں کو اجازت نہیں کہ وہ مسلمانوں کے علاقہ سے گزریں اور اگر تم نے ایسی کوشش کی تو ہم مزاحمت کریں گے“۔

اس نوٹس کے بعد محمد ﷺ نے چالیس مسلمان رضا کاروں کا انتخاب کیا اور ان کی کمان حمزہؓ کو سونپی جو کہ اپنے وقت کے رُستم تھے۔

ان چالیس افراد میں سے کوئی بھی تنخواہ کا طالب نہیں تھا اور یہ سب مہاجر تھے۔ ان کے پاس گھوڑے نہیں تھے، حالانکہ محمد ﷺ جانتے تھے گھوڑا جنگی اُمور میں اونٹ سے بہتر ہے۔

مسلمان مالدار نہیں تھے کہ گھوڑے خرید کر رضا کاروں کو فراہم کرتے۔ جزیرہ نمائے عرب میں ایک خطہ بنام حجاز ہے۔ حجاز کا علاقہ بحیرہ احمر کی ساحلی پٹی پر مشتمل اور شمالاً جنوباً ایک ہزار کلومیٹر طویل ہے اور یہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔

سرزمین حجاز میں دنیا کے بہترین گھوڑے پائے جاتے ہیں۔ یہاں کا عربی گھوڑا دوڑ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ حجاز میں بھی گھوڑا ایک حیوان امارت سمجھا جاتا ہے اور سب لوگ اس کی خرید کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ دوسرے یہ کہ گھوڑا صحرا میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ بھوک اور تشنگی اس کی برداشت سے باہر ہے۔ جب کبھی عربوں کی خواہش ہوتی کہ گھوڑوں کو صحرا میں جنگ کے لیے لے جائیں تو وہ مجبور ہوتے تھے کہ اضافی اونٹوں پر ان کے لیے پانی وخوراک لاد کر چلیں تاکہ گھوڑے صحرا میں بھوکے پیاسے نہ رہیں۔ اسی بنا پر گھوڑے کا استعمال نہ فقط مالی لحاظ سے مشکل تھا بلکہ اس کے لیے اونٹوں کے ذریعے پانی وخوراک کی حمل ونقل بھی ایک دردِ سر تھا۔

اونٹ صحرا میں خشک کانٹے دار جھاڑیاں کھا کر بھی اپنے معدہ کو تسکین دے لیتا ہے اور

اگر چند روز میں ایک مرتبہ بھی پانی پی لے اور اگر کسی جگہ سبزہ میسر آجائے تو اسے چند دن بعد بھی پانی پینے کی احتیاج نہیں رہتی۔

جس کسی کاروان کے ساتھ گھوڑے ہوتے، پانی کی کمی واقع ہوجانے کی صورت میں کاروان والے مجبور ہوجاتے کہ اپنے حصہ کا پانی بھی گھوڑوں کے لیے مخصوص کردیں۔ کیوں کہ انھیں علم تھا کہ گھوڑا تشنگی برداشت کرنے پر قادر نہیں۔ لیکن جب میدانِ کارزار میں پہنچتا تو گھوڑا ایک بے نظیر سواری ثابت ہوتا۔ سواری والے جانوروں میں سے کوئی بھی گھوڑے کی سی سرعت اور فرمانبرداری نہیں رکھتا۔

عربوں کی روایات میں مذکور ہے:

خدا نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تو اسے تمام جانور دکھائے کہ جسے چاہو انتخاب کرلو۔ آدمؑ نے ان سب میں سے گھوڑے کو پسند فرمایا۔ خداوند آدمؑ کے انتخاب پر راضی ہوا، اس لیے کہ خداوند بھی گھوڑے کو دوسرے جانوروں پر ترجیح دیتا تھا۔ عرب شعرا گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں:

کوئی ایسی عورت ڈھونڈ سکتے ہو جس کے گیسو میرے گھوڑے کے بالوں سے نرم تر ہوں، کیا تم نے کوئی ایسی عورت دیکھی ہے جس کی آنکھیں میرے گھوڑے کی آنکھوں سے درخشندہ ہوں؟ کوئی ایسی عورت وجود نہیں رکھتی جو (میدانِ جنگ میں) میرے گھوڑے کی سی بے تابی دکھائے اور اس کا تمام وجود ہیجان انگیز ہو۔

حمزہؓ اور دوسرے چالیس رضاکار گھوڑے نہ ہونے کی وجہ سے غمگین تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر گھوڑے سواری میں ہوتے تو وہ اپنا فریضہ بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں کہا گیا ہے:

ہر مسلمان اپنی امکانی حد تک نر گھوڑے اور مادہ پرورش کرے اور گھوڑوں کو ہرگز مخنث نہ کریں" گھوڑوں کی پرورش سے منظور یہ ہے کہ اس مفید و نجیب جانور کی نسل بڑھے۔

حمزہؓ اور ان کے دستہ کی نگہبانی میں جو علاقہ دیا گیا وہ بحیرۂ احمر اور مدینہ کے درمیان کا علاقہ تھا، جس کا عرض ۱۳۰ کلو میٹر تھا۔ مکہ کے کاروان مجبور تھے کہ اس علاقہ سے گزریں۔

نگہبانی شروع ہونے کے چند روز بعد ہی مکہ کا ایک کاروان دکھائی دیا اور جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس کاروان کا سالار ابوجہل ہے جو رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

ابوجہل وہی تھا جو محمد ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پیغمبر ﷺ کے سر کی قیمت مقرر کی تھی اور اس سے پہلے محمد ﷺ کے سر کو اوجھڑی میں باندھا تھا کہ وہ دم گھٹ کر مر جائیں۔

مسلمانوں کو جب معلوم ہوا کہ ابوجہل رئیس کاروان ہے تو وہ حملہ کے لیے تیار ہوگئے۔ اس موقع پر اس علاقہ کے قبیلہ کا رئیس (جہاں سے کارواں گزر رہا تھا) کہ نام اس کا محمد بن عمرو تھا، سامنے آگیا اور حمزہؓ سے کہا کہ کاروان پر حملہ کرنے سے باز رہیں۔ اس لیے کہ ہمارا قبیلہ قریش سے معاہدے کا پابند ہے کہ قریش کے کاروان بغیر کسی دستبرد کے ہمارے علاقہ سے گزریں گے۔ پس نہ ہم خود قریش کے کاروان کو لوٹیں گے اور نہ کسی کو ان پر حملہ کرنے کی اجازت دیں گے کہ وہ ہمارے علاقہ میں ان قافلوں کو ہدف بنائے۔ اس معاہدہ اور حمایت کے عوض ہم قریش کے کاروانوں سے سال میں دو مرتبہ باج (خراج) وصول کرتے ہیں۔

محمد بن عمرو نے کہا: ایسا ہی ہمارا معاہدہ تاجران مدینہ سے بھی ہے۔ مدینہ کے کاروان بھی بغیر کسی خطرہ کے ہمارے علاقہ سے گزر سکتے ہیں اور ہم کسی کو اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی مزاحم ہو۔ اس کے عوض کہ ہم مدینہ والوں سے باج لیتے ہیں، ہم عہد کے پابند ہیں کہ مدینہ کے قافلوں کی حفاظت کریں۔ ہر عہد و میثاق مقدس ہے، اس کا احترام ہونا چاہیے۔

حمزہؓ خود عرب تھے اس لیے جانتے تھے کہ قول و عہد کی بے حرمتی نہیں کی جاسکتی، اور اگر ہم نے کاروان پر حملہ کیا تو ایک تو اس قبیلہ سے جنگ کرنی ہوگی، دوسرے آئندہ اس علاقہ سے مدینہ کے قافلوں کا گزر محال ہوجائے گا۔

ابوجہل نے مکہ پہنچ کر یہ واقعہ بیان کیا۔ قریش نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ قافلوں کو حفاظتی دستوں کی مدد سے مدینہ کے علاقہ سے گزاریں گے۔

اگر کوئی متبادل راستہ ہوتا تو مکہ والے اس راہ سے نہ گزرتے۔ لیکن متبادل راستہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً انھیں اس تنگ پٹی سے گزرنا پڑتا تھا یعنی مدینہ اور سمندر کے درمیان کا علاقہ۔

محمد ﷺ کی پیشکش رد کر دی ہوگی کیوں کہ ہم خود کو عقل مند سمجھتے ہیں، نقد موجود کو بہشت موعود کے لیے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن بدوی عربوں نے محمد ﷺ کی پیش کش قبول کی اور آمادہ ہوگئے کہ ساکنانِ مکہ سے جو منفعت حاصل ہوتی ہے اس سے صرف نظر کریں اور اس کے عوض بعد از مرگ جنت میں جائیں۔

صحرانشین عربوں کی قبولیت کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو قرآن کی بہشت کے متعلق آیات کہ جو سورۃ الدھر میں ہیں۔ اس سورۃ کی ۱۲ویں آیت میں خداوند نے فرمایا ہے:

﴿وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا﴾ ”اس لیے کہ انھوں نے بھوک اور پیاس پر صبر کیا، خداوند اس عمل کی پاداش میں انھیں جنت عطا فرمائے گا اور حریر (ابریشم) پہنائے گا“۔

اور آیت ۱۳ میں فرمایا:

﴿مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا﴾ ”وہ لوگ بہشت میں جائیں گے۔ وہاں وہ مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوں گے اور وہاں انھیں گرمی کا سامنا ہوگا اور نہ سردی کا“۔

اور آیت ۱۴ میں فرمایا:

﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا﴾ ”وہاں بہشت میں درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوں گے اور پھلوں کا حصول ان کے اختیار میں ہوگا“۔

ان آیات کی فصاحت کا یورپین ادراک نہیں کر سکتے، فقط ایک عرب سمجھ سکتا ہے کہ ان چند کلموں میں کس قدر فصاحت سے کام لیا گیا ہے۔ جب خوش الحانی سے اسے پڑھا جائے تو عرب صحرانشین جو فطرتاً سخن شناس ہے اور فصاحت کا ادراک رکھتا ہے، کلام کی زیبائی اور برجستگی سے متاثر ہوتا تھا۔ اللہ کا کلام اس کی روح میں اس طرح جگہ پکڑتا ہے کہ اسے فراموش کرنا اس کے لیے محال ہوتا ہے۔ آیات ۱۹ میں فرمایا ہے:

﴿وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا﴾ ”بہشت میں لوگوں کی خدمت کے لیے غلمان (خدمت گار) موجود ہوں گے کہ ہمیشہ جوان

رہیں گے اور تو (اے محمد ﷺ) اگر ان پر نگاہ کرے تو تصور کرے گا کہ یہ جوان مانند موتیوں کے ہیں، تازہ صدف سے نکلے دمکتے ہوئے“۔ [الدھر ۷۶:۱۴]

اگر وہ تمام آیتیں جو اس سورۃ الدھر میں بہشت کی نعمتوں سے متعلق ہیں اور اسی طرح قرآن کی دوسری جگہوں پر اس موضوع سے متعلقہ آیات بیان کی جائیں تو یہ طول پکڑ جائے گا۔ چونکہ یہ موضوع از لحاظ تاثیر قرآن اور محمد ﷺ کی شخصیت کے بہت اہمیت کا حامل ہے، ہم اگلے صفحات میں اس پر مزید گفتگو کریں گے۔

محمد ﷺ بدوی قبائل کو مسلمانوں سے متحد کرنے کے لیے ساٹھ مسلمان رضا کاروں کے دستہ کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکل پڑے۔ اس مرتبہ اس چھوٹی سی فوج کے کماندار خود محمد ﷺ تھے اور اس دفعہ بھی مسلمانوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے۔ بلکہ اونٹوں پر ہی سوار تھے۔

محمد ﷺ مدینہ سے نکل کر قبیلہ غفار کے علاقے کی طرف بڑھے۔

قبیلہ غفار پہلا قبیلہ تھا جس نے اسلام قبول کیا۔

اس روز سے دس سال قبل ابوذر غفاریؓ کہ ایک راہزن تھے، اپنے عمل پر پشیمان ہو کر ایمان لائے تھے اور راہزنی چھوڑ دی تھی۔ محمد ﷺ نے انھیں قبیلہ میں واپس بھجوا دیا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کو اسلام کی دعوت دیں۔ اس دس سال کی مدت میں تمام قبیلہ (غفار) مسلمان ہو چکا تھا اور راہزنی ترک کر دی تھی۔

قبیلہ غفار کا مسکن مدینہ اور ینبع کا درمیانی علاقہ تھا۔ محمد ﷺ نے قبل اس کے کہ غفاریوں کے علاقے تک پہنچیں راستے میں ”ابواء“ نامی ایک مقام پر توقف فرمایا۔ اس لیے کہ والدہ محترمہ (بی بی آمنہ) کی قبر وہاں تھی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ جب والدہ کی قبر کے نزدیک پہنچے تو اونٹ سے اتر آئے۔

مسلمان جنھیں علم تھا کہ آپ ﷺ کی والدہ یہاں مدفون ہیں کچھ دور ہی ٹھہر گئے۔ فقط عمر بن الخطاب کہ وہ بھی رضا کاروں کے دستہ میں شامل تھے، آپ ﷺ کے ساتھ قبر تک گئے۔ محمد ﷺ قبر کے مقابل دو زانو ہوئے، قبر پر سر رکھا اور رو پڑے۔ اس تاریخ تک والدہ

محترمہ کو فوت ہوئے تقریباً پچاس سال ہو چکے تھے، مگر محمد ﷺ مانند یک طفل کہ اس کی والدہ ابھی ابھی دفن کی گئی ہو، رو رہے تھے۔

محمد ﷺ کی والدہ محترمہ نے جو رنج آپ کی پرورش کے سلسلے میں اُٹھائے تھے، آپ ان کو یاد کرنے لگے۔ جب محمد ﷺ پیدا ہوئے تو والد وفات پا چکے تھے اور والدہ محترمہ (بی بی آمنہ) کا نہ اب شوہر تھا اور نہ کوئی روٹی کما کر دینے والا۔ انھوں نے محمد ﷺ کی یتیمی ہی میں پرورش کی حتیٰ کہ وہ وفات پا گئیں۔ محمد ﷺ قبر پر بیٹھے اُن سختیوں کی یاد میں کھو گئے جو انھوں نے بچپن میں جھیلی تھیں۔ انھیں یاد آیا کہ جب تک والدہ زندہ تھیں ہر قسم کی سختی کا جھیلنا آسان تھا۔

نیز جب آپ ﷺ بچے تھے تو آپ کی والدہ گھر آنے پر ہاتھ پاؤں دھوتیں اور انھیں جو بھی کھانا میسر ہوتا بٹھا کر کھلاتیں اور بڑے پیار سے غذا کھانے کی تلقین کرتیں۔ لیکن والدہ کی وفات کے بعد محمد ﷺ بالکل تنہا رہ گئے تھے اور جب صحرا سے ننگے پاؤں واپس آتے تو کوئی نہ تھا جو ہاتھ پاؤں اور منہ دھلاتا اور دست شفقت آپ کے سر پر رکھتا، حتیٰ کہ کوئی نہیں تھا جو آپ کی واپسی ہی کا منتظر ہو۔ کون ہے جو ایک یتیم اور بغیر ماں کے بچے کی واپسی کا انتظار کرتا ہے اور گھر واپسی پر اس کے لیے کھانا پانی فراہم کرتا ہے کہ وہ یتیم کھانا کھا اور پانی پی کر مطمئن اور خوش ہو جائے۔

محمد ﷺ اس قدر والدہ کی قبر پر روئے کہ عمرؓ بن الخطاب جو بڑے سخت مزاج تھے، انھوں نے عرض کی: اب بس کیجیے وگرنہ نزدیک ہے کہ میں بھی رو دوں۔

کچھ مؤرخین اسلامی مثلاً ابنِ سعد، بخاری و ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ جب محمد ﷺ نے قبر سے سر اُٹھایا تو عمرؓ بن الخطاب نے ان سے عرض کی: اے محمد ﷺ! آپ اس قدر روئے کہ میری بھی آنکھیں پُرنم ہو گئی ہیں۔ غرضیکہ پیغمبرِ اسلام ﷺ والدہ کی قبر پر اس قدر روئے کہ عمرؓ بن الخطاب جیسا مضبوط اعصاب کا مالک فرد بھی متاثر ہو کر آب دیدہ ہو گیا تھا۔

والدہ محترمہ کی قبر سے رخصت ہونے کے بعد پیشتر اس کے آپ قبیلہ غِفار کے پاس پہنچیں، علاقہ ودان میں گئے جو بنوضمرہ کا مسکن تھا اور کوئی بھی اس قبیلہ میں سے ابھی تک

مسلمان نہیں ہوا تھا۔ قبیلہ بنوضمرہ غفاریوں کی ایک شاخ شمار ہوتا تھا۔ محمد ﷺ نے وہاں ایک ہفتہ توقف کیا اور قبیلہ کے سرکردہ لوگوں سے مذاکرات کیے۔

ایک ہفتہ کے مذاکرات میں جو قبیلہ کے سرکردہ لوگوں سے ہوئے قرآن مجید کی آیات بھی پڑھ کر سنائی گئیں اور اس کے نتیجہ میں ایک پیمان دفاعی دونوں (محمد ﷺ اور قبیلہ بنوضمرہ) کے درمیان لکھا گیا۔ اس پیمان میں محمد فرستادۂ خداوند اور مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ نے عہد کیا کہ مسلمان قبیلہ بنوضمرہ پر حملہ کی صورت میں اس کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اگر محمد ﷺ کو اس قبیلہ کی مدد و حمایت کی ضرورت ہوئی تو قبیلہ مذکور محمد ﷺ کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوگا۔

پیمان کے مطابق قبیلہ (بنوضمرہ اب مجاز نہیں تھا کہ مکّہ کے کاروانوں کو اپنے علاقہ سے گزرنے دے۔ قبیلہ بنوضمرہ کا علاقہ مدینہ سے تین روز کی مسافت پر تھا اور مکّہ سے نو روز کے فاصلے پر تھا۔[۳]

ہمارا خیال ہے کہ محمد ﷺ سے قبیلہ مذکور کے متحد ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ مکّہ ان سے دور اور مدینہ نزدیک تھا۔ باوجود یہ کہ مکّہ دور تھا، قبیلہ بنوضمرہ قریش کو طاقت ور سمجھتا تھا، تاہم قبیلہ مذکور قریش کو چھوڑ کر محمد ﷺ سے متحد ہوا تو اس کا سبب وہ وعدے تھے جو محمد ﷺ نے اعضائے قبیلہ سے کیے۔ آپ ﷺ نے کہا: اگر تم لوگ ہم مسلمانوں سے متحد ہوئے تو تمھیں بہشت میں جگہ ملے گی۔ قبیلہ بنوضمرہ کے لوگوں نے جب یہ سنا کہ بہشت ایک سرزمینِ سعادت جاودانی ہے اور جو شخص وہاں جائے گا سعادت مند ہو جائے گا تو محمد ﷺ سے دفاعی اتحاد کر لیا۔

نبی ﷺ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ بہشت وہ جگہ ہے کہ اگر انسان وہاں ایک بار داخل ہو گیا تو ہمیشہ کے لیے خوشی و کامرانی سے بسر کرے گا، لہٰذا بہشت کے حصول کے لیے ہر قربانی جو انسان دے سکے جائز ہے۔

اس جہان میں انسان کی زندگی بہت کوتاہ ہے۔ اس کو مختصر زندگی میں بھی مسلسل مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، لیکن بہشت میں عمر جاوید اور ہمیشہ کی سعادت ہوگی۔ اس دنیا کو اگلے جہان

۳- بنوضمرہ کا علاقہ ودان، ابواء سے ۱۳ کلومیٹر اور جحفہ سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر دور تھا۔ [اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، ص ۲۰۲]

کے عوض بیچ دینا ایک سودا ہے جو انسان کے لیے ہمہ جہت نفع بخش ہے۔

اس پیمان کی تکمیل کے بعد آپ ﷺ قبیلہ غفار کی طرف عازم سفر ہوئے، جس کے افراد محکم ارادہ کے مالک اور باغیرت اور جری مسلمان تھے۔ قبیلہ غفار آج بھی موجود ہے اور کرنل لارنس (المعروف بہ لارنس آف عربیہ) کی پہلی جنگ عظیم میں کوشش تھی کہ عربوں کی ایک متحدہ مملکت قائم کرے[۴] اور وہ اس جنگ کے دوران قبیلہ غفار کے علاقہ ہی میں سکونت پذیر رہا۔

کرنل لارنس نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ بنوغفار آج بھی وہی رُوح اور اخلاق رکھتے ہیں جو اوائل اسلام میں تھا۔ وہ سیاہ کو اختیار کریں گے یا سفید کو، خوب کو یا بد کو، صدق کو اپنائیں گے یا کذب کو۔ ان کی عملی زندگی میں اور سوچ کے پیمانوں میں کوئی درمیانی راستہ نہیں۔ کرنل لارنس قبیلہ غفار کو بدوی قبائل میں سے ایک خالص ترین قبیلہ لکھتا ہے اور افراد قبیلہ کی زندگی میں چونکہ منافقت کا فقدان تھا، یہ لوگ قبل از اسلام راہزن تھے۔ بعد از اسلام تمام مرد و زن پرہیزگار بن گئے، حتیٰ کہ ان کے خیال میں بھی کبھی نہیں گزرا کہ کسی کا حق دبالیں یا کسی پر ظلم کریں۔

قبیلہ غفار کے افراد احکام اسلامی کی بجا آوری میں اس قدر دقیق اور سخت گیر تھے کہ اگر ان میں سے کوئی مرتکب گناہ ہوتا، از خود پیغمبر ﷺ اسلام کے پاس چلا جاتا اور اعتراف گناہ کرتا، قبل اس کے کوئی اور فرد اس کے گناہ سے مطلع ہو۔ قبیلہ غفار کے سرداروں میں سے ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد ایک محصنہ (شادی شدہ عورت) سے زنا کا مرتکب ہوا۔ کسی شخص نے بھی اس کے عمل کو نہیں دیکھا تھا کہ اس پر حدود شرعی لگائی جائیں۔ اور اگر کوئی ایک فرد دیکھ بھی لیتا اور تہمت لگا دیتا، پھر بھی کافی نہ تھی کیوں کہ چار افراد کی شہادت درکار تھی کہ انھوں نے اس مرد اور عورت کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، تب جرم کے لیے شہادت مکمل ہوتی۔ لیکن

۴- عربوں کی متحدہ اور بڑی مملکت کی تشکیل ایک سازش تھی مسلمانوں کے خلاف۔ عرب قومیت کو بھڑکا کر عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا۔ اس بغاوت میں انگریزوں نے عربوں کی مدد کی۔ کرنل لارنس اس عمل کے سبب برطانیہ میں ہیرو گردانا گیا کہ اس نے خلافت عثمانیہ سے عربوں کو جدا کر کے مسلمان حکومت کو کمزور کر دیا اور پھر عربوں اور عثمانیوں کو اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ کرنل لارنس ایک بہت بڑا مسلم دشمن تھا۔ [مترجم]

جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا اس پر کوئی شاہد نہیں تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ سنگسار کر دیا جائے گا کیوں کہ ہر فرد کہ محصنہ سے زنا کا مرتکب ہو، یہودیوں اور مسلمانوں میں اس کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ وہ شخص پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، مجھے سزا دی جائے۔ پس جب تحقیق کر لی گئی کہ اس کے دماغ میں خلل نہیں ہے اور جنون و دیوانگی کی وجہ سے خود کو متہم نہیں کر رہا تو اسے سزا دی گئی۔

ایک مرتبہ ایک جنگ کے موقع پر اونٹوں کی کمی کی وجہ سے تمام مسلح افراد سوار نہ ہو سکے تو محمد ﷺ نے قبیلہ غفار کے مسلمان جنگجو افراد کو رخصت دے دی اور فرمایا کہ تم قبیلہ میں واپس چلے جاؤ کیوں کہ تمھیں میدان جنگ میں لے جانے کے لیے سواری نہیں ہے۔ قبیلہ غفار کے افراد اپنی اس محرومی کی وجہ سے رونے لگے اور وہ بھی اس شدت سے کہ معلوم ہوتا تھا شاید ان کے بچے اور عورتیں وفات پا گئی ہیں۔ پس اس روز سے مسلمانوں نے قبیلہ غفار کا نام (بنوبُکاء) رکھ دیا یعنی رونے والوں کا قبیلہ۔

محمد ﷺ نے قبیلہ غفار سے بھی ایک دفاعی معاہدہ کیا اور اس معاہدہ میں دونوں فریق اس بات پر متفق ہو گئے کہ اگر قبیلہ مذکور پر حملہ کیا جائے گا تو مسلمان ان کا دفاع کریں گے اور جب کبھی مسلمانوں کو قبیلہ غفار کی مدد و حمایت کی ضرورت ہوئی تو اہل قبیلہ دشمنان اسلام کا مقابلہ مسلمانوں سے متحد ہو کر کریں گے۔ بتدریج قبیلہ غفار نے پیغمبر ﷺ اسلام کا اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ ایک مسافرت میں محمد ﷺ نے اپنی جگہ ابوذر غفاریؓ کو مسلمانوں کے نظم و نسق پر مامور فرمایا تھا۔

قبیلہ غفار سے جنگی پیمان استوار کرنے کے بعد محمد ﷺ نے اس جگہ سے کوچ کیا اور قبیلہ جُہینہ کے علاقہ کی طرف چل دیے۔ قبیلہ مذکور ینبع کے پہاڑی علاقہ ''رواوہ'' میں سکونت پذیر تھا۔ یہ قبیلہ بھی مسلمانوں کا اتحادی ہو گیا اور افراد قبیلہ پکے مسلمان ثابت ہوئے۔ انھوں نے مدینہ میں اپنے خرچ سے ایک مسجد تعمیر کی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا سفر جاری رکھا اور قبیلہ مدلج کے علاقہ میں جا پہنچے۔ یہ وہی قبیلہ

تھا جس کا رئیس سراقہ بن مالک، محمد ﷺ کو بوقت ہجرت راہ میں گرفتار کرنے آیا تھا کہ ایسا کر کے قریش سے انعام حاصل کرے۔ تین کوششوں میں اس کے گھوڑے نے اس کا ساتھ نہ دیا تھا۔ ہر چند کہ وہ گھوڑے کو ایک ایڑ لگا کر آگے بڑھانا چاہتا مگر گھوڑا اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتا۔

قبیلہ بنو مدلج نے بت پرست ہونے کے باوجود آپ ﷺ کی بڑی محبت و اکرام سے پذیرائی کی اور ایک جنگی معاہدہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ بعد میں یہی سراقہؓ بن مالک، اسلام کے سرگرم سرداروں میں سے ہوا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کو ان چاروں قبیلوں سے جنگی معاہدوں کے استوار ہو جانے پر دلی اطمینان حاصل ہوا۔ اس لیے کہ چاروں قبیلوں کا علاقہ وہی تھا جہاں سے قریش کے قافلے گزرا کرتے تھے۔ اب جب کہ وہ مسلمانوں کے اتحادی تھے، انھوں نے قریشی کاروانوں کے گزرنے کی ممانعت کر دی اور وہ مسلمانوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

جب محمد ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو ایک ناگوار خبر ان کو دی گئی۔ وہ یہ کہ محمد ﷺ کی غیر حاضری میں کچھ اونٹ سوار جو تیز رفتار سفید اونٹوں پر سوار تھے مدینہ پر ابنِ جابر کی قیادت میں حملہ آور ہوئے۔[۵] کچھ گھروں کو جلایا اور کچھ مسلمانوں کے اموال غارت کر گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انھیں قریش نے بھجوایا تھا۔ اس حملہ سے محمد ﷺ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جلد ہی مسلمانوں اور بت پرستوں میں جنگ ہوا چاہتی ہے۔



۵- یہ کرز ابن جابر فہری تھے جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور نبی ﷺ نے انھیں ایک سریہ کا امیر بنا کر بھی بھیجا۔ (م ف)

عبداللہؓ بن جحش کا حملہ

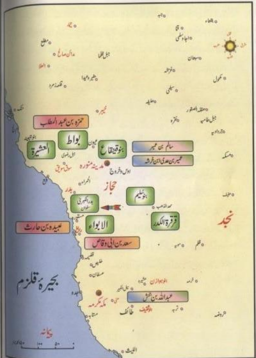
ہجرت کے دوسرے سال یعنی نومبر ۶۲۳ عیسوی میں پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ قریش پر غیر متوقع جگہ پر حملہ کیا جائے۔

مکّہ کے کاروان جو سرزمین مدینہ سے گزرتے تھے اب طاقت ور ہوتے تھے۔ ان حالات میں اتحادی بدوی قبائل اس قابل نہیں تھے کہ ان کی راہ روک سکیں، اس لیے کہ ہر قافلے کے ساتھ اوسطاً ہزار پانچ سو جنگی افراد سفر کیا کرتے تھے۔

لہٰذا محمد ﷺ نے نومبر ۶۲۳ عیسوی میں آٹھ افراد کا انتخاب فرمایا۔ ان میں سے ایک عبداللہؓ بن جحش تھے جو ان کے کمان دار تھے۔ محمد ﷺ نے ایک لکھا ہوا ملفوف حکم عبداللہؓ بن جحش کو دیا اور فرمایا کہ نجد (لغوی معنی اونچی جگہ) کی طرف جاؤ اور اس جگہ جب پانی کے کنویں پر پہنچو اور اپنے اونٹوں کو پانی پلا چکو تو اس حکم کو کھول کر پڑھنا اور اس پر عمل کرنا۔

عبداللہؓ بن جحش دوسرے مسلمانوں کی طرح احکاماتِ نبوی پر بڑی ذمہ داری سے عمل کیا کرتے تھے۔ دو دن تک مغرب کی سمت سفر کرنے کے بعد وہ ایک کنویں پر پہنچے۔ اونٹوں کو پانی پلایا۔ خود بھی پیا۔ پھر حکم نامہ کو کھول کر پڑھا۔ عبداللہؓ بن جحش نے دیکھا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے حکم دیا ہے کہ مکّہ سے طائف کی راہ میں نخلہ کے مقام پر مکّہ کے کاروان کو روکو۔ عبداللہؓ بن جحش حکم سے مطلع ہونے کے بعد باقی سات افراد کے ہمراہ دو ہفتہ کی راہ پیمائی کے بعد ماہ رجب کے آخر میں "نخلہ" پہنچے۔

میرا خیال ہے آپ اس جگہ کو بھولے نہیں ہوں گے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ابراہیمؑ نے شیطان کو پتھر مارے تھے کہ وہاں سے دور کر دیں۔ ان دنوں ایک معروف بت (منات) کا مجسمہ وہاں نصب تھا۔



نخلہ وہی جگہ ہے جب محمد ﷺ کو طائف سے زخمی حالت میں نکالا گیا تو رات کے وقت آپ ﷺ وہاں پہنچے اور تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے، خداوند سے راز و نیاز کیا۔ جس رات محمد ﷺ وہاں پہنچے تو وہ بے یار و مددگار تھے۔ اعراب ایسے شخص کو "خل" کہتے تھے۔

جب عبداللہؓ بن جحش کا دستہ وہاں نخلہ پہنچا تو چھ افراد رہ گئے تھے۔ دو افراد راہ میں گم ہو گئے تھے اور وہ دو افراد تھے سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہ بن غزوانؓ۔

ان چھ افراد کی ماموریت یہ تھی کہ کاروان جو طائف سے مکہ جا رہا ہو، اس کو نخلہ میں روکیں۔ لیکن جب یہ لوگ نخلہ پہنچے تو ماہ رجب تھا جو ماہ ہائے حرام میں سے ایک تھا۔

ہم یہ وضاحت کر دیں کہ تمام عرب میں ماہ ہائے حرام یکساں نہیں تھے۔ ہر علاقہ نے بازار عمومی کے آغاز کی مناسبت سے اپنے لیے ماہ ہائے حرام مخصوص کر لیے ہوئے تھے۔ مکہ میں ماہ ہائے حرام ذیقعد، ذی الحجہ (یعنی گیارواں اور بارواں مہینہ) اور سال کا پہلا مہینہ محرم اور پھر ساتواں مہینہ رجب الرجب مخصوص کیے ہوئے تھے۔ ماہ رجب ماہ حرام ہونے کے علاوہ حج اصغر یا عمرہ کا مہینہ بھی شمار ہوتا تھا۔ عرب اس مہینہ میں بہ اطمینان مکہ جاتے اور زیارت کرتے تھے۔

عبداللہؓ بن جحش جب نخلہ پہنچے تو ایک دن ماہ رجب میں سے باقی تھا۔ اسی دن ایک کاروان جو طائف سے مکہ جا رہا تھا وارد نخلہ ہوا۔ اس کا سامان تجارت کشمش، شراب اور کھالوں پر مشتمل تھا۔ جب کاروان والے وارد نخلہ ہوئے تو ارادہ کیا کہ تھوڑی دیر آرام کر لیں، پھر چل پڑیں گے کہ ماہ رجب ختم ہونے سے پہلے پہلے مکہ پہنچ جائیں۔ قافلہ والوں کو علم تھا کہ ماہ رجب ختم ہونے سے پہلے اگر وہ مکہ نہ پہنچے تو ممکن ہے کوئی ان پر حملہ کر دے۔

عبداللہؓ بن جحش حیران تھے کہ کیا کریں؟ اگر وہ اس کاروان پر اس جگہ نخلہ میں حملہ کرتے تو یہ کام تمام اعراب کے اعتقاد کے خلاف تھا۔ ان حرام مہینوں میں جنگ ممنوع تھی حتیٰ کہ راہزن بھی ان چار مہینوں میں کاروانوں کو نہیں لوٹا کرتے تھے۔ ممکن تھا عبداللہؓ بن جحش اس کاروان کے نخلہ سے حرکت کرنے کے بعد تعاقب کرتے اور رجب کے ختم ہونے پر حملہ کر دیتے۔

لیکن نخلہ اور مکہ کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ یقیناً قافلہ ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد حدود حرم میں داخل ہو جاتا۔ وہاں بھی حملہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے کہ حدود حرم میں جنگ کی ممانعت تھی۔

دوسری طرف عبداللہؓ بن جحش سوچتے تھے کہ یہ سامان ان مکہ والوں کا ہے جنھوں نے مدینہ کا اقتصادی محاصرہ کیا ہوا ہے اور مدینہ میں مسلمانوں کو فاقوں سے دوچار کیا ہوا ہے، اس لیے کاروان پر حملہ کرنا درست اقدام ہوگا۔ اس وقت تک مسلمانوں میں یہ سکت نہیں تھی کہ مکہ والوں کا مقابلہ کریں یا ان کی تجارت پر اثر انداز ہوں۔

عبداللہؓ بن جحش نے بالآخر آخری دلیل کو قبول کیا اور کاروان پر حملہ کر دیا۔ کاروان صرف چار افراد پر مشتمل تھا اور وہ چاروں قریش میں سے تھے۔ ان چار افراد میں سے ایک قتل ہوا۔ دو اسیر ہوئے اور ایک بھاگ نکلا۔ مسلمانوں نے اونٹوں اور سامان پر قبضہ کر لیا۔ جس شخص نے قریش کے اس آدمی کو قتل کیا اس کا نام واقد بن عبداللہ تمیمیؓ تھا اور یہ پہلا آدمی ہے جس نے خدا کی راہ میں پہلا بت پرست قتل کیا۔

جو شخص قافلہ سے بھاگ نکلا وہ مکہ پہنچا اور تمام احوال سے انھیں آگاہ کیا۔ قریش مسلمان حملہ آوروں کو پکڑنے نکلے، لیکن ناکام رہے۔ مسلمان تمام سامان اور اونٹوں سمیت مدینہ پہنچ گئے۔ اس اقدام پر نہ صرف تمام عرب میں اعتراض ہوا بلکہ مدینہ کے یہودی بت پرست بھی معترض ہوئے کہ محمد ﷺ خود کو خدا پرست کہتے ہیں، مگر خدا کی طرف سے حرام کیے گئے مہینوں کا احترام نہیں کیا اور کہا ہے کہ ماہ رجب ماہ حرام نہیں ہے۔ ماہ ہائے حرام، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف تھے اور ان کا مکہ و مدینہ میں بہت احترام کیا جاتا تھا۔ تمام لوگ حتیٰ کہ راہزن ان مہینوں میں قافلوں پر حملہ سے گریز کیا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر عربستان میں قانون (کسی بابت ہی کیوں نہ ہو) کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی، نیز اگر عرب کے صحرا نشین قوانین کی سختی سے پابندی نہ کرتے تو ان کی زندگی محال تھی۔

جزیرہ نمائے عرب میں بعض بادیہ نشینوں کے لیے ایک کوزہ ان کی دولت تھا اور اگر وہ

کوزہ چوری ہو جاتا تو قابل برداشت نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ایک سارق کی سزا عرب میں ہاتھ کاٹنا (قطع ید) مقرر تھی۔ بے چون و چرا چور کا ہاتھ کاٹ دیا کرتے تھے، وگرنہ چوروں سے اپنے مال کی حفاظت ناممکن تھی۔

ماہ ہائے حرام کا قانون بھی جزیرہ نمائے عرب کے لوگوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ سرزمین عربستان کے وسیع حصے (بشمول مکہ) خشک و غیر ذی زرع تھے، اس لیے لوگ مجبور تھے کہ زرعی علاقوں سے کھانے پینے کا سامان اور خام مال خرید کر لائیں اور اپنی مصنوعات ان علاقوں میں فروخت کریں، لہٰذا تجارت کی احتیاج تھی اور وہ ممکن نہ تھی جب تک آمد و رفت کے راستے محفوظ نہ ہوں۔

عرب کے صحرانشین چونکہ قلاش تھے، لہٰذا قافلے ان کے لیے لقمۂ تر ہوتے تھے اور چونکہ انھیں موت کی فکر نہیں ہوتی تھی، لہٰذا وہ کاروانوں پر حملہ کرتے اور تاجروں کے اونٹ اور اموال غارت کر کے لے جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ اعراب نے قانون وضع کیا کہ چند ماہ کے لیے جنگ و دستبرد ممنوع ہو گی اور اس قانون کو سب نے مانا۔

عبداللہؓ بن جحش نے ماہ رجب میں مکہ کے کاروان کو لوٹا تو اس قانون کی توہین کی تھی۔ عربستان میں حرام مہینوں کا احترام اس قدر تھا کہ خونی دشمن بھی اپنا اسلحہ اُتار دیتے تھے اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو خانہ کعبہ میں اپنے اپنے بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب حرام مہینے گزر جاتے تو پھر جنگ و جدل شروع کر دیتے تھے۔ مکہ میں ماہ ہائے حرام کے اعلان کے لیے چند نفوس پر مشتمل ایک کمیٹی بنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ذیقعد کا مہینہ شروع ہوتا تو کمیٹی کا رئیس خانہ کعبہ میں جا کر بلند آواز سے اعلان کرتا:

ماہ حرام شروع ہو گیا ہے اور جدال کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کوئی کسی سے جنگ و نزاع نہ کرے اور تمام دشمنیاں موقوف کی جائیں۔

یہی شخص ماہ ہائے حرام کے اختتام پر خانہ کعبہ میں جا کر اعلان کرتا:

حرمت قضا (ختم) ہو گئی ہے۔ لوگ اب اپنے جھگڑوں کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ہمارے تصور کے خلاف عرب صرف تقویم قمری سے ہی بہرہ ور نہیں تھے، بلکہ تقویم شمسی کی بھی پیروی کرتے تھے۔ وہ ہر تیسرا سال تیرہ مہینوں کا گن لیا کرتے تھے۔ اس ترتیب سے اعراب دو سال بارہ مہینوں کے اور تیسرا سال تیرہ مہینوں کا شمار کرتے تھے اور تیرھویں مہینے کو ماہِ صفر (یعنی خالی مہینے) کا نام دیتے تھے۔ خالی مہینہ یا ماہِ صفر آغاز میں بارہ مہینوں کے ناموں میں شامل نہیں تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ایک زائد مہینہ شمار ہوتا تھا۔ اس موقع پر عرب محرم کے دو مہینے شمار کیا کرتے تھے۔ ایک محرم الحرام اور دوسرا محرم الحلال۔ پھر وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ محرم الحلال کو صفر کا نام دے دیا گیا۔

بہر حال جب مسلمان سامان کے ساتھ مدینہ پہنچے تو دوسرے لوگوں کے علاوہ محمد ﷺ بھی اس وجہ سے کہ ان مسلمانوں نے ماہِ رجب میں مکہ کے کاروان پر حملہ کیا ہے، ملول ہوئے اور حکم دیا کہ تمام سامان کو ایک جگہ محفوظ رکھا جائے حتیٰ کہ حکم الٰہی صادر ہو۔

پیغمبر ﷺ اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ضوابطِ متارکہ جنگ کی خلاف ورزی ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ لیکن خداوند نے اپنے پیغمبر ﷺ سے فرمایا کہ اس واقعہ سے کوئی اثر نہ لو۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۱۷ میں فرمایا:

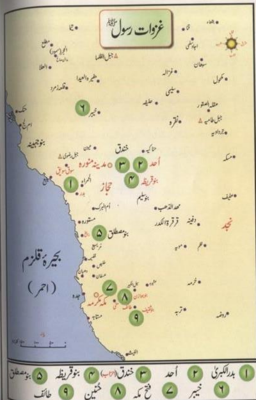
﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ "تم سے (اے محمد ﷺ) یہ ماہِ حرام اور اس میں قتل کا سوال کرتے ہیں۔ تم ان سے کہو کہ اس ماہ میں جنگ کرنا ایک گناہِ عظیم ہے، نیز لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ کو نہ ماننا اور لوگوں کے مسجد الحرام میں داخلہ کی ممانعت یا لوگوں کو مسجد الحرام سے نکالنا ماہِ حرام میں جنگ کرنے سے بدتر ہے۔ اے محمد ﷺ! انھوں نے فتنہ پیدا کیا (یعنی مسلمانوں کو مکہ سے نکالا) جو ماہِ حرام میں قتال سے بدتر ہے"۔

پوری آیت سورۃ بقرہ میں پڑھی جا سکتی ہے بہت مفصل ہے۔ اس آیت میں سابق قانون جو ماہِ حرام کے متعلق ہے کی تائید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ماہِ حرام میں قتال سے بدتر

یہ ہے کہ قریش نے پیغمبرِ اسلام محمد ﷺ اور مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے خارج کیا اور پھر ان کے خانہ کعبہ جانے پر مانع ہوئے۔ قریش نے فتنہ برپا کیا۔ فتنہ کے بہت سے معانی ہیں لیکن اس جگہ فتنہ کے معنی جلاوطنی ہیں۔ اس آیت کے نزول سے پیغمبرِ اسلام ﷺ کا اضطراب ختم ہوا، نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ دینِ اسلام کی پیش رفت کے لیے خداوند کریم کا حکم جاری ہونا چاہیے۔ اس حالت میں نقضِ ضوابطِ ماہ ہائے حرام جائز ہے۔

ایک وفد مکّہ سے مدینہ آیا کہ لوٹے ہوئے مال کی بابت پیغمبرِ اسلام ﷺ سے مذاکرہ کرے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اونٹ اور سامان واپس نہ کیا۔ دونوں قیدیوں میں سے ایک مسلمان ہوگیا اور مدینہ ہی رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ دوسرے قیدی کو سولہ سو درہم کے عوض آزاد کردیا گیا۔ اس ایک قیدی کا مسلمان ہونا مسلمانوں کے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوا۔





جنگِ بدر اور محمد ﷺ کی جنگی تکنیک

مکہ کے قافلے پر نخلہ میں مسلمانوں نے جس پالیسی کے تحت حملہ کیا تھا اس کو کامیاب بنانے کے لیے چھ ہفتے بعد مسلمانوں کے خبر رساں افراد نے اطلاع دی کہ ایک بہت بڑا کاروان جس کے ساتھ دو ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار مالیت کا سامان ہے مدینہ کے علاقے کے نزدیک پہنچ رہا ہے کہ اس طرف سے گزر کر مکہ جائے اور یہ کہ اس قافلہ کا سالار ابوسفیان ہے۔

مکہ کا ہر خاندان اس تجارتی قافلہ میں حصہ دار تھا اور وہ سب اس کی آمد کے منتظر تھے۔

کاروان ابھی مدینہ کی حدود سے چند دن کی مسافت پر ہی تھا کہ عبدالمطلب کی بیٹی نے قیافہ لگا کر، مکہ کے لوگوں کو خبر دی کہ ایک بہت بڑی بدبختی اہلِ مکہ کو پیش آنے والی ہے اور یہ بدبختی ممکن ہے چند روز میں حتیٰ کہ تین روز بعد وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

اہلِ مکہ سب تاجر تھے۔ ان کی سب سے بڑی بدبختی یہ تھی کہ ان کی دولت ضائع ہو جائے اور انھیں یہ علم بھی تھا کہ دخترِ عبدالمطلب بہت سے موقعوں پر صحیح پیش گوئی کر چکی ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا ممکن ہے کاروان کو کوئی خطرہ پیش آنے والا ہو۔

جب کبھی کوئی مکہ والوں کا بہت بڑا کاروان دور کی مسافرت سے مکہ کے نزدیک پہنچتا تو ایک تیز رفتار سوار کو تین چار دن پہلے ہی مکہ خبر دینے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ مکہ میں اس قاصد کو اصطلاحاً ''نساف'' کہا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی جب یہ قاصد مکہ پہنچتا تو عورتیں جن کے مرد کاروان کے ساتھ ہوتے تھے اور وہ ان کا انتظار کر رہی ہوتیں، فوری طور پر نہا دھو کر عطر لگاتیں تاکہ اپنے شوہروں کی اچھی طرح پذیرائی کر سکیں۔

اہلِ مکہ آپس میں کہتے کہ اگر کاروان معمول کے مطابق مکہ کے نزدیک پہنچا ہوتا تو قاصد کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ لہٰذا یقیناً کوئی ناگوار واقعہ پیش آیا ہے۔ مکہ میں ایک ادارہ تھا جس

کا وظیفہ اہم خبریں جو کہ عام دلچسپی کی ہوتیں لوگوں کو پہنچانا تھا۔ اس ادارہ کے پاس ایک گروہ ڈھنڈورچیوں کا تھا۔

اس روز جب ڈھنڈورچی نے آواز بلند کی تاکہ خبروں سے لوگوں کو آگاہ کرے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک اونٹ پر سوار ہے جس کا کجاوہ اونٹ کے پیٹ کے نیچے بندھا ہوا ہے اور ڈھنڈورچی اونٹ کی ننگی پیٹھ پر سوار ہے۔ اپنا لباس اُلٹا سیدھا پہنے ہوئے ہے، بال پریشان ہیں، اونٹ کے دونوں کانوں کو کاٹ دیا گیا ہے اور کانوں سے خون بہہ رہا ہے۔ چہرہ خاک آلود ہے۔ اور وہ اس شخص کی مانند جو نوحہ سرائی کا قصد رکھتا ہو، فریاد کر رہا ہے، دہائی دے رہا ہے:

قریش کے لوگو! تمھیں خبر ہو کہ مکّہ کے کاروان کو تباہ کن خطرہ درپیش ہے، اس لیے کہ محمد ﷺ نے عزم کر لیا ہے کہ مکّہ کے کاروان پر حملہ آور ہو۔ ہر وہ شخص جس میں غیرت وحمیت ہے وہ عزیمت وقتال پر تیار ہو جائے۔ تم محمد ﷺ کو مکّہ کے کاروان پر حملہ کی مہلت نہ دو گے۔

مکّہ کی یہ رسم تھی کہ جب کبھی ڈھنڈورچی ایک انتہائی ناگوار خبر لوگوں کو سنانے نکلتے تو اپنے حلیہ کو اس طرح بگاڑ لیتا تھا کہ اس کے سراپا سے ظاہر ہو کہ وہ ایک بری خبر سنانے نکلا ہے۔

جب سوار ڈھنڈورچی مکّہ کے گلی کوچوں میں داخل ہوا، کچھ اور پیادہ افراد بھی ڈھنڈورچی تھے جو عریاں اور خاک آلود صورت کے ساتھ مکّہ کی گلیوں میں پھیل گئے۔ عرب اس کو عریاں منادی کہتے تھے۔ منادی کرنے والے کا عریاں ہونا اس بات کی دلیل ہوتا کہ ایک بڑی بدبختی آنے والی ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح دہائی دے رہے تھے جیسے مسلمان اس لمحہ قافلہ کو لوٹ رہے ہیں اور قتل وغارت کر رہے ہیں۔ وہ منادی کے ذریعے لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قافلہ کو نجات دلانے کے لیے چل دو۔ تھوڑی ہی دیر میں ۹۵۰ مرد، ۷۰۰ اونٹ اور ۱۰۰ گھوڑے آمادہ سفر تھے۔

مکّہ کے مردوں کے علاوہ اس شہر کی عورتیں بھی جو مناف قاصد کے نہ آنے سے مضطرب تھیں، اس لشکر کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ مناف جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، کاروان کا قاصد

ہوتا تھا۔ کاروان سے چند روز پہلے مکّہ پہنچ جاتا تھا کہ عورتوں کو بشارت دے کہ تمھارے شوہر جلدی پہنچنے والے ہیں۔ مکّہ کی عورتیں جو تیار ہوئی تھیں، انھوں نے ارادہ کیا کہ میدانِ جنگ میں پہنچیں گی اور اپنے مردوں کو جوش وترغیب دلائیں گی کہ مسلمانوں کو قتل کریں۔ مسلح مردوں، اونٹوں اور گھوڑوں کے علاوہ چند گھنٹوں کے اندر اندر دو سو پچاس ہزار درہم نقد جنگی اخراجات کے لیے جمع ہو گئے۔

اس دن سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ اتنی قلیل مدت میں مکّہ کے تاجر اتنی بڑی رقم ادا کر دیں۔ ویسے بھی آج تک مکّہ کے تاجروں نے اپنا کاروبار اس قدر خطرہ میں نہیں پایا تھا۔ اب وہ محسوس کر رہے تھے کہ مسلمان مکّہ کے تاجروں کے لیے ایک مہلک خطرہ ثابت ہو رہے ہیں اور اگر جلد ہی اس خطرہ کو دفع کرنے کی تدابیر نہ کی گئیں تو کاروانوں کی آمد ورفت رک جائے گی اور ان کی زندگی مشکل ہو کر رہ جائے گی۔

ادھر محمد ﷺ نے مدینہ میں اپنی قوت جمع کی اور کاروان پر حملہ کی تیاری مکمل کر لی۔ مسلمانوں کی فوجی قوت صرف ۳۱۳ افراد پر مشتمل تھی اور وہ تمام افراد رضاکارانہ خدمت انجام دینے والے تھے۔ مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے جن کے نام اوس اور خزرج تھے۔ ان دونوں قبائل میں سے ہر ایک نے ۷۰ افراد دیے کہ وہ محمد ﷺ کا ساتھ دیں اور کاروان پر حملہ آور ہوں۔

اس تعداد کے لحاظ سے ۱۴۰ افراد انصار کے اور بقیہ مہاجرین تھے۔ ان ۳۱۳ افراد کے پاس ۷۰ اونٹوں اور دو گھوڑوں سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ پیغمبر ﷺ نے حکم دیا کہ ہر اونٹ پر دو دو افراد سوار ہوں اور بقایا افراد پیادہ سفر کریں۔ دورانِ سفر سوار پیادہ ہو کر پیادوں کو سواری کا موقع دیں تاکہ پیادہ تھک نہ جائیں۔

جب محمد ﷺ نے ۳۱۳ مسلمانوں کے ساتھ پیش قدمی کی تو دو گھوڑے بھی ساتھ تھے۔ یہ اوّلین موقع تھا کہ مسلمان دو گھوڑوں کے ساتھ ایک جنگی مہم پر جا رہے تھے۔ ماہِ رمضان کی سترھویں تاریخ اور ہجرت کا دوسرا سال تھا کہ محمد ﷺ ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ مدینہ کے جنوب مغرب میں ۱۳۰ کلومیٹر دور وادیِ بدر میں کاروان کا انتظار کرنے لگے، لیکن مکّہ کا کاروان اس دن اور بعد کے دنوں میں بھی نہ پہنچا۔

مدینہ میں مسلمانوں کے علاوہ چونکہ یہودی اور کچھ منافقین بھی بستے تھے، ان دونوں نے اپنے اپنے وسیلوں سے ابوسفیان کو اطلاع پہنچادی تھی کہ محمد ﷺ کا ارادہ کاروان پر حملہ کرنے کا ہے، لہٰذا مطلع ہونے پر اس نے راہ بدل لی اور ایک دور کی راہ سے بغیر کسی خطرہ کا سامنا کیے مکّہ کی طرف چلا گیا۔

مکّہ کا قافلہ وادیِ بدر میں نہ پہنچا، لیکن کاروان کے بجائے ۹۵۰ افراد کا مکی لشکر تیزی سے نزدیک آرہا تھا۔ اسلامی لشکر کے خبر رسانوں نے دو افراد کو جو مکّہ کے لشکر سے منسوب تھے، گرفتار کرلیا اور محمد ﷺ کے پاس لے آئے۔ محمد ﷺ نے ان افراد سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مکّہ کے ۹۵۰ جنگجو افراد کا لشکر تیزی سے اس علاقہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ ان دو افراد کو اسیر رکھا جائے۔ بعد میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے اندازے کے مطابق ہمارے ارادے کی مکّہ کے کاروان کو اطلاع دے دی گئی ہے کہ وہ اس طرف سے نہ گزریں۔ اسی طرح مکّہ والوں کو بھی ہمارے ارادوں کی بابت مطلع کردیا گیا ہے اور اب ۹۵۰ افراد کا مکی لشکر ابوجہل کی کمان میں ہمارے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ ہم یہاں سے مدینہ واپس جاسکتے ہیں لیکن یہ کوئی نجات کا راستہ نہیں، اس لیے کہ مکّہ کا لشکر مدینہ میں بھی ہم پر حملہ آور ہوگا اور ہمیں قتل کرے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ ہم اس جگہ مکّہ کے لشکر کا انتظار کریں۔ یہ جگہ جنگی نقطۂ نظر سے مدینہ سے بہت بہتر ہے۔ اس وادی میں ہماری کامیابی کے مواقع زیادہ ہیں۔

وادیِ بدر کا کچھ حصہ خاکی، کچھ سنگلاخ اور کچھ ریت و موٹے کنکروں پر مشتمل ہے۔ وادی مذکور دو پہاڑوں کے مابین واقع ہے۔ شرقی پہاڑ کو العدوۃ القصویٰ کہتے ہیں اور غربی پہاڑ کو العدوۃ الدنیا۔ ایک اور پہاڑی سلسلہ اَسفل نامی وادی کے جنوب میں واقع ہے۔ ان دنوں وہاں چند چشمے تھے اور کاروان وہاں قیام کیا کرتے تھے تاکہ چشموں کے پانی سے فائدہ اُٹھاسکیں۔ پیغمبر ﷺ نے جب جنگ کا ارادہ کرلیا تو اپنے لشکر کی جگہ تبدیل کردی۔

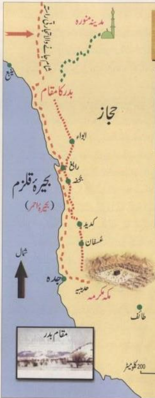
اس وقت تک مسلمان وادیِ بدر کے شمالی مدخل پر قافلہ کے انتظار میں تھے۔ جب معلوم

ہوا کہ قافلہ نہیں آرہا تو پیغمبر ﷺ نے کہا اب جگہ تبدیل کرنی ہوگی۔ یہاں سے کوہ اَسفل کے دامن میں منتقل ہوجائیں، تاکہ منبع آب ہمارے کنٹرول میں رہے اور ہم دشمن کی سپاہ کو اس سے فائدہ نہیں اُٹھانے دیں گے۔ محمد ﷺ کے حکم پر بروقت عمل ہوا۔ مسلمان وادی کے شمال سے جنوب میں منتقل ہوگئے اور کوہ اَسفل کے دامن میں پانی کے چشموں پر قبضہ کرلیا۔

اس جگہ محمد ﷺ نے مسلمانوں سے ایک بار پھر خطاب کیا اور فرمایا: آج تک عرب، جنگوں میں انفرادی طور پر لڑا کرتے تھے اور تن بہ تن لڑائی کو ترجیح دیتے تھے۔ ہر دشمن کوشش کرتا تھا کہ تنہا شجاعت کا مظاہرہ کرے، تاکہ اس کی دھاک بیٹھ جائے اور دوسرے اسے رستم مان لیں۔ لیکن ہماری یہ جنگ خدا کی راہ میں ہے نہ کہ اپنی ذات کے لیے۔ خداوند ہماری دلیری اور جانفشانی کو دیکھ رہا ہوگا۔ اگر خدا کی راہ میں جان فدا ہوئی تو اس کے صلے میں ہمیں خدا جنت میں لے جائے گا۔ دوسرے ہماری تعداد مکّہ کی سپاہ کا ایک تہائی ہے۔ اگر انفرادی جنگ اپنائیں گے تو نابود کردیے جائیں گے اور اگر ہم مل کر مصروفِ پیکار ہوں گے تو ہمیں فتح کی امید ہوگی۔

اس کے بعد محمد ﷺ نے جنگی تکنیک مسلمانوں کو سمجھائی جو کہ اس تاریخ سے تقریباً ایک ہزار سال قبل اسکندر اعظم کے باپ فلپ نے آغاز کی اور اسے یونانی زبان میں فالنز کہتے ہیں۔ فالنز یعنی صف بندی عبارت ہے، اس ترتیب سے جس میں سپاہی اس طرح شانہ بشانہ کھڑے ہوتے ہیں کہ ایک کی جگہ خالی ہونے پر دوسرا اُس کی جگہ لے سکتا ہے۔ اس صف بندی کو خم دے کر حالات کے مطلب مختلف اشکال یعنی مثلث، مربع یا دائرہ بنالیا جاتا ہے۔ اس مثلث، مربع یا دائرے کے تمام سپاہیوں کا رُخ دشمن کی طرف ہوتا ہے اور پشت مثلث، مربع یا دائرہ کے اندرونی طرف ہوتی ہے۔ نتیجتاً دشمن عقب سے حملہ نہیں کرپاتا تھا، اس لیے کہ جس طرف سے بھی دشمن حملہ کرتا مقابل سپاہیوں کے رُخ ہوتا۔

محمد ﷺ نے پہلی بار جزیرہ نمائے عرب کی تاریخ میں ان جنگی چالوں کو استعمال کیا اور جنگِ بدر میں ان سے فائدہ اُٹھایا۔ مسلمانوں کی دلیری و شجاعت اپنی جگہ مگر جنگِ بدر میں فتح کا سبب یہ چالیں بھی تھیں کہ عرب ان سے قطعی ناآشنا تھے۔



پیغمبرِ اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو جنگی تکنیک سمجھانے کے بعد خطاب کیا۔ فرمایا: "تمھارا فرار قطعی بے سود ہوگا، نیز اگر فرار کرو گے تو کوئی راہ نہ پاؤ گے، بجز اس کے کہ مدینہ جاؤ۔ وہاں یہودی اور منافقین تمھیں پکڑ لیں گے اور قریش کے حوالے کر دیں گے۔ پس تم قتل کر دیے جاؤ گے۔

پھر محمد ﷺ نے سورۃ انفال کی پندرھویں اور سولھویں آیات بہ صدائے بلند تلاوت فرمائیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ "اے مومنو! جب تم دشمن سے دوبدو مقابل ہو جاؤ تو نہ بھاگنا اور نہ دشمن کو پیٹھ دکھانا۔ دشمن کی طرف پیٹھ موڑنا ایک بہت بڑا گناہ ہے مگر یہ کہ دشمن کو غافل کرنے کے لیے ایسا کیا جائے اور تم اس پر دوبارہ حملہ کرنا چاہتے ہو یا اپنے ہی لشکر کا ایک دستہ دوسرے کی مدد کو جانا چاہتا ہو۔ اس حالت میں دشمن کی طرف پیٹھ موڑنا جائز ہے۔ غیر ازیں صورت فرار کرنے والے مسلمانوں پر خدا کا غضب ہوگا۔ ان کی جگہ جہنم ہوگی اور وہ بہت بری جگہ ہے"۔

صف بندی کی شکل (ترتیب) جو اس دن لشکرِ اسلامی نے اختیار کی وہ مثلثی تھی اور تین پرچم اس کی تینوں قطاروں میں دکھائی دیتے تھے۔ محمد ﷺ نے اس دن خود کو جزیرہ نمائے عرب کا جنگی نابغہ ثابت کیا۔ تین دستے بہ شکلِ مثلث ترتیب دیے کہ ہر ایک دوسرے کا پشتیبان تھا اور دشمن کسی سمت سے بھی حملہ کرتا، کسی ایک دستہ سے ٹکراتا۔

ترتیب دیے گئے ہر دستے میں ایک علمبردار بھی دکھائی دیتا تھا۔

مثلث کی صف جو دشمن کے سامنے تھی اس کے علمبردار علیؓ تھے۔ ان کا پرچم سفید تھا۔ مثلث کی دوسری قطار کا پرچم مصعبؓ بن عمیر کو دیا گیا کہ یہ مہاجر تھے۔ تیسری قطار کے علمبردار ایک انصاری تھے۔

پیغمبر ﷺ جب لشکر کی ترتیب اور دوسری ہدایات سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

اے مسلمانو! اگر تم فاتح ہوئے یا قتل ہوئے دونوں حالتوں میں تمھارے لیے بہشت ہے۔ کوئی انسان جو جنت میں رہتا ہے قطعاً آمادہ نہیں ہوتا کہ اس جہان میں واپس

آئے اور وہ جو اس جہان میں درجۂ شہادت پاتے ہیں وہ آرزو کرتے ہیں کہ دوبارہ اس جہان میں آئیں اور دوسری مرتبہ خدا کی راہ میں شہادت کا درجہ پائیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ خدا انھیں بہشت میں اس کے صلے میں کیا کیا دے گا۔

جب آفتاب غروب کے نزدیک تھا، مکّہ کا لشکر ظاہر ہوا۔ تاریکی چھا رہی تھی، اس لیے دونوں اطراف جنگ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

رات کے ہنگامے میں محمد ﷺ نے اپنے لشکر کی جگہ کو تبدیل کیا، اس طرح کہ دوسرے دن آفتاب ان کی آنکھوں کے سامنے نہ چمکے اور ان کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں۔ یہ تمام اقدامات ثابت کرتے ہیں کہ محمد ﷺ فنِ جنگ پر پورا عبور رکھتے تھے۔

اُس رات محمد ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا: نگہبانوں کے علاوہ ہر شخص سو جائے تاکہ صبح دم جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ تمھارے قلوب کو اطمینان بخشے تاکہ تم سو سکو۔ اسی مناسبت سے خداوند نے سورۂ انفال کی گیارھویں آیت میں فرمایا:

﴿إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ﴾ "یاد کرو جب دشمن کے خوف سے تمھاری نیندیں اڑ چکی تھیں، ہم نے اپنی رحمت سے تمھیں آسودہ خاطر کیا اور تم سو گئے اور خداوند نے آسمان سے تم پر پانی برسایا (بارش) تاکہ تمھیں اس سے پاک کر دے اور دور کر دے تم سے نجاست شیطان کی، اور مضبوط کر دے تمھارے دلوں کو، اور تمھارے قدم جما دے.........."

اُس رات مسلمان اس آسودگی سے سوئے کہ انھیں دشمن کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا حتیٰ کہ بارش سے بھی وہ بیدار نہ ہوئے۔ خداوند نے جیسا کہ قرآن میں فرمایا ہے، اس رات مسلمانوں پر بارش برسائی تاکہ انھیں پاک کر دے اور دوسرے دن (بجری اور ریت کی وجہ سے) مجاہدین اسلام کے پاؤں لغزش نہ کریں۔

انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح محمد ﷺ اور ان کی سپاہ نے جو مکّہ کے لشکر کا تیسرا حصہ تھی جرأت کی کہ وادی بدر میں جنگ لڑیں۔

مکّہ کے جنگجو ڈرپوک نہیں تھے کہ ہم یہ سوچیں کہ محمد ﷺ نے خیال کیا ہوگا ادھر مسلمانوں نے حملہ کیا ادھر وہ بھاگے۔ وہ بدوی عرب تھے اور بڑے شجاع تھے۔ تلوار کے دھنی تھے۔ میدانِ کارزار میں موت کے خوف سے دور، مرنے اور مارنے کو تیار۔

وہ دور ایسا نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی فوج اپنی آتشیں قوت سے ایک بڑی فوج کو شکست دے سکے۔ طرفین کا اسلحہ ایک جیسا تھا۔ فقط بعض جسمانی لحاظ سے کچھ دوسروں پر فوق ہوں گے۔ لہٰذا تعداد بہت مؤثر تھی۔ تمام جنگوں میں کماندار کی کوشش ہوتی ہے کہ دشمن کی تعداد کے متعلق معلومات حاصل کر سکے۔ اگر محمد ﷺ جنگ بدر میں ساز و سامان ہی میں برتر ہوتے تو یہ تصور کیا جاتا کہ سامان کی برتری کی وجہ سے قریش سے جنگ کی۔

لیکن اس جنگ میں قریش ۷۰۰ اونٹ اور ۱۰۰ گھوڑے میدانِ جنگ میں لائے تھے جب کہ مقابلے میں محمد ﷺ کے پاس صرف ۷۰ اونٹ اور دو گھوڑے تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ محمد ﷺ نے جنگِ بدر میں خداوند پر تکیہ کیا اور وہ جانتے تھے کہ خداوند ان کی مدد فرمائیں گے۔ خداوند کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے کہ بت پرستوں کا لشکر مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو شکست دے۔

ہر مسلمان جو جنگِ بدر میں شامل ہوا، بندۂ مومن تھا اور خدا مسلمانوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ اس کے علاوہ وہ جانتے تھے کہ قتل ہوئے تو جنت مقام ہوگا۔ قوتِ ایمانی اپنی جگہ مسلم لیکن جنگ بدر میں محمد ﷺ کی جنگی چالوں نے بھی جو کہ عرب میں منفرد تھیں مسلمانوں کو فتح دلائی۔

۱۷ رمضان بروز جمعہ یا ۱۸ رمضان بروز ہفتہ محمد ﷺ جانتے تھے کہ اگر شکست ہوگئی تو مسلمان اور اسلام دونوں نابود ہو جائیں گے۔

اسلام ابھی اس قدر طاقت ور نہیں تھا کہ ایک شکستِ عظیم کا متحمل ہو سکتا اور اگر اس دن محمد ﷺ اور مسلمان شکست کھا جاتے تو اسلام کا وجود ختم ہو جاتا۔

عربستان میں رسم تھی کہ لشکر کے رؤسا جنگ کے موقع پر میدانِ جنگ سے باہر ایک نقطہ سے جنگ کی کمان کرتے تھے اور وہ نقطہ میدانِ جنگ کے عقب میں منتخب کیا جاتا تھا۔

محمد ﷺ سپہ سالار جنگِ بدر ایک کم ارتفاع ٹیلے سے کمان کر رہے تھے اور وہاں سے میدانِ جنگ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اور احکام صادر فرماتے تھے۔ سپہ سالار کے اس ہیڈ کوارٹر کو عرب عریش کہتے ہیں۔

جنگ کے آغاز میں جو طلوعِ آفتاب کے فوری بعد شروع ہوئی، فریقین نے دیرینہ سنت کے مطابق اشعار پڑھنے شروع کیے۔ موضوع دشمن کی تحقیر اور دوستوں کی شان بڑھانا تھا۔ اشعار خواندگی کے بعد قریش کے لشکر سے تین پہلوان جنگجو آگے بڑھے یہاں تک کہ دونوں لشکروں کے وسط میں پہنچ گئے:

ایک کا نام عتبہ تھا جو ابوسفیانؓ کا سسر تھا۔

دوسرا شیبہ تھا جو ابوسفیانؓ کی بیوی کا چچا تھا۔

تیسرا ولید جو ابوسفیانؓ کی بیوی کا بھائی تھا۔

یہ تینوں افراد دونوں لشکروں کے وسط میں پہنچے تو آواز دی "ھل من مبارز" یعنی کون ہے جو ہم سے مقابلہ کرے گا؟

اسلامی لشکر سے تین افراد آگے بڑھے اور جواب دیا کہ ہم تم سے نبرد آزما ہوں گے۔ قریش کے تینوں جنگجوؤں نے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

اسلامی لشکر کے تینوں مجاہدین نے جواب دیا: ہم اہل مدینہ ہیں۔

قریش کے تینوں افراد نے کہا: ہم تمھیں نہیں پہچانتے لہٰذا تم سے نہیں لڑیں گے۔ ہم مکّہ کے اشراف میں سے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں مکّہ کے اشراف ہی ہونے چاہئیں۔

عمرؓ بن الخطاب نے اپنی کڑک دار آواز میں کہا: مسلمان سب مساوی ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں ہے۔

قریش کے تینوں افراد نے کہا: ہم صرف اہلِ مکّہ کو دعوتِ مبارزت دے رہے ہیں اور ہم انھیں پہچانتے ہیں۔ محمد ﷺ نے اونچی آواز میں علیؓ ابنِ ابی طالب علمبردار صفِ اوّل کو ہدایت کی کہ اے علیؓ! تم ولید کے مقابلے میں جاؤ۔

بعدازاں حمزہؓ اور عبیدہؓ بن حارث کو ہدایت کی کہ وہ دونوں دوسرے دونوں کے مقابلے پر جائیں۔

تینوں مسلمان جب تینوں قریشیوں کے مقابل ہوئے تو رجزیہ اشعار پڑھے۔ رجزیہ اشعار اپنے تعارف اور جنگ و کشتار سے عبارت تھے۔

علیؓ پکارے: میں علی بن ابوطالب بن عبدالمطلب ہوں اور پھر امری القیس الحجری الکندی کے اشعار پڑھے کہ وہ سات بزرگ ترین شاعروں میں تھا اور عرب اس کو دورِ جاہلیت کا بزرگ ترین شاعر مانتے تھے۔

ولید اپنے تعارف کے بعد حارث بن حلزہ یشکری کے اشعار پڑھنے لگا۔ یہ شاعر بھی سات بزرگ شاعروں میں سے ایک تھا۔ بعدازیں طرفین ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔

اعراب کی جنگِ شمشیر، اہل یورپ سے مختلف تھی۔

یورپی جب شمشیر سے لڑتے تو نوکِ شمشیر سے استفادہ کرتے۔ یورپ کی شمشیر زنی کے اُصول یہ تھے کہ دشمن کو نوکِ شمشیر سے گھائل کیا جائے۔

لیکن عرب دمِ شمشیر سے استفادہ کرتے تھے کہ نوکِ شمشیر جنگ میں زیادہ مؤثر نہیں تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عربوں نے شمشیر بازی کے مخصوص قواعد وضع نہیں کیے تھے، حالانکہ عرب دمِ شمشیر سے مخصوص قواعد کے تحت استفادہ کرتے تھے اور وہ بھی یونانیوں، یورپیوں اور دوسری اقوام کی طرح جنگ میں شمشیر سے استفادہ کے لیے مدتوں مشق کیا کرتے تھے اور فنونِ شمشیر بازی کو باقاعدہ سیکھا کرتے تھے۔ ڈھال جنگ میں انفرادی دفاع کے لیے بہت مؤثر تھی، اس لیے کہ شمشیر کے مقابلے میں یہی ایک بہترین دفاع کا وسیلہ تھی۔

علیؓ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچازاد خوب تلوار چلا رہے تھے۔ ان کا مقابل ولید بھی چابک دست تھا۔ پھر بھی ان کی جنگ نے چند منٹ سے زیادہ طول نہ کھینچا۔ ولید کو علیؓ کی شمشیر کی ایک مہلک ضرب لگی اور اس کی گردن کٹ گئی۔ وہ زمین پر گر گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مر چکا تھا۔

حمزہؓ نے بھی اپنے حریف کو قتل کر دیا۔ تیسرے مسلمان مجاہد عبیدہ بن حارثؓ مقابلہ میں زخمی ہوئے مگر ابوسفیانؓ کے چچا سسر کو قتل کر دیا۔ اس ترتیب سے تینوں مجاہدین اسلام فاتح

ہوئے اور مسلمانوں نے اس کو نیک فال سمجھا اور ان کو روحانی تقویت ملی۔

جب قریش نے دیکھا کہ ان کے تین نامور جنگجو قتل ہو گئے ہیں تو اپنے نیزوں کو آسمان کی طرف اچھالا اور پھر جھپٹ کر مسلمانوں پر ایک شدید حملہ کر دیا (یہ علامت تھی تن بہ تن جنگ کی اور اس کے ساتھ وہ اونچی آواز میں ہاہلہ بھی کرتے تھے)۔

جو لوگ حملہ آور ہوئے تھے وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو ان میں سے کسی ایک کے بھائی، بیٹا، چچا یا بھتیجا ہیں لیکن حملہ کر دیا گیا۔ اس دن تک عرب میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ بھائی بھائی پر، باپ بیٹے پر اور چچا بھتیجے پر حملہ آور ہو۔ وہ لوگ قریبی رشتہ دار سمجھے جاتے تھے جو ایک قبیلہ سے ہوتے تھے اور عرب میں قبیلہ کے ارکان آپس میں جنگ نہیں کیا کرتے تھے۔

محمد ﷺ نے جب دیکھا کہ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی ہے تو آپ ﷺ کمان والی پوسٹ سے نیچے تشریف لائے۔ اپنی سپاہ کی ترتیب کے درمیان چلے گئے اور آیاتِ قرآنی کی تلاوت شروع کر دی۔ جو آیات آپ ﷺ تلاوت فرما رہے تھے، وہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے خدا کی طرف سے انعامات سے متعلق تھیں۔ ان آیات میں کہا گیا تھا کہ ایک مسلمان خدا کی راہ میں خواہ مارے یا مر جائے، اس کی جگہ بہشت میں ہے۔

آپ ﷺ نے جب تلاوت ختم کی تو بلند آواز سے فریاد کی: ''میرے اجداد! تم کہاں ہو؟ کاش! آج تم یہاں ہوتے، خدا کی راہ میں تلوار چلاتے اور قتل ہوتے تو خداوند اس میدانِ قتال سے تمھیں سیدھا جنت میں لے جاتا۔

تلاوتِ قرآن کے سننے سے مسلمانوں کے جوش و جذبے کی یہ حالت ہوئی کہ ان میں سے ایک عمیرؓ نے بلند آواز سے کہا: میرے اور بہشت میں چند قدم کا فاصلہ ہی تو ہے۔ وہ صف سے نکل کر مکہ کی سپاہ پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن اسی لمحے اہلِ مکہ نے گھیرے میں لے کر انھیں شہید کر دیا۔

محمد ﷺ بلند آواز سے پکارے! ''میری ہدایات کو مت بھولنا اور بہشت کی تمنا میں صف سے خارج مت ہونا۔ اگر تم صف سے خارج ہوئے تو بت پرست تم پر غالب آ جائیں گے۔

طائفہ قریش کے افراد اپنی روش کے مطابق انفرادی لڑائی لڑ رہے تھے اور ہر شخص اس فکر میں تھا کہ وہ فاتح ہو اور اس کا رابطہ اپنے رفقا سے نہیں تھا یعنی وہ منتشر ہو کر لڑ رہے تھے۔

لیکن محمد ﷺ نے ایک رات اور ایک دن میں مسلمانوں کو وادی بدر میں قیام کے دوران سمجھا دیا تھا کہ افتخار حاصل کرنے کے لیے انفرادی جنگ نہ لڑنا۔ تم خدا کے لیے تلوار چلاؤ گے تمھیں خودنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جنگی فرائض احسن طریقہ پر بجالاے تو بھی بہشت میں جاؤ گے۔ یہی وجہ تھی کہ شہادت کے شوق میں مسلمانوں نے صف بندی کو ختم نہ ہونے دیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، مسلمانوں نے اپنی صف بندی ایک مثلث کی شکل میں کی تھی جس کی وجہ سے قریشی سپاہ ان پر عقب سے حملہ آور نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ صف ہائے ثلاثہ اس طرح ایک مضبوط لشکر کی صورت میں تھیں کہ قریش مسلمانوں کا عقب ہر طرف سے محفوظ پاتے تھے۔ صف ہائے ثلاثہ مخصوص علامت رکھتی تھیں تا کہ مسلمان جنگ کی ہماہمی میں اپنوں ہی کو دشمن سمجھ کر قتل نہ کر دیں۔ کہتے ہیں کہ ایک صف نے زرد سرپوش اور دوسری صف نے سبز سرپوش باندھے ہوئے تھے اور تیسری صف نے سروں پر پَر لگائے ہوئے تھے۔ حمزہؓ نے سر پر شترمرغ کے کچھ پر لگائے ہوئے تھے جو ہوا کی وجہ سے ہلتے تھے۔

روایت ہے کہ جب کافروں کا دباؤ بڑھ گیا تو پیغمبرِ اسلام ﷺ نے علیؓ سے کہا تھوڑی خاک اُٹھا کر مجھے دو۔ علیؓ جھکے اور تھوڑی خاک محمد ﷺ کو اُٹھا کر دے دی۔ محمد ﷺ نے وہ مٹھی بھر خاک سپاہ قریش کی طرف پھینکی اور کہا: ''چلے جاؤ بے غیرتو!'' اس کے بعد مسلمانوں نے جوابی حملہ کیا۔ اس طرح تینوں صفیں بغیر کسی انتشار اور صف شکنی کے حرکت میں آگئیں۔ یہ ایڈوانس (پیشرفت) ایسے تھا جیسے تین قلعے حرکت میں تھے۔ قریش کی سپاہ پسپا ہونے لگی۔ محمد ﷺ کو اطلاع مل چکی تھی کہ ان کا سود خور چچا (عباس) قریش کی فوج میں شامل ہے اور مسلمان مجاہدوں سے کہہ رہا تھا: مجھے زندہ گرفتار کرنا۔ عباس جو قریشی سپاہ کے ساتھ میدان بدر میں پہنچا تھا، تین وجوہ کی بنا پر جنگ سے گریز کر رہا تھا:

اوّل یہ تھی کہ وہ سود خوار ہونے کے باعث جنگ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔

دوم یہ کہ وہ اپنے بھتیجے سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

سوم یہ کہ اس کی بیوی مسلمان تھی اور اس نے کہا تھا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف مت لڑنا۔

ایک مجاہد اپنی صف میں ایڈوانس کر رہا تھا، اس نے عباس کو دیکھا اور پہچان لیا۔ اس کے باوجود کہ وہ مجاہد چھوٹے سے قد کا تھا اور عباس بہت موٹا تھا، اس نے محمد ﷺ کے چچا کو بغل میں لے لیا اور محمد ﷺ کے سامنے لے گیا اور خود فوری طور پر اپنی جگہ پر واپس آگیا تا کہ لڑائی جاری رکھ سکے۔

ابوجہل قریش کا کمان دار چند محافظوں کے حصار میں تھا۔ لیکن مسلمان محافظوں کے حلقے کو توڑ کر ابوجہل تک پہنچ گئے۔

ایک مجاہد معاذ بن عمروؓ نے ابوجہل کی ٹانگوں پر وار کیا جس سے ابوجہل سخت زخمی ہو گیا اور بیٹھ گیا۔ ابوجہل کا لڑکا عکرمہ والد کے دفاع میں معاذ بن عمرو پر حملہ آور ہوا اور اس طرح وار کیا کہ معاذ بن عمرو کا بازو کندھے سے کٹ کر کھال سے لٹک گیا۔ درد کا معمولی سا اثر بھی معاذؓ کے چہرے پر ظاہر نہ ہوا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دائیں بازو کو کھینچ کر علیحدہ کر کے پھینک دیا اور کہا: ''خدا کی راہ میں''۔

وہ اسی طرح جھکا اور تلوار کہ زمین پر گر گئی تھی، اُٹھالی اور لڑائی جاری رکھی۔ چند لمحے بعد ایک مجاہد اسلام نے ابوجہل کو قتل کر دیا۔ ابوجہل کے قتل کے بعد قریش کا لشکر بددل ہو گیا۔ ان کے دل میں وحشت پیدا ہونے لگی کہ ہم اس کثرت سے ہونے کے باوجود ابھی تک مسلمانوں کی ایک صف کو درہم برہم نہیں کر سکے، لہٰذا پسپائی اختیار کی۔ چونکہ یہ پسپائی نئے حملے کے لیے نہ تھی، اس لیے کہنا چاہیے کہ راہ فرار اختیار کر گئے اور میدانِ جنگ میں ستر لاشیں چھوڑ گئے۔

ابوجہل کے علاوہ قریش کے کئی سردار جن میں ابوسفیانؓ کا سسر اور اس کی بیوی کا بھائی بھی شامل تھے قتل ہو گئے تھے۔ جنگ بدر میں بلحاظ تعداد مسلمان ایک تہائی تھے لیکن ان کا نقصان صرف چودہ مجاہدوں کی شہادت تھی۔

جنگِ بدر جس میں مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی اور مسلمانوں کے لیے روحانی تقویت کا باعث ہوئی، اس جنگ میں ایک چھوٹے سے لشکر نے اپنی قوت ایمانی اور جنگی چالوں کے باعث اپنے سے تین گنا بڑے لشکر کو شکست فاش دی تھی۔

ایک مسلمان جنگ کے خاتمہ اور قریش کے فرار کے بعد میدانِ جنگ میں گیا کہ کشتگان کو ایک نظر سے دیکھ سکے۔ اس مجاہد کا نام ابوحذیفہؓ تھا۔ چونکہ وہ مہاجر تھے اور مقتول سب مکہ سے متعلق تھے، اس لیے ان کی کوشش تھی کہ دیکھیں کون کون قتل ہوا ہے۔

ناگہاں ایک مقتول کی لاش نے ان کی توجہ مبذول کی۔ وہ جھکے اور لاش کو غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر غم کے آثار ہویدا ہوگئے۔ چند لمحے بعد محمد ﷺ اس طرف سے گزرے۔ ابوحذیفہؓ کو دیکھا کہ غمگین کھڑا ہے۔ فرمایا: غمزدہ نہ ہو، آج خداوند نے مسلمانوں کو فاتح کیا ہے۔ ابوحذیفہؓ نے انگلی سے مقابل پڑی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میں اس کی لاش کو دیکھ کر غمگین ہوں۔ یہ میرے باپ عتبہ بن ربیعہ کی لاش ہے۔

محمد ﷺ کو جب معلوم ہوا کہ ابوحذیفہؓ اپنے باپ کی نعش پر کھڑا ہے تو اسے تسلی دی۔ ابوحذیفہؓ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں اس وجہ سے غمگین ہوں کہ میرا باپ کفر کی حالت میں مرگیا۔ مجھے امید تھی کہ ایک دن وہ متنبہ ہوکر مسلمان ہوجائے گا۔

جنگِ بدر کی تفصیل کتاب ایام العرب میں لکھی ہوئی ہے اور جنگِ بدر مثل گزشتہ آج بھی تاریخ اسلام کا ایک بہت بڑا واقعہ شمار ہوتی ہے۔ جنگِ بدر میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے فتح حاصل کی اور فتح مندی کی لذت سے آشنا ہوئے۔ انھیں مزید یقین حاصل ہوا کہ قوت ایمانی اور صحیح جنگی چالوں پر عمل کرکے ایک چھوٹا سا لشکر ایک بڑے لشکر پر غلبہ حاصل کرسکتا ہے۔

مسلمانوں نے بقایا دن اپنے شہدا کو دفن کرنے میں صرف کیا۔ جنگ کے آغاز سے پہلے محمد ﷺ نے ہدایت دی تھی کہ دشمن کی لاشوں کو مسخ نہ کیا جائے اور ان کے اعضا اپنے پاس یادگار کے طور پر رکھنے کے لیے قطع نہ کیے جائیں۔ جس طرح زندوں پر ان کی زندگی میں احسان کرنا چاہیے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی ان پر احسان کرو۔

تاریخ میں پہلی بار جنگی قیدیوں پر رحم کیا گیا

شہدا کو سپرد خاک کرنے کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جنگی قیدیوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں نے ستر افراد کو قیدی بنایا تھا۔

جزیرہ نمائے عرب میں ایک قیدی اس جنگجو کو کہتے ہیں جو میدانِ جنگ میں گرفتار ہوا ہو۔ وہ شخص جو اسے (قیدی کو) میدانِ جنگ میں گرفتار کرتا تھا، اس کا مالک مطلق شمار ہوتا تھا۔ اس کو اختیار ہوتا خواہ اسے قتل کردے، خواہ غلام فروشوں کے بازار لے جاکر فروخت کردے یا اپنا غلام بنالے۔

جب ایک قیدی کو قتل کیا جانا ہوتا تھا تو قیدی کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے بٹھا دیتے اور اسی ہاتھ باندھنے والی رسی کے ساتھ ایک تیر اس طرح رکھ کر باندھا جاتا تھا کہ قیدی مطلقاً کوئی حرکت نہ کرسکے اور فرار کی کوشش نہ کرے۔ بعدازیں عقب سے تلوار کا وار کرکے اس کی گردن تن سے جدا کردی جاتی۔ خون ایک فوارہ کی طرح جاری ہوجاتا تھا۔

شہدا کو دفن کرنے کے بعد محمد ﷺ نے مسلمانوں سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا کہ ان قیدیوں کا کیا کیا جائے؟

عمرؓ بن الخطاب نے بلند آواز سے کہا: ”گردن اُڑا دی جائے۔“

ابوعبیدہؓ نے کہا: ”زندہ جلا دیے جائیں۔“

ابوبکرؓ نے کہا: ”قیدیوں کو اجازت دی جائے کہ مکہ میں اپنے عزیزوں سے رابطہ پیدا کرکے ان سے کہیں کہ ہمیں فدیہ دے کر آزاد کرالیں۔“

آپ ﷺ نے ابوبکرؓ کی رائے قبول فرمائی اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی طرف سے ایک آئین برائے ”اسیران جنگی“ وضع ہوا جو کہ ہمارے خیال میں یہ پہلا آئین نامہ ہے جو دنیا میں جنگی اسیروں کے لیے وضع ہوا۔ اس میں توضیح کی گئی کہ جنگی اسیروں سے بہتر سلوک کیا جائے۔

جنگی اسیروں کے لیے یہ آئین وضع ہونے سے پہلے ہر وہ شخص جس نے میدانِ جنگ میں کسی کو اسیر بنایا ہوا سے قتل کرنے یا زندہ جلا دینے کا اختیار رکھتا تھا، عرب میں ایک جنگی قیدی گرفتار کرنے والے کی مِلک مطلق ہوتا تھا۔

محمد ﷺ نے جنگی اسیروں کے لیے جو آئین مرتب کیا، اس میں مقرر فرمایا کہ اسیری آزادی کے لیے فدیہ کی رقم اس کی مالی حالت کے تناسب سے وصول کی جائے گی۔ چونکہ اکثر اسیر قریش کے ثروت مند خاندانوں سے متعلق ہیں، ہر اسیر کی آزادی کے لیے چار ہزار درہم فدیہ وصول کیا جائے گا۔ جو خاندان یہ رقم ادا نہ کرسکتا ہو وہ مقررہ تعداد میں نیزہ وتلوار مہیا کر کے اپنے اسیر کو رہا کروا سکتا ہے اور وہ قیدی جو تعلیم یافتہ ہیں (یعنی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں) ان کو نقد یا اسلحہ کی صورت میں فدیہ معاف کیا جاتا ہے۔ عوضانہ میں وہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر آزاد ہو سکتے ہیں۔

اس آئین کے مطابق اسیر جتنی مدت مسلمانوں کی اسیری میں رہیں گے، ان کو مناسب غذا و لباس مہیا کیا جائے گا اور کوئی شخص ان کو تکلیف نہیں پہنچائے گا اس لیے کہ جنگی قیدیوں کو تکلیف پہنچانا، اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل نہیں ہے۔ اس آئین میں جنگی اسیروں سے حسن سلوک کی اس قدر تاکید کی گئی تھی کہ بعض مجاہدین جنھوں نے قیدی بنائے تھے اپنی غذا و لباس قیدیوں کو دے دیا کرتے تھے۔

جیسے ہی مسلمانوں کی فتح کی خبر مکّہ پہنچی، اہل مکّہ نے فیصلہ کیا کہ ایک دوسری جنگ میں مسلمانوں سے انتقام لیا جائے گا۔ جو لوگ محمد ﷺ اور مسلمانوں کے قتل پر کمربستہ تھے ان میں سے ایک ابوسفیان تھا کہ جنگ بدر میں اس کا ایک بیٹا قتل اور دوسرا اسیر ہوا تھا۔ اب طوعاً وکرہاً فدیہ ادا کر کے اسے آزاد کرانے پر مجبور تھا۔ اس کے علاوہ اس کا سسر اور سسر کا بیٹا بھی میدان جنگ میں کام آئے تھے۔

ابوسفیان نے قسم کھائی کہ جب تک محمد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں سے انتقام نہیں لے لیتا اپنی بیوی سے دور رہے گا۔ ابوسفیان کی بیوی نے قسم کھائی کہ اگر اس کی دسترس باپ، بیٹے

اور بھائی کے قاتلوں تک ہوئی تو وہ ان کا کلیجہ نکال کر کھائے گی۔ مزید یہ کہ اگر قاتلین زیادہ ہوئے تو ان کی زبانیں، کان اور ناکیں کاٹ کر گلے کا ہار بنائے گی۔ اور جب اسلام نابود ہو جائے گا، وہ مکّہ کے گلی کوچوں میں اس ہار کو پہن کر رقص کرے گی۔

اس حال میں اہل مکّہ کی زبانیں شعلے اگل رہی تھیں۔ مدینہ سے خبر آئی کہ اہلِ مکّہ اپنے اسیروں کو فدیہ آزادی چہار ہزار درہم فی قیدی ادا کر کے آزاد کروا سکتے ہیں، لہٰذا اہل مکّہ ستر قیدیوں کی آزادی کے لیے دو لاکھ اسی ہزار درہم کی ادائیگی کریں۔

قریش کے بزرگوں نے اعلان کیا کہ ہم فدیہ ادا کر کے اپنے قیدیوں کو آزاد نہیں کرائیں گے، اس لیے کہ مسلمان جو بے بضاعت ہیں اس خطیر رقم سے دولت مند ہو جائیں گے۔ ہم مسلمانوں کے ہاتھ اتنی رقم دے کر ان فقرا کو غنی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن وہ خاندان جن کے عزیز مسلمانوں کے اسیر تھے، جیسے ابوسفیان، انھوں نے بزرگانِ قریش سے اپیل کی اور خواستگار ہوئے کہ انھیں اجازت دی جائے کہ وہ فدیہ ادا کر کے اپنے عزیزوں کو آزاد کروائیں۔ بزرگانِ قریش نے اس اپیل پر اجازت دے دی۔

ان قیدیوں میں ایک حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا ابوالعاص تھا اور وہ محمد ﷺ کی بیٹی زینبؓ کا شوہر بھی تھا۔ محمد ﷺ کی بیٹی زینبؓ نے اپنے شوہر کی آزادی کے لیے فدیہ کی رقم تین ہزار درہم نقد فراہم کیے اور بقایا ایک ہزار درہم کے عوض دو جواہر پروئے ہوئے کہ ان کی قیمت ایک ہزار درہم کے مساوی تھی، تین ہزار درہم نقد کے ساتھ بھجوائے اور کہلوایا کہ ابوالعاص میرے شوہر کو آزاد کیا جائے۔ جس وقت نقدی اور جواہرات لے کر محمد ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ ان جواہرات میں سے ایک حضرت خدیجہؓ کے ہار میں پرویا ہوا تھا۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد یہ ہار محمد ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت زینبؓ کو دے دیا تھا۔ اب جو نگاہ اس ہار پر پڑی تو آپ ﷺ آب دیدہ ہو گئے۔ اردگرد موجود مسلمانوں نے جب دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھیں پُرنم ہیں تو وہ بہت متاثر ہوئے اور بعض تو وجہ جانے بغیر ہی رو دیے۔

عمرؓ بن الخطاب کہ برجستہ گو اور ممتاز تھے، انھوں نے عرض کی: ”اے محمد ﷺ! آپ کیوں آب دیدہ ہیں؟ جب آپ ﷺ کی آنکھیں نم ہوتی ہیں تو ہمارے دل غمگین ہو جاتے ہیں“۔

محمد ﷺ نے فرمایا: ”یہ گلوبند کہ تم دیکھ رہے ہو، میری اہلیہ خدیجہؓ کا تھا اور وفات کے بعد میں نے یہ اپنی بیٹی زینب کو دیا تھا۔ اب زینب نے اپنے شوہر کی آزادی کے لیے دوسرے ہار اور رقم کے ساتھ بھجوایا ہے۔ میری نگاہ جب اس گلوبند پر پڑی تو مجھے خدیجہؓ اور زینب یاد آ گئیں، اس لیے آنکھوں میں آنسو آ گئے“۔

عمرؓ بن الخطاب نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا: میری رائے یہ ہے کہ زینبؓ کے شوہر کو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا جائے اور وہ یہ تین ہزار درہم اور دونوں ہار بھی اپنے ساتھ مکّہ لیتا جائے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے فرمایا: میرے اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا تفاوت موجود نہیں کہ میری بیٹی کا شوہر بغیر ادائگی فدیہ آزاد ہو، مگر یہ کہ ابوالعاص اپنی آزادی کے عوض میری بیٹی کو طلاق دے دے یا میرے پاس آئے اور مسلمان ہو جائے۔

مسلمانوں نے اس نظریے کو صائب جانا، تاہم انھوں نے کہا کہ یہ بھی پسندیدہ نہیں کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بیٹی ایک مشرک کی بیوی رہے۔ لہٰذا اسی طرح ہوا کہ ابوالعاص نے آزاد ہو کر مکّہ پہنچنے پر حضرت زینبؓ کو مدینہ روانہ کر دیا۔ لیکن (جیسا کہ آئندہ صفحات میں ذکر آئے گا) اثنائے راہ حضرت زینبؓ کو ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔

ایک اور جنگی اسیر جو آپ ﷺ کے عزیزوں میں سے تھا، وہ آپ ﷺ کا چچا عباس تھا۔ محمد ﷺ بہت رحم دل اور مہربان طبیعت کے مالک تھے۔ اسی لیے قریش کو بہت دوست رکھتے تھے۔ چچا کو قید میں دیکھتے مگر آپ ﷺ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ اُصول اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

جنگ کے خاتمے پر، جب آپ ﷺ قیدیوں کی خبر گیری کے لیے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے چچا عباس نے کہا: ”میں تو خفیہ طور پر مسلمان ہو چکا ہوں۔ تم مجھے آزاد کر دو“۔

محمد ﷺ نے جواب دیا تھا: ”اسلام کوئی خفیہ دین نہیں ہے کہ مسلمان خود کو خفیہ رکھیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کو میدانِ جنگ میں مسلح دیکھا گیا ہے اور آپ مشرکین کی آخری صف میں موجود تھے، جو کہ اس پر دلیل ہے کہ آپ مسلمانوں اور خداوند سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ اب چونکہ آپ اسیر ہو، اپنی آزادی کے لیے فدیہ ادا کریں“۔

عباس، ایک صراف اور اس وقت تک سود خوار تھے۔ حتیٰ کہ اس موقع پر بھی فدیہ میں تخفیف کے لیے درخواستیں کرنے لگے۔ لیکن جب دیکھا کہ محمد ﷺ کسی صورت بھی فدیہ میں تخفیف پر آمادہ نہیں ہوتے تو کہنے لگے: میں تو آدمی بے بضاعت ہوں، اس قدر فدیہ ادا کرنے کی سکت مجھ میں نہیں۔ ماضی میں مَیں ایک امیر آدمی تھا، لیکن کچھ معاملات میں نقصان کے بعد میری جائیداد ختم ہو گئی ہے۔ چونکہ آپ کے ضابطے میں یہ بھی ہے کہ ایک بے بضاعت آدمی کچھ تلواریں اور نیزے دے کر آزاد ہو سکتا ہے، مَیں حاضر ہوں کہ کچھ تلواریں اور نیزے دے کر آزادی حاصل کروں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: ہم تحقیق کریں گے، اگر ثابت ہوا کہ آپ غریب ہیں تو فدیہ قبول کر کے آزاد کر دیا جائے گا“۔

جب عباس کو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ اس کی جائیداد کی تحقیق کے بارے میں مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں تو چہار ہزار درہم نقد فدیہ دے کر آزاد ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ عباس فدیہ ادا کرتے اور آزاد ہوتے، پہننے کے لیے لباس ان کے پاس نہیں تھا۔ لہٰذا عریاں رہے۔ ایک مسلمان جوان عبداللہ بن عبداللہ ابنِ ابی کو ان پر رحم آیا۔ انھیں اپنے باپ کا لباس دیا کہ پہن لیں۔ محمد ﷺ نے اس جوان کے حق میں دعائے خیر کی۔

اس واقعے کے دس سال بعد اس جوان کا باپ عبداللہ بن ابی (منافق) کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے دشمنوں میں سے تھا مر گیا تو اس کے لیے کفن نہیں تھا کہ اسے پہنا کر دفن کریں۔ محمد ﷺ نے اپنا پیرہن اُتار کر (اس لڑکے کی خدمت کے عوض) دے دیا جو اسے (عبداللہ بن ابی کو) پہنا کر دفن کیا گیا۔ اس وضاحت سے ہمارا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ محمد ﷺ احکامِ خداوندی

کے اجرا میں سخت گیر تھے، لیکن صلہ رحمی کو فراموش نہ کرتے تھے اور خویش سے محبت رکھتے تھے۔

اس کے بعد مسلمان اس قدر قوی ہو گئے کہ دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ بھی میدان کارزار میں گئے حالانکہ جنگِ بدر میں ان کے پاس دو گھوڑوں سے زیادہ نہیں تھے۔

جنگِ بدر جس قدر مسلمانوں میں معروف ہے بعد کی دوسری بڑی بڑی جنگیں اتنی معروف نہیں ہوئیں۔ گزشتہ ابواب میں سے ایک میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ جب محمد ﷺ نے اپنی رسالت کے کام کا آغاز کیا تو ابولہب نے اپنے بیٹے کو ترغیب دی کہ محمد ﷺ کی بیٹی رقیہؓ کو طلاق دے دو۔ ابولہب کے بیٹے سے طلاق کے بعد وہ عثمانؓ کے نکاح میں چلی گئی تھیں۔

عثمانؓ ایک امیر جوان تھے۔ رقیہؓ سے ازدواج کے بعد حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ حبشہ سے واپسی پر دوسرے مسلمانوں کی طرح رقیہؓ اور ان کے شوہر نے مدینہ میں سکونت اختیار کی، حتیٰ کہ جنگِ بدر کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس موقعہ پر رقیہؓ بیمار پڑ گئیں۔ محمد ﷺ اور مسلمان جنگ پر جا رہے تھے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے عثمانؓ کو رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے مدینہ ہی میں چھوڑ دیا۔

جنگِ بدر کے خاتمے کے بعد جب محمد ﷺ اور دوسرے مجاہدین مدینہ واپس آئے تو رقیہؓ کی بیماری شدید تر ہو گئی اور انھوں نے اس جہان کو خیر باد کہہ دیا۔ محمد ﷺ اپنی بیٹی کی وفات سے بہت متاثر ہوئے۔ آپ اپنے خانوادہ کے افراد سے بہت محبت کرتے تھے۔ ابھی رقیہؓ کو فوت ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ محمد ﷺ پر ایک صدمہ اور گزرا، وہ یہ کہ آپ ﷺ کی بیٹی زینبؓ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔ شرح واقعہ اس طرح ہے:

ابوالعاص جب آزاد ہو کر مکہ پہنچا تو حسبِ وعدہ زینبؓ کو مدینہ روانہ کر دیا۔ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ محمد ﷺ کا تمام خانوادہ بجز زینبؓ مدینہ لایا جا چکا تھا۔ زینبؓ کے شوہر نے اجازت نہیں دی تھی لہٰذا وہ مکہ میں رہ گئی تھیں۔

ابوالعاص نے جنگِ بدر میں شرکت کی۔ اسیر ہوا اور مشروط آزادی حاصل کر کے مکہ پہنچا تو اس نے زینبؓ کو اپنے بھائی کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا، تاکہ بغیر کسی خطرہ کے مدینہ

پہنچ جائے۔ جماعتِ قریش کو علم ہو گیا۔ لہٰذا ابھی کاروانِ زینبؓ مکہ سے باہر آیا ہی تھا کہ طائفہ قریش کے کچھ افراد نے ایک شخص (ہبر) کی راہنمائی میں کاروان پر حملہ کر دیا تاکہ زینبؓ کی روانگی کو روک سکیں۔

کاروان کے مرد دفاع کے لیے آگے بڑھے کہ وہ زینبؓ کو اٹھا مکہ واپس نہ لے جائیں۔ زینبؓ بوقتِ عزیمت حاملہ تھیں۔ اسی کشمکش میں وہ اونٹ سے گر گئیں۔ سقطِ حمل ہو گیا۔ بچہ قبل از وقت پیدا ہوا اور وفات پا گیا۔ یہ بچہ محمد ﷺ کا پہلا نواسہ تھا۔ بعد ازاں جب محمد ﷺ کو علم ہوا کہ ہبر نے زینبؓ کے کاروان پر حملہ کیا تھا اور باعثِ اسقاطِ حمل ہوا تھا تو حکم دیا کہ ہبر کو گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ۔ ہبر کو مدینہ لایا گیا۔ زینبؓ اسقاطِ حمل کے باعث مدینہ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد وفات پا گئیں۔

اس ترتیب سے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے اپنے والد ﷺ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔

جب ہبر مدینہ لایا گیا تو ایک مسلمان نے کہا: ''اسے زندہ جلا دیا جائے۔''

محمد ﷺ نے اظہار فرمایا: فقط خداوند صاحب اختیار آتش و انسان ہے۔ اسی کو لائق ہے کہ کسی کو آتش جہنم میں جلائے۔ میں یہ حکم نہیں دے سکتا۔ رحمت للعالمین ﷺ نے اس سے صرفِ نظر کیا۔

زینبؓ کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے سے پہلے ایک واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کا ذکر یہاں اس لیے ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ ایک عورت کے حقوق اس معاشرے میں کیا تھے۔ ابوالعاص اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور زینبؓ کے دل میں بھی اسی طرح اپنے شوہر کی محبت تھی۔ یہی انس و محبت باعث ہوئی کہ ابوالعاص بھی خفیہ طور مکہ سے مدینہ چل دیا۔ جیسے ہی زینبؓ کو علم ہوا، اس نے مسجد میں جا کر اپنے والد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں سے کہا کہ اس نے ابوالعاص اپنے سابقہ شوہر کو حق جوار میں لینے کا ارادہ کیا ہے۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں توضیح کی ہے کہ بدوی عرب کے حقوق میں سے ایک حق جوار بھی تھا جو کسی خارجی (بیرونی شخص) کو دیا جاتا ہے۔

عرب کی عورتوں کا حق (جوار) مردوں سے زیادہ تھا۔ یعنی عرب اس قدر عورتوں کے احترام کے قائل تھے کہ اگر ایک خارجی کا ہاتھ ایک عورت کے خیمہ کی طناب تک پہنچ جاتا اور وہ پناہ مانگتا تو اسے حق جوار حاصل ہو جاتا تھا۔ اگر ایک خارجی مفرور ایک عرب عورت تک رسائی حاصل کر لیتا اور وہ عورت اس پر اپنا (مقنعہ) ڈال دیتی تو وہ حمایت (جوار) سے مستفید ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ اس عورت کا جار ہوتا۔ کوئی شخص اسے گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بیٹی، ابوالعاص کو حقِ جوار میں لے رہی ہے تو منتظر ہوئے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کیا فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اپنے سابقہ شوہر کو حمایت (جوار) میں لے سکتی ہے۔ میری بیٹی کو حق حاصل ہے کہ اس مرد کی مدد کرے۔ لیکن اس کے ساتھ رہائش نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے کہ ایک مسلمان عورت ایک مشرک مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

ابوالعاص بعد میں مسلمان ہو گیا۔ زینبؓ سے شادی کر لی۔ لیکن زینبؓ شادی کے فوری بعد وفات پا گئیں اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کو غمزدہ کر گئیں۔



مکّہ میں جنگِ بدر کے اثرات

ہم گزشتہ صفحات میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ پیغمبر ﷺ اسلام نے اہلِ مدینہ کے لیے ایک قانونِ اساسی تدوین کیا تھا۔

قانون اساسی کے ایک حصہ میں مذکور تھا کہ مدینہ کے یہودی قبیلے: قریش اور اہلِ مکّہ کے ساتھ (محمد ﷺ اور اسلام کی مخالفت میں) اتحاد نہیں کریں گے۔

لیکن یہودیوں نے اس کے برخلاف رویہ اختیار کیا۔ چند یہودی شعرا مدینہ سے مکّہ گئے، تاکہ اہلِ مکّہ اور قریش کو محمد ﷺ کے مقابلے میں برانگیختہ کریں۔ ان یہودی شعرا میں سے ایک کا نام کعب بن الاشرف تھا۔

یہودی شعرا جب مکّہ میں وارد ہوئے تو مکّہ میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ قریشی قبائل نے یہ اعلان کیا ہوا تھا کہ "مقتولین کے لیے کوئی گریہ نہیں کرے گا، بلکہ اس کا انتقام لیا جائے گا"۔

مقتولین سے مراد ان کی جنگِ بدر میں قتل ہونے والوں سے تھی۔ انھوں نے شہر میں اعلان کیا کہ: "جو مقتولینِ بدر پر روئے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنے قبیلہ کی طرف سے مطرود ہوگا"۔ اسی بنا پر وہ مائیں جن کے فرزند جنگِ بدر میں مارے گئے تھے گریہ وزاری کی جرأت نہیں کر پا رہی تھیں۔ ایک رات ایک مقتول کی ماں کے کانوں میں گریہ وزاری کی آواز آئی۔ مقتول کی ماں بہت حیرت زدہ تھی کیوں کہ اعلان کے مطابق گریہ وزاری منع تھی۔ وہ عورت (مقتول کی ماں) گھر سے باہر آئی اور آواز کی سمت چل دی تو ایک گھر میں پہنچی جہاں سے گریہ وزاری کی آواز آ رہی تھی۔ دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت آنسو بہا رہی ہے۔

اس سے پوچھا "ماں کیا گریہ وزاری پر سے پابندی ختم ہو گئی ہے کہ تو رو رہی ہے"۔

بوڑھی عورت نے پوچھا: تو کیوں یہ سوال کر رہی ہے؟ عورت جو گھر میں داخل ہوئی تھی،

اس نے کہا: میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنے بیٹے کے لیے گریہ وزاری کروں جو جنگِ بدر میں مارا گیا ہے لیکن ڈرتی ہوں کہ آہ وشیون کرنے پر مجھے طرد کر دیا جائے گا۔ اب جو میں نے رونے کی آواز سنی تو چلی آئی کہ پوچھوں آیا رونے کی اجازت مل گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو آؤ مل کر آہ وفغاں کریں۔ بوڑھی عورت جو خود غم گزیدہ تھی جرأت نہ کر سکی کہ اسے بتائے میں اپنے بیٹے کے لیے رو رہی ہوں جو جنگِ بدر میں مارا گیا تھا، بلکہ کہا کہ میں بیٹے کے لیے نہیں رو رہی، دوسرے اس کی موت اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ میرا تو ایک اونٹ گم ہو گیا ہے اور اس اونٹ کے نہ ملنے سے بہت غمگین ہوں۔ میرے یہ آنسو اونٹ کے لیے ہیں نہ کہ بیٹے کے لیے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہالیانِ مکہ، طائفہ قریش سے کس قدر خوفزدہ تھے کہ غم گزیدہ عورتیں اونٹ کی گمشدگی کا بہانہ تراشتی تھیں اور چند آنسو بہا لیتی تھیں۔

جنگِ بدر میں ابوجہل کے قتل کے بعد محمد ﷺ سے نپٹنے کے لیے مکہ میں تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے اراکین ابولہب، ابوسفیان اور صفوان بن امیہ تھے۔ ان تینوں نے عہد کیا کہ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے تاوقتیکہ محمد ﷺ کو نابود اور اسلام کو تباہ نہ کر دیں۔ ابولہب جنگِ بدر میں شریک نہیں ہوا تھا جب کہ عربوں کی رسم کے مطابق لازم تھا کہ وہ جنگ میں شرکت کرے۔ جب جنگِ بدر کا آغاز ہو رہا تھا، اس وقت ابولہب بیمار تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی طرف سے جنگ میں شرکت کے لیے عاص بن ہشام کو کرایہ پر حاصل کیا۔ ابولہب نے اس کرایہ کے فوجی کو چار ہزار درہم ادا کیے۔

مشرکین جنگِ بدر میں شکست کھانے کے بعد جب اپنے اسیروں کی آزادی کے لیے فدیہ کی ادائیگی پر مجبور ہوئے تو ابولہب نے محمد ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کے اجرا کے لیے ایک کرائے کا قاتل حاصل کرنا اور مدینہ بھجوانا تھا تاکہ وہ محمد ﷺ کو قتل کر دے۔

مدینہ میں محمد ﷺ کا قتل کرنا بہت آسان تھا۔ محمد ﷺ اپنے لیے کوئی محافظ نہیں رکھتے تھے اور اپنے گھر کا دروازہ کبھی بند نہیں کرتے تھے۔ ہر شخص آپ ﷺ کے گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔

جب کبھی کوئی آپ کے گھر میں داخل ہوا، یہ دیکھا کہ آپ ﷺ موزے بنا رہے ہیں یا لباس مرمت کر رہے ہیں یا پھر گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ آپ ﷺ کے پاس ایک نوکر بھی تھا لیکن وہ آپ ﷺ کی حفاظت پر مامور نہیں تھا۔ جب لوگ مدینہ میں محمد ﷺ سے ملنے آتے تو وہ ان لوگوں کی راہنمائی کرتا اور انھیں محمد ﷺ کے حضور لے جاتا کیوں کہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ مدینہ کے اطراف سے لوگ اپنے نمائندے محمد ﷺ سے ملاقات ومذاکرات کے لیے بھجواتے۔

آپ ﷺ کی زندگی چونکہ بہت سادہ تھی۔ دوسرے مسلمانوں اور آپ ﷺ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس لیے دن رات میں کسی بھی وقت آپ ﷺ کو قتل کرنا بہت آسان تھا۔ ابولہب نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ایک شخص عمیر بن وہب ڈھونڈا۔ اس کا بیٹا جنگِ بدر میں اسیر ہو چکا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ بیٹے کا فدیہ ادا کرنے مدینہ جائے گا۔ صرف ابولہب، ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو علم تھا کہ اس کا اصل مقصد محمد ﷺ کو قتل کرنا ہے۔ ابولہب نے اسے سفر کے اخراجات کے لیے رقم دی اور مزید یہ وعدہ کیا کہ جب تک وہ واپس نہیں آئے گا، اس کے بیوی بچوں کا خرچ وہ برداشت کرے گا۔

عمیر مدینہ میں داخل ہوا۔ محمد ﷺ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اسے بتایا گیا کہ محمد ﷺ فلاں وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ عمیر جب محمد ﷺ کے گھر میں داخل ہوا، آپ ﷺ اپنی چادر دھو رہے تھے۔

محمد ﷺ نے سر اُٹھا کر پوچھا: کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟

عمیر نے کہا: یا محمد ﷺ! میں کیا دیکھ رہا ہوں آپ ﷺ چادر خود دھو رہے ہیں۔ ایک پیغمبر ﷺ کے لیے یہ کام شائستہ نہیں۔

محمد ﷺ نے پوچھا: کیوں شائستہ نہیں؟

عمیر نے کہا: ایک شخص جو پیغمبر ﷺ ہو، اس کے کام تو غلاموں اور کنیزوں کو سرانجام دینے چاہئیں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: میرے پاس غلام اور کنیزیں نہیں ہیں۔ میں اپنے کام خود انجام دیتا

ہوں، تو اطمینان رکھ۔ پیغمبر ﷺ کے چادر دھونے سے اس کی پیغمبری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اس کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ نے موضوع بدل دیا اور فرمایا: میں جانتا ہوں تو کس کام کے لیے یہاں آیا ہے۔

عمیر نے کہا: ہاں اے محمد ﷺ! میں آیا ہوں کہ تم سے اپنے بیٹے کی آزادی کی بابت پوچھوں کہ کتنا فدیہ ادا کرنا ہوگا۔

روایت ہے کہ جب محمد ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا: اے شخص! تو جھوٹ بول رہا ہے، تو اپنے بیٹے کو فدیہ ادا کر کے آزاد کرانے نہیں آیا بلکہ مجھے قتل کرنے آیا ہے۔

جب عمیر کے کانوں سے یہ الفاظ ٹکرائے (مطابق روایت) اس نے خنجر، جو قتل کے لیے ساتھ لایا تھا، لباس میں سے نکال کر زمین پر پھینک دیا اور کہا: ''اے محمد ﷺ! بجز میرے اور تین دوسرے افراد کے (جو اہلِ مکہ ہیں) جنھوں نے مجھے تمھارے قتل پر مامور کیا تھا، کوئی نہیں جانتا کہ میں تمھارے قتل کے ارادہ سے یہاں آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے ان تینوں میں سے کسی نے ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا تم جو اس منصوبہ سے آگاہ ہو پیغمبر ﷺ برحق ہو۔ میں اسی لمحے تمھارے دین کو قبول کرتا ہوں۔

مسلمان ہونے کے بعد عمیرؓ نے کہا: آج تک میری تمام صلاحیتیں اسلام کی پیش رفت روکنے کے لیے تھیں، مگر آج سے میں توسیعِ اسلام کے لیے سرگرمی دکھاؤں گا۔ عمیر واپس مکہ روانہ ہوگیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے سنا کہ ابولہب مر چکا ہے۔

وہ ابولہب کیسی موت مرا، اس کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے:

مکہ میں ایک میدان بنام مرید تھا۔ اس میدان میں قافلے ٹھیرا کرتے۔ وہیں لوگوں کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور ایک دوسرے سے سفر کے حالات بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دن ابولہب اس میدان میں سے گزر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ ایک بدو عرب کی باتیں سننے کے لیے اس کے گرداگرد جمع ہیں۔

ابولہب آگے بڑھا دیکھے کہ وہ کیا باتیں کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ جنگِ بدر کے متعلق باتیں سنا رہا ہے۔ وہ بدو عرب کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس جنگ میں پانچ ہزار

فرشتے آسمان سے اترے اور مسلمانوں کی مدد کی اور لشکرِ قریش شکست کھا گیا۔ اس بدو عرب نے شاید اس لیے کہ لوگوں کو اپنی بات سے زیادہ سے زیادہ متاثر کر سکے، کہا: میں نے خود ان میں سے کچھ فرشتوں کو دیکھا تھا۔ وہ آسمان سے اتر رہے تھے۔ ان کے لباس ایک سے تھے اور وہ سیاہ و سفید گھوڑوں پر سوار تھے۔

سامع حیرت کے ساتھ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہیں۔ ابولہب نے اس شخص کے بیان کا اثر جو دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔ کہا: ''تو جھوٹ بولتا ہے۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں اترے تھے''۔

اس مردِ نقال نے جواب دیا: جیسا میں خود تجھے یہاں موجود دیکھ رہا ہوں، اسی طرح میں نے فرشتوں کو بچشمِ خود ایک ہی لباس میں اترتے دیکھا ہے۔

ابولہب نے اسے پھر جھٹلایا۔ اسے جھوٹا اور لاف زن گردانا۔

ایک گروہ جو اس بدوی عرب کی باتوں سے متاثر تھا، اس نے اس کے دعاوی کی تصدیق کی اور پوچھا: اگر فرشتے مسلمانوں کی مدد کو نہیں آئے تھے تو کیسے لشکرِ قریش ۳۱۳ افراد سے شکست کھا گیا۔

کچھ لوگ ابولہب کی حمایت پر اتر آئے اور دونوں گروہوں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ ابولہب اس دھینگا مشتی میں زخمی ہوا۔ یہاں تک کہ اسے اٹھا کر اس کے گھر پہنچایا گیا۔

ابولہب زخمی ہونے کے سات دن بعد مر گیا۔

ایک عرب مورخ عیسیٰ نے لکھا ہے: ابولہب کو اس زخمی حالت میں طاعون کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ سرایت مرض کے خوف سے اس کی لاش کو شہر سے دور دفن کیا گیا۔

ابولہب کے بعد ابوسفیان نے مخالفینِ اسلام کی پیشوائی سنبھالی اور اس کی بیوی موسوم بہ ہند[1] اپنے شوہر سے بھی زیادہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی نسبت دشمنی کا اظہار کرتی۔

۱۔ ہند۔ بروزن قند پڑھا جاتا ہے۔ کلمہ (ہند) کے معنی ہیں بے ارزش، بے وقعت چیز .... دورِ جاہلیت میں عرب لڑکی کی اہمیت کے قائل نہیں تھے، لہٰذا بعض قبائل اس قسم کے نام رکھا کرتے تھے یعنی بے ارزش، بے وقعت وغیرہ وغیرہ۔

جنگ بدر کے دو مہینے بعد اشراف مکّہ نے ایک لشکر مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے مدینہ بھیجا۔ لشکر کا کماندار ابوسفیان تھا۔ ابوسفیان کا اصل پیشہ تجارت تھا لیکن شعر بھی کہا کرتا تھا۔ خصوصاً محمد ﷺ کی شان میں اس کی کہی ہوئی ہجو بہت مشہور ہے۔

ابوسفیان ۲۰۰ افراد کے ساتھ ماہ حرام میں مکّہ سے نکلا اور مدینہ کی راہ لی۔ اس نے مدینہ کے قریب کوہ نیب میں لشکر کو ٹھیرایا اور خود چند افراد کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ قریش اور یہودیوں کے درمیان گٹھ جوڑ ہو چکا تھا کہ جب بھی قریش مسلمانوں پر حملہ آور ہوں گے، یہودی قریش کی مدد کو اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اسی لیے ابوسفیان یہودیوں کو اپنا اتحادی سمجھتے ہوئے بڑے اطمینان سے مدینہ میں داخل ہوا اور سلام بن مشکم کے گھر گیا جو کہ یہودیوں کے بزرگوں میں سے تھا۔ سلام بن مشکم نے ابوسفیان کی بڑے شاہانہ انداز میں پذیرائی کی۔ بہترین غذا اور شراب اس کے لیے فراہم کی۔

کھانا تمام ہونے پر ابوسفیان نے صاحب خانہ سے کہا: تمھارے وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے میں مدینہ آیا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ آج رات تمھاری مدد سے مسلمانوں پر حملہ کروں۔

سلام بن مشکم نے کہا: ہم اپنے وعدوں پر قائم ہیں اور جیسا کہ ہم نے وعدہ کیا ہوا ہے، ہم محمد ﷺ کے ساتھ جنگ میں تمھاری مدد کریں گے، لیکن ہمارے گمان میں نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی آجاؤ گے اور جنگ شروع کرنا چاہو گے۔ ہم اس وقت جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آج رات جنگ میں شامل نہیں ہو سکتے اور نہ ہمارے لیے کل، پرسوں اور بعد کی راتوں میں ممکن ہوگا، مگر یہ کہ کچھ مدت گزر جائے اور ہم جنگ کی تیاری مکمل کر لیں۔

ابوسفیان کا ارادہ اسی رات حملہ کرنے کا تھا۔ جب اس کا ارادہ پورا نہ ہوا تو اس نے واپسی پر یہودی محلہ عریق میں عربوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ یہ محلہ مدینہ کے شمال میں واقع ہے۔ دو مسلمانوں کو قتل بھی کر دیا اور مالِ غنیمت بشمول ستوؤں (سویق) سے بھری ہوئی بوریاں لے کر فرار ہو گیا۔

مسلمان اس قتل و غارت گری کی اطلاع ملتے ہی ابوسفیان کے تعاقب میں نکل پڑے۔

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے تعاقب سے گھبرا کر ستوؤں سے بھرے ہوئے تھیلوں کو راہ میں گرا دیا تا کہ ان کے اونٹ اور گھوڑے تیز تر دوڑ سکیں۔ اس واقعے کو اسی نسبت سے تاریخ عرب میں جنگ سویق (ستوؤں کی غارتگری) کا نام دیا گیا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ردِعمل کے طور پر حکم دیا کہ مکّہ کا جو بھی قافلہ سرزمین مدینہ سے گزرے اس پر حملہ کیا جائے۔ ایک دن مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ مکّہ کا ایک قافلہ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کی سربراہی میں خیبر سے مکّہ جا رہا ہے اور ان کے ہمراہ سامانِ تجارت زیورات اور چاندی کے برتن ہیں۔

خیبر، مدینہ کے شمال میں واقع ایک شہر ہے۔ وہاں تمام آبادی یہودیوں کی تھی۔ اس شہر کی آبادی کی اکثریت زرگر تھی۔ وہ چاندی کے برتن، طلائی زیورات اور دوسری اقسام کے گراں بہا ظروف بنایا کرتے تھے۔ خیبر کے یہودی نہ صرف طلائی زیورات اور چاندی کے برتن دوسروں کو بیچا کرتے تھے بلکہ کرایہ پر بھی دیا کرتے تھے۔ اشرافِ مکّہ شادی بیاہ اور بڑی بڑی ضیافتوں کے موقع پر یہ سامان یہودیوں سے کرایہ پر لے جایا کرتے تھے۔

بہرحال اس اطلاع پر مسلمانوں کا ایک سو افراد پر مشتمل دستہ زید بن حارثہؓ کی سرکردگی میں مدینہ سے روانہ ہو گیا کہ قافلہ پر حملہ آور ہو۔ مسلمانوں نے نجد کی حدود پر قردہ کے مقام پر قافلہ کو جا لیا اور بے درنگ حملہ کر دیا۔

ابوسفیان اور صفوان بن امیہ فرار ہو گئے۔ تمام اموالِ کاروان مسلمانوں کے ہاتھ لگا جس کی مالیت ایک لاکھ درہم کے قریب تھی۔ مکّہ کا یہ پہلا کاروان تھا جو براہِ راست مسلمانوں کے پنجہ میں آ پھنسا تھا۔ مسلمانوں نے اس مال کے تصرف سے (غزوۂ سویق) کا بدلہ لیا۔

قافلے پر حملہ کی خبر جب مکّہ پہنچی تو مکّہ کے بت پرستوں کی آتشِ انتقام اور بھڑک اٹھی۔ انھوں نے اور زیادہ تیزی سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔



ایک یہودی گروہ کا مدینہ سے اخراج

اس حال میں جب کہ اہلِ مکّہ خود کو ایک بڑی جنگ کے لیے تیار کر رہے تھے، مدینہ میں مخالفین اسلام نے شعروہجو کہہ کر ایک نیا محاذ کھول دیا۔ ہم نے اس تاریخی حقیقت کی پہلے وضاحت کردی ہے کہ سرزمین عرب میں کلام کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ منظوم کلام کے تو وہ دیوانے تھے۔ سیاسی مقابلوں میں ہجو کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ عربوں کا قول تھا کہ: ''ہجو کا زخم تلوار اور نیزہ کے زخم ہی کی طرح مہلک ہوتا ہے''۔

مدینہ کے شعرا میں سے ایک شاعر کعب بن الاشرف تھا جو محمد ﷺ اور مسلمانوں کی شان میں ہجو کہا کرتا تھا۔ اس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ شخص چند ماہ کے لیے مکّہ بھی گیا تھا۔ وہاں سے اس نے مکّہ والوں کو محمد ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اکسایا اور مدینہ واپس آ گیا۔ مدینہ میں جہاں عوام جمع ہوتے وہ محمد ﷺ اور اسلام کی ہجو پڑھنے لگتا اور اس طرح لوگوں کو برانگیختہ کرتا۔

کعب بن الاشرف کے علاوہ ایک شاعرہ عصما بنت مروان تھی جو محمد ﷺ اور اسلام کی ہجو کہا کرتی تھی۔ یہ عورت مدینہ کی خوبصورت ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔ وہ خوش آواز بھی تھی۔ اس لیے اس کے خداوند، محمد ﷺ، مسلمانوں، قرآن، جبرئیل کے خلاف ہجو کہنے پر مسلمان بہت آزردہ ہوتے تھے، حتیٰ کہ محمد ﷺ بذاتِ خود بھی اس کے اشعار سے بہت دلگیر ہوتے۔ لیکن چونکہ آپ حلیم الطبع اور بہت زیادہ بردبار تھے اس لیے برداشت کرتے تھے، حتیٰ کہ خداوند نے سورۃ عصر میں فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ o إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o﴾ خداوند نے اس سورت میں زمانے کی قسم کھائی اور فرمایا: ''قسم ہے عصرِ حاضر کی (یعنی وہ عصر جس میں محمد ﷺ پیغمبری پر مبعوث ہوئے) بے

شک انسان اپنی نادانیوں اور کج رویوں کی وجہ سے خسارے کی طرف جا رہا ہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور صالح عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی"۔

قرآن میں بار بار صبر و بردباری کی تاکید کی گئی ہے اور ہر دفعہ خداوند لوگوں پر واضح کرتے ہیں کہ حلیمی اور بردباری کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ بہت بردبار تھے۔ مسلمانوں کا پیمانہ صبر بہرحال محمد ﷺ جیسا نہیں تھا۔ وہ ہجو پر بہت آزردہ تھے، نیز یہ کہ شعرا ندکور خداوند اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی شان میں بھی گستاخی کرتے تھے۔

مسلمان اپنے متعلق ہر بدگوئی کو برداشت کر سکتے تھے، مگر پیغمبرِ اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی ان کے لیے ناقابل تحمل تھی، دوسرے دن جب یہ خبر لوگوں تک پہنچی کہ ایک نابینا مرد نے عصما کو قتل کر دیا ہے تو لوگ حیرت میں گم ہو گئے۔

اس لیے کہ سمجھ سے بالا تھا کہ ایک نابینا کس طرح گھر میں گھسا ہوگا اور اس نے عصما کو کس طرح ڈھونڈ کر قتل کیا ہوگا۔ حتیٰ کہ معلوم ہوا کہ وہ شخص عصما کے نزدیکی عزیزوں میں سے ہے اور کئی سال سے اس کے ساتھ ہی رہتا تھا[1] اور اس کا ہم قبیلہ تھا۔ گھر کی ہر چیز سے آشنا تھا۔ اس عورت کی عادتوں سے بھی واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ عورت کہاں سوتی ہے۔

عصما کے قتل کی خبر تمام مدینہ میں پھیل گئی۔ سبھی اس خبر سے مطلع ہو گئے۔ محمد ﷺ کو بھی یہ خبر مسجد میں سنائی گئی۔ نابینا قاتل جب مسجد میں آیا تو محمد ﷺ نے ان سے پوچھا۔ کیا تم نے ہی عصما کو قتل کیا ہے؟

اس نے عرض کی: "ہاں! یا محمد ﷺ! شب گزشتہ میں نے ہی اسے قتل کیا ہے اور میں بالکل پشیمان نہیں ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں یہ موضوع بالکل بے اہمیت ہے"۔

۱۔ عصماء کا نکاح یزید بن زید بن حصن خطمی سے ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے قتل کی اجازت دے رکھی تھی، عمیر بن عدیؓ نے اسے قتل کیا۔ [اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، ص ۲۲۲ بحوالہ طبقات ابن سعد]

عصما کے قتل کے بعد کعب بن الاشرف یہودی کو بھی ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔[۲]

مدینہ میں ایک اور شاعر بنام ابوعفک یہودی تھا۔ یہ بھی خداوند، محمد ﷺ اور مسلمانوں کی شان میں ہجو کہا کرتا تھا۔ یہ شاعر بھی ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا قاتل بھی خود اس کے قبیلہ میں سے تھا۔[۳] اس ترتیب سے تینوں ہجو سرا شاعر قتل ہوئے اور تینوں کے قاتل مقتولین کے ہم قبیلہ تھے، اس لیے کسی بھی قاتل کو سزا نہ دی جا سکی۔

لیکن ان تینوں شعرا کے قتل کے بعد بھی ہجو سرائی جاری رہی اور یہ ہجو سرائی مدینہ کے یہودیوں نے شروع کی تھی اور مسلمانوں کی آزردگی کا باعث ہوئے۔ محمد ﷺ نے یہودیوں سے کہا کہ مسلمانوں کی ایذا رسانی سے باز آ جائیں۔ مزید انھیں یاد دلایا کہ تم نے قانون اساسی کے تحت یہ عہد کیا ہوا ہے کہ مسلمانوں کے دوست رہو گے اور مسلمانوں کے دشمنوں سے اتحاد نہیں کرو گے۔

ایک روز محمد ﷺ مسلمانوں اور یہودیوں کی بہبود کے متعلق کوئی لائحہ عمل طے کرنے کے لیے طائفہ زرگراں کے رئیس کے گھر تشریف لے گئے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کے تین طائفے تھے: کشاورز (کسان)، زرگر اور دباغ۔

طائفہ زرگراں کے رئیس کو علم تھا کہ چند ہفتے بعد چند ہزار جنگجو افراد پر مشتمل ایک بڑا لشکر مکہ سے مدینہ آنے والا ہے، لہٰذا وہ محمد ﷺ سے بڑی سرد مہری سے پیش آیا۔ یہ رئیس ان افراد میں سے ایک تھا جنھوں نے قریش سے خفیہ معاہدہ کیا ہوا تھا کہ لشکر مکہ جب مدینہ میں داخل ہوگا تو یہ قریش کی مدد کریں گے تاکہ مسلمانوں کو نابود کر دیں۔ یہ محتاجِ بیان نہیں کہ اس عمل سے وہ قانونِ اساسیِ مدینہ سے منحرف ہوئے اور عہد شکنی کی۔

محمد ﷺ نے گھر میں داخل ہونے کے بعد پہلی گفتگو قانون اساسیِ مدینہ کی بابت کی اور فرمایا کہ اس قانون کا احترام کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ کبھی کسی کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو قانونِ اساسی کے خلاف ہو۔

۲- کعب بن اشرف کو ربیع الاوّل ۳ھ میں محمد بن مسلمہ انصاریؓ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا۔
۳- ابوعفک کو شوال ۲ھ میں سالم بن عمیر انصاریؓ نے قتل کیا جو بدری صحابی تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے موجودہ حالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کی طرف سے آج تک قانون اساسی کی کوئی چھوٹی سی خلاف ورزی بھی سرزد نہیں ہوئی اور یہودیوں کو آزار پہنچانے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا گیا، البتہ یہودیوں نے ہجو وہزل کہہ کر مسلمانوں کی دلآزاری کی ہے۔ ہم نے اس پر صبر کیا۔ مگر تم لوگ زیادہ دلیر ہو گئے ہو اور تم نے شاید اسے ہماری کمزوری پر محمول کیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمانوں نے جیسا کہ آخری جنگ میں ثابت کیا ہے وہ کسی سے نہیں دبتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ویسے ہی اقدام سے مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات خراب ہوں، لہٰذا بہتر ہوگا کہ یہودی مسلمانوں کو آزار پہنچانا چھوڑ دیں اور قانون اساسی کا احترام کریں۔

یہودی طائفہ زرگراں کے رئیس نے اس معاملے میں اپنی کم اعتنائی کا اظہار کیا۔ آپ ﷺ کو نام سے یعنی یا محمد ﷺ کہہ کر پکارنے کے بجائے آپ ﷺ کی کنیت کہ ابوالقاسم تھی، سے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

اے ابوالقاسم! جنگ (بدر) کے نتائج نے تمھیں اور تمھارے پیروکاروں کو مغرور بنا دیا ہے اور تم تصور کرتے ہو چونکہ تم نے اہلِ مکہ کے لشکر پر جو تم سے کثیر و برتر تھا فتح حاصل کی ہے، لہٰذا اب ہر جگہ فتح مند ہو گے۔ تم اس سے غافل ہو کہ جنگ (بدر) میں تمھاری جنگ ہم نژادوں سے تھی۔ تم نے ابھی تک یہودیوں سے جنگ نہیں کی، تاکہ سمجھ سکو کہ مردانِ جنگجو کیسے ہوتے ہیں، ہم دلیر لوگ ہیں۔ ہم میں استقامت ہے اور فنونِ حرب و ضرب میں ہمیں تخصص حاصل ہے اور جو کوئی ہمارے مقابل آئے گا شکست کھائے گا۔

محمد ﷺ نے فرمایا: ''ہم تم سے جنگ نہیں چاہتے، بلکہ دوستی کے خواہاں ہیں۔ یہ خبر بھی گشت کر رہی ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ مکہ سے ایک بہت بڑا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ کیا ان حالات میں تم آمادہ نہیں ہو کہ ہم سے دوستی رکھو اور لشکر سے نمٹ لینے کے بعد تم بے شک غیر جانبدار ہو جانا''۔

یہودی اس لشکر کی آمد سے کچھ اس طرح پرامید تھے کہ رئیس طائفہ زرگراں آمادہ نہ ہوا کہ غیر جانبداری کا وعدہ کرے اور کہا کہ یہ اس پر منحصر ہے کہ مسلمان کیا رویہ اپناتے ہیں۔ اگر ان کا رویہ اس موقع تک اطمینان بخش ہوا تو لشکر مکّہ کی آمد کے بعد ہم غیر جانبدار ہو جائیں گے۔

مسلمان اس لیے کہ یہودیوں کو کوئی بہانہ بنانے کا موقع نہ ملے، ان سے اچھا سلوک کر رہے تھے اور ان کی ہر قسم کی جارحیت پر خاموش تھے۔ وہ اگر کوئی قدم اُٹھاتے تو یہودی دشمن ہو جاتے اور مکّہ کے لشکر کی آمد پر مسلمان دو تلواروں کے درمیان ہوتے۔ مکّہ کا لشکر باہر سے اور یہودی اندر سے حملہ آور ہوتے۔ اس حال میں مسلمان، یہودیوں کی ہر زیادتی گوارا کر رہے تھے کہ ایک دن ایک مسلمان لڑکی یہودیوں کے محلّہ زرگراں سے گزر رہی تھی۔ یہودی جوان لڑکوں نے اسے گھیر لیا اور بدزبانی شروع کر دی۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ کوشش کی کہ اس لڑکی کا لباس اس کے بدن سے جدا کر دیں۔ جب یہودی لڑکوں نے لڑکی کو گھیرا ہوا تھا، ایک یہودی زرگر اپنی دکان سے اُٹھا اور لڑکی کے کرتے کا دامن ایک کیل سے پھنسا دیا۔

اب اس لڑکی نے جو ناچار فرار کی کوشش کی تو کرتے کا دامن چونکہ کیل سے متصل تھا، کرتہ پھٹ گیا اور لڑکی کے بدن سے علیحدہ ہو گیا۔ یوں لڑکی عریاں ہو گئی۔ ایک مسلمان جو وہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ یہودی زرگر کے پاس گیا اور ایک مکہ اس کے سر پر رسید کیا۔ یہودی جوان جو وہاں پر جمع تھے، زرگر کی حمایت میں آگے بڑھے اور مسلمان مرد کو قتل کر دیا۔

مسلمانوں نے طائفہ زرگراں سے دیّت کا مطالبہ کیا۔ لیکن یہ یہودی طائفہ دیّت کی ادائگی پر آمادہ نہ ہوا۔

جب ایک طائفہ قتل کا مرتکب ہو اور خون بہا کی ادائگی سے انکاری ہو تو عرب زندگی کے ضابطوں کے مطابق اس طائفہ سے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مسلمان نے یہودیوں کے اس طائفہ سے جنگ کا ارادہ کیا۔ اس طائفہ کے مردوں کی تعداد سات سو تھی۔ وہ اپنی بستی میں (جس کی تعمیر ایک قلعہ کی طرز پر تھی) محصور ہو گئے۔

وہ اس وقت تک مسلمانوں سے خوفزدہ نہیں تھے، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ مکّہ کا لشکر

ابوسفیان کی سرکردگی میں چند روز تک مدینہ پہنچ جائے گا۔ فقط انھیں یہ افسوس تھا کہ یہ جنگ چند دن پہلے کیوں شروع ہو گئی ہے۔ مسلمانوں نے زرگروں کے محلّہ کا محاصرہ کر لیا۔ زرگر دو ہفتہ تک متواتر محصور رہے۔

ان دو ہفتوں میں دونوں اطراف سے کوئی زخمی یا قتل نہیں ہوا تھا۔ دو ہفتوں بعد یہودیوں کو معلوم ہوا کہ مکّہ کا لشکر ابھی تک مکّہ سے چلا ہی نہیں کجا کہ مدینہ یا مدینہ کے نزدیک ہی پہنچا ہو، لہٰذا اس یہودی طائفہ نے پریشان ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ پھر بھی محمد ﷺ نے ان سے نرم رویہ اختیار کیا۔ اسلحہ کے علاوہ ان سے کوئی چیز نہ چھینی اور فرمایا کہ انھیں (یہودیوں کو) اختیار ہے مسلمان ہو جائیں یا مدینہ چھوڑ جائیں۔ محمد ﷺ نے ان سے کہا کہ تم جاتی دفعہ جو چیز چاہو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو، بجز زمین کے کہ وہ خداوند کی ملک ہے۔

یہودی (زرگر) اپنی ہر چیز حتیٰ کہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بھی اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مدینہ کی حدود سے باہر جا کر وہ دو دستوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک دستہ نے جنوب کی سمت مکّہ کی راہ لی تا کہ وہ قریش کے لشکر کے ساتھ مدینہ واپس آ کر مسلمانوں کو نابود کریں۔ دوسرا گروہ اپنے راستہ پر چل دیا کہ جزیرہ نمائے عرب کے کسی یہودی علاقہ میں جا کر مقیم ہو۔[۴]

اگرچہ اس طائفہ کے اخراج سے مدینہ میں دشمنانِ اسلام کی تعداد میں تخفیف واقع ہوئی لیکن پھر بھی باقی ماندہ یہودی تعداد میں خاصے زیادہ تھے۔

یوں قریش کی طاقت کو نقصان پہنچا اس لیے کہ اگر یہ طائفہ زرگراں مدینہ ہی میں موجود ہوتا تو اس کے سات سو جنگی مرد ایک بہت بڑی قوت فراہم کرتے۔



۴۔ یہ زرگر یہودی بنوقینقاع تھے۔ مسلمانوں نے ۱۵ شوال ۲ ہجری کو بنوقینقاع کے قلعوں کا محاصرہ کیا۔ پندرہ دن کے محاصرے کے بعد بنوقینقاع نے ہتھیار ڈال دیے۔ انھیں اذرعات شام کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ [اٹلس سیرت نبوی، ص ۲۲۶]

غزوۂ اُحد
(۱۰ شوال ۳ھ)

کوہِ اُحد

جنگِ اُحد میں مجاہدین اسلام کی شجاعت

ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ابوسفیان چار سو افراد کے ساتھ مدینہ آیا تھا کہ یہودیوں کی مدد سے محمد ﷺ اور مسلمانوں کو ختم کرے۔ لیکن اس وقت یہودی ڈر گئے تھے اور انھوں نے محمد ﷺ کے خلاف قریش کا عملی طور پر ساتھ نہ دیا۔ ابوسفیان نے واپسی پر چند مسلمان گھرانوں کو لوٹا جلایا اور دو افراد کو قتل کر دیا اور راہِ فرار اختیار کی۔ اسی مناسبت سے اس کو جنگ سویق یعنی ستوؤں کی غارتگری کا نام دیا گیا۔

ابوسفیان مکّہ میں ایک بڑا لشکر فراہم کرنے کے بعد مارچ ۶۲۵ء مطابق ماہ شوال ۳ ہجری میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس دفعہ قریشِ مکّہ کے لشکر میں تین ہزار جنگجو تھے۔ ان میں سے سات سو زرہ پوش تھے اور صفوان بن امیہ نائب سالار تھا۔

جب ہم سات سو زرہ پوش کہتے ہیں تو اس کا ہرگز مطلب نہ لیا جائے کہ سرد ممالک کی طرح وہ آہنی لباس پہنے ہوئے تھے۔ عربستان میں آہنی لباس کا پہننا ممکن ہی نہیں کیوں کہ ایسا لباس پہن کر میدانِ کارزار میں پہنچنے سے پہلے ہی آدمی کو گرمی کی شدت ختم کر دیتی ہے۔

دو سو گھوڑ سوار تھے یعنی رسالہ، گھوڑ سوار لشکر کا برق رفتار حصہ تھا۔

قریش کے رسالے کا کمان دار خالد بن ولید تھا جو نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ دنیا کا عظیم ترین جنگجو ہو گزرا ہے۔ خالد بن ولید کی شجاعت، تدبّر و تحمل، دشمن کے کمزور حصوں پر نگاہ رکھنے کی اہلیت اور اس کے سریع حرکت ہونے کی سب مؤرخین نے تصدیق کی ہے۔ میدان کارزار میں جب تیروں اور نیزوں کی بارش ہو رہی ہوتی تھی، یہ دلیر مرد (خالد بن ولید) اس طرح تحمل کا مظاہرہ کرتا جیسے گھر میں دسترخوان پر بیٹھا غذا کھانے میں مشغول ہو اور جب حملہ شروع کرتا تو اس قدر سریع (تیز رفتار) کہ ایک لحظے میں ایک سمت سے دوسری سمت جا پہنچتا۔

خالد بن ولید بعد میں مسلمان ہو گیا اور جنگوں میں اس طرح اپنی شجاعت ولیاقت کا مظاہرہ کیا کہ مسلمانوں نے اسے خالد سیف اللہ یعنی ''خالد، اللہ کی تلوار'' کا خطاب دیا۔ لیکن ماہ شوال ۳ ہجری میں وہ محمد ﷺ سے برسرِ پیکار ہونے آیا تھا۔

دوسرے قریشی سرداروں میں ابوسفیان کے ہمراہ عکرمہ بن ابوجہل بھی تھا، جو باپ کی طرح، محمد ﷺ سے شدید کینہ رکھتا تھا۔

ابوسفیان کی بیوی ہند بھی میدانِ جنگ میں اس کے ہمراہ آئی تاکہ مسلمانوں کی بابت اپنی نذر پوری کر لے، یعنی میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ کر اپنے لیے ہار تیار کرے اور گلے میں ڈالے۔

قریش کے لشکر کے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی، اس عورت کا نام تھا عمرہ بنت علقمہ۔ ان دنوں وہ پینتیس یا چالیس سال کی تھی۔ وہ ایک بلند قامت اور خوبصورت عورت تھی۔ اس عورت نے جنگِ اُحد میں قریش کو غیرت دلانے کے لیے جو کلمات کہے، وہ سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بروز بدھ ۲۰ مارچ ۶۲۵ عیسوی بمطابق ۱۲ ماہ شوال ۳ ہجری کو قریش کا لشکر مدینہ پہنچا اور شہر کی شمالی سمت بڑھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ مکّہ مدینہ کے جنوب میں واقع ہے۔ مکّہ کے قافلوں کو جو شام کا سفر اختیار کرتے انھیں انھی اطراف سے گزرنا ہوتا تھا، لہٰذا مسلمان ان کی راہ روکتے تھے۔ کوئی بھی لشکر جو مکّہ سے آئے اسے منطقی طور پر جنوب کی طرف سے مدینہ میں وارد ہونا چاہیے، یا مدینہ کے جنوب میں کہیں پڑاؤ کرنا چاہیے، نہ یہ کہ وہ لشکر مدینہ کی شمالی سمت بڑھ جائے۔

لشکر قریش مدینہ کے نزدیک سے گزر کر شمالی جانب اس لیے گیا کہ جنوب کی طرف سے شتر سوار فوج کا شہر کے نزدیک پہنچنا مشکل تھا اور اس فوج کی نقل و حرکت کی راہ میں مدینہ کی جنوبی سمت بہت سی مشکلات حائل تھیں۔

چونکہ مدینہ کے جنوبی دشت تیز و نوک دار آتش فشانی پتھروں سے بھرے پڑے تھے، اونٹ ان پتھروں پر آسانی سے نہیں چل سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ ہر قدم پر گر جائیں یا یہ تیز اور

نوک دار پتھران کے نرم نرم تلوؤں کو زخمی کر دیں۔ انھی وجوہ کی بنا پر ابوسفیان کا لشکر اس جگہ پر جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔ جنگ میں متحرک ہونا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے ابوسفیان نے ترجیح دی کہ شہر کا چکر لگا کر شمال میں کوہِ اُحد کے دامن میں پہنچے کہ وہاں زمین بہتر تھی، راہ پیمائی اور جنگی حرکت کے لیے موزوں تھی۔

جب قریش کا لشکر مدینہ پہنچا، محمد ﷺ مسجدِ قبا میں تھے۔ یہ مسجد وہ اوّلیں مسجد ہے جو محمد ﷺ اور مسلمانوں نے مدینہ کے حومہ (قبا) میں بنائی تھی۔ محمد ﷺ ہفتہ میں ایک مرتبہ اس مسجد میں جایا کرتے تھے۔ بدھ اور بعض روایات کے مطابق جمعرات کا دن تھا کہ محمد ﷺ کو خبر ملی کہ مکّہ سے ایک لشکر مدینہ میں وارد ہوا ہے۔ یہ خبر آپ ﷺ کے لیے حیرت کا باعث نہ ہوئی، اس لیے کہ آپ کو اندازہ تھا کہ مکّہ سے ایک لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے والا ہے تاکہ مسلمانوں کو تباہ کر دے۔

مکّہ کے لشکر نے کوہ (احد) کے دامن میں قیام کرنے کے بعد اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کو مدینہ کے شمالی کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

یہ عمل جارحیت کا تھا۔ اہلِ مدینہ اس کا مفہوم سمجھتے تھے۔ وہ دن اور رات محمد ﷺ نے مدینہ کے رؤسا سے مشورہ میں گزارے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ محمد ﷺ جاننا چاہتے تھے کہ دورانِ جنگ مدینہ میں اندرونی طور پر امن رہ سکے گا کہ نہیں؟ محمد ﷺ سوچ رہے تھے کہ دورانِ جنگ ممکن ہے منافقین اور دوسرے طائفے مدینہ میں مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ ان کی خواہش تھی کہ داخلی محاذ پُر امن رہے۔

رئیس منافقین عبداللہ بن اُبی تھا۔ اس نے محمد ﷺ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور یہودیوں نے کہا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ان وعدوں کو قبول کیا۔ بعدازیں طریقِ جنگ پر مدینہ کے قبائل کے رؤسا سے مذاکرات کیے۔

عبداللہ بن اُبی نے مشورہ دیا کہ مسلمان محصور ہو کر لڑیں۔ اس نے کہا کہ اس شہر میں ایسی عمارتوں کا وجود ہے کہ ہر ایک عمارت دفاعی دیوار کا کام دے سکتی ہے اور اگر مسلمان ان

عمارتوں کو حصار بنالیں تو مکّہ کا لشکر مسلمانوں پر غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا۔

محمد ﷺ اس وضع سے واقف تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ مدینہ کی ہر ایک عمارت دفاعی حصار کا کام دے سکتی ہے اور اگر مسلمان ان عمارات میں محصور ہو جائیں بشرطیکہ کھانے پینے کی اشیا کا ذخیرہ موجود ہو تو مکّہ کا لشکر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ لیکن چونکہ یہ مشورہ عبداللہ بن ابی کا تھا اس لیے محمد ﷺ کو گمان ہوا۔ عبداللہ بن ابی قابلِ اعتماد نہ تھا۔ محمد ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ یہ صلاح عبداللہ بن ابی کی ہے، اس لیے اس میں کہیں فریب نہ ہو۔ وہ چاہتا ہو کہ یوں مسلمانوں کی حرکت کی آزادی چھن جائے۔ وہ بعدازیں عمارت کے دروازے کھول دے اور محمد ﷺ اور مسلمانوں کو قریش کے حوالے کر دے۔

عبداللہ بن ابی کے اظہارِ خیال کے بعد آپ نے جوانوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا: یا محمد ﷺ! ہمارے خیال میں بہتر یہ ہے کہ جنگ مدینہ سے باہر لڑی جائے، اس لیے کہ اگر ہم نے جنگ محصور ہو کر لڑی تو ہماری قوتِ حرکت سلب ہو جائے گی۔ لیکن صحرا میں ہر طرح کی حرکت جیسا آپ ﷺ چاہیں گے ہو سکے گی۔

محمد ﷺ نے شہر سے باہر جنگ لڑنے والوں کا نظریہ سننے کے بعد شہر سے باہر جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کی سنت تھی کہ کوئی فیصلہ کرنے سے قبل ہر ایک متعلقہ فرد سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ فیصلہ کرنے سے پہلے آپ ہر اچھے نظریہ کی پذیرائی فرماتے، لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو پھر اس میں ردّوبدل ناممکن ہوتا تھا۔

شہر سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی عبداللہ بن ابی دوبارہ محمد ﷺ سے خواستگار ہوا کہ اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی فرمائیں اور محصور ہو کر دفاع کریں۔ محمد ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ بن ابی! ایک پیغمبر جو خداوند کی طرف سے مبعوث ہوا ہو، محصور نہیں ہوتا اور خود کو شہر میں محبوس نہیں کیا کرتا۔ خدا کا پیغمبر ﷺ جو رسالت پر مبعوث ہوا ہو، جب تلوار کو نیام سے نکال لے تو پھر آگے ہی بڑھتا ہے۔

قریش کی تین ہزار کی تعداد کے مقابلہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ

جمعیت نہیں تھی۔ ان ایک ہزار میں سے جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا، تین سو افراد واپس آ گئے تھے اور محمد ﷺ کے ساتھ صرف سات سو افراد رہ گئے تھے۔ اسلامی لشکر میں دو سے زیادہ گھوڑے نہیں تھے اور زرہ و خود کی تعداد بھی بہت کم تھی۔

محمد ﷺ نے اپنے لشکر کا معائنہ فرمایا۔ لشکرِ اسلام کے پاس ساز و سامان خوب نہ تھا، اس لیے کہ مسلمان دولت مند نہ تھے کہ اچھے سے اچھا جنگی سامان فراہم کر سکتے۔ جب آپ ﷺ لشکر کا معائنہ فرما رہے تھے تو آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ یہودیوں کا لشکر جو ہمارے ساتھ ہے، بعید نہیں کہ وہ جنگ شروع ہونے کے بعد مکہ والوں سے جا ملے۔

یہودی مدینہ کے قانون اساسی کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ قانون اساسی میں مذکور تھا کہ جب مدینہ موردِ حملہ قرار پائے تو تمام اہلِ شہر باہم مل کر دشمن سے دفاع کریں گے۔ محمد ﷺ جانتے بھی تھے اور محسوس بھی کر رہے تھے کہ یہودیوں کا ارادہ جنگ شروع ہونے کے بعد قریش سے جا ملنے کا ہے لیکن آپ ﷺ اس بات کو زبان پر نہیں لائے تھے۔

دوسرے روز اسلامی لشکر مدینہ سے روانہ ہوا اور کوہ اُحد کے مشرقی دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ لشکر قریش کا پڑاؤ پہاڑ کے مغربی دامن میں تھا۔ بتاریخ ۱۵ شوال ۳ ہجری بروز ہفتہ صبح سویرے عبداللہ بن ابی نے اپنی منافقین کی جماعت کے ساتھ واپس کوچ کیا اور مسلمانوں اور یہودیوں کو اکیلا چھوڑ آیا۔

علی الصبح منافقین نے جو حرکت کی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کا اندیشہ بے اساس نہ تھا۔ اس میں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ منافقین وہ لوگ تھے جو بظاہر مسلمان تھے وہ محمد ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن یہودی جن کے متعلق افواہ تھی کہ علیحدگی اختیار کر جائیں گے اور مکہ کے لشکر سے جا ملیں گے وہیں رہے۔

محمد ﷺ نے خود ہی یہودیوں سے کہا: گرچہ قانون اساسی کے تحت مدینہ پر حملہ کی صورت میں سب کا مل کر دفاع کرنا فرض ہے لیکن یہ جنگ ہمیں درپیش ہے۔ یہ مسلمانوں اور مکہ کے بت پرستوں کی جنگ ہے۔ بت پرستوں کی جنگ اہلِ مدینہ سے نہیں، بلکہ صرف مسلمانوں سے ہے۔ ان کے حملہ کا مقصد مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں سے جنگ ہے،

لہٰذا یہ ایک مذہبی جنگ ہے اور قانون اساسی کے اُصولوں کے مطابق لازم نہیں کہ تم بھی دفاع میں شمولیت کرو اور مدینہ کا دفاع کرو۔ تمہارا مذہب یہودیت ہے اور یہ عقل سے بعید ہوگا اگر ہم تم سے امید رکھیں کہ ہمارے دین کی حمایت میں بت پرستوں سے جنگ کرو۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہفتہ کا دن تمہارا استراحت کا دن ہے اور اس دن تم جنگ نہیں کرو گے۔ پس بہتر یہ ہے کہ آپ سب گھروں کو واپس چلے جائیں۔ ہم مسلمان تنہا بت پرستوں سے لڑیں گے، اس لیے کہ یہ ہماری جنگ ہے۔ انجام جو خدا کو منظور ہوا ہوگا۔

یہودیوں نے جب دیکھا کہ محمد ﷺ خود ہی انھیں واپس جانے کو کہہ رہے ہیں، وہ اُٹھے اور گھروں کو واپس چل دیے۔ محمد ﷺ کے لشکر میں اب سات سو سے زیادہ مسلمان نہیں رہ گئے تھے۔

مسلمانوں کی حالت اس جنگ میں جنگِ بدر سے بدتر تھی۔ کفارِ مکہ کا لشکر تعداد میں چار گنا سے زیادہ تھا۔ قبل اس کے کہ جنگ شروع ہو، محمد ﷺ پیغمبر اسلام نے زِرہ پہن لی اور خود سر پر رکھ لیا اور مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ ہمارا طریق جنگ وہی بدر والا ہوگا، یعنی ہم صفیں ترتیب دیں گے، تا کہ دشمن کسی طرف سے بھی حملہ آور ہو اسے ہمارا سامنا کرنا پڑے۔ ہم کو اس بات پر بھی توجہ کرنی ہوگی کہ دشمن کے پاس رسالہ ایک مضبوط دستہ ہے، دو سو سوار خالد بن ولید کی کمان میں ہیں اور یہ امکان ہے کہ یہ سوار اپنے منصوبہ کے تحت ہماری صفیں درہم برہم کر دیں۔

جب ایک ترتیب جنگی تشکیل پاتی ہے تو سپاہ اس طرح صفیں باندھتی ہے کہ ایک دائرہ یا مربع کی شکل بن جائے اور دشمن خواہ کسی سمت سے بھی حملہ آور ہو، خود کو متقابل سپاہ کے سامنے پائے۔ دشمن کے پیادہ دستوں سے اس طرح کوئی خطرہ نہیں رہتا۔

لیکن سواروں کا حملہ خطرناک ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے سامنے کی سوار سپاہ کو روک بھی لیں تو ان کے عقب سے تازہ سوار آ جاتے ہیں اور ہمارے پاؤں اکھیڑ دیتے ہیں۔ گھوڑے کی سرعت حرکت زیادہ ہوتی ہے جو ہمیں مہلت نہیں دیتی کہ ہم اپنی صفوں کو دوبارہ درست کر سکیں اور سابقہ ترتیب بحال ہو۔

اس کے بعد محمد ﷺ نے جنوب کی سمت ایک مخصوص جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: میرا خیال ہے کہ خالد بن ولید نے اگر ہماری صفوں پر حملہ کیا تو اسی سمت سے گزر کر آئے گا، اس لیے کہ یہ جگہ کھلی اور سواروں کے حملہ کے لیے موزوں ہے۔

جس جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ایک تنگ گزرگاہ کے دہانے پر ایک وسیع میدان تھا جو کوہ اُحد کے دامن سے لے کر مدینہ شہر کے حومہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس جگہ تمام باغات تھے اور اگر اس تنگ گزرگاہ کو عبور کر کے جنوب کی طرف بڑھیں تو مدینہ شہر پہنچ جاتے ہیں۔ اس درہ میں ایک کم ارتفاع ٹیلہ دکھائی دے رہا تھا جسے ''عینین'' کہتے ہیں۔ محمد ﷺ نے دو پیادہ مگر تیر انداز دستوں کو عبداللہ بن جبیر کی قیادت میں مامور کیا کہ اس ٹیلہ پر پوزیشن لے لیں۔ یہ ٹیلہ عینین جنگی اہمیت کا حامل تھا اور محمد ﷺ نے اپنی صلاحیتوں سے اس اہمیت کو پا لیا تھا۔ یہ خالد بن ولید کے رسالہ کو روکنے کے لیے مسلمانوں کے عقب میں ایک محفوظ آڑ تھا۔ اسی نظریہ کے تحت تیر اندازوں کو اس ٹیلہ پر بٹھا دیا گیا۔

بعض مؤرخین نے ان دو دستوں کی تعداد پچاس افراد لکھی ہے اور بعض نے سو۔ میرے خیال میں موخر الذکر تعداد صحیح ہوگی اور تیر اندازوں کے دو دستے پچاس پچاس افراد پر مشتمل ہوں گے۔

وہ علاقہ جس میں مسلمانوں نے قیام کیا ہوا تھا، ایک طرح کا نشیب تھا اور کوہ اُحد کے دامن میں ایک پیالہ کی سی شکل میں تھا۔ دشمن کا پڑاؤ اسلامی کیمپ کے مغرب میں تھا۔ دشمن کسی بھی صورت مسلمانوں کے عقب میں نہیں پہنچ پاتا تھا، تاوقتیکہ جنوبی راہ یعنی ٹیلہ (عینین) کے نیچے سے گزرے۔ محمد ﷺ نے عبداللہ بن جبیر اور ان کے ساتھیوں کو جو ٹیلہ کی طرف جا رہے تھے، ایک بار پھر تاکید کی کہ ہمیں کیسے ہی حالات پیش آئیں تمھیں اپنی جگہ کو نہیں چھوڑنا ہوگا اور اگر دشمن کی سپاہ ٹیلے کے نیچے سے گزر کر ہماری طرف بڑھنا چاہے تو تیر اندازی کر کے اس کے پاؤں اکھیڑ دو۔ تمھیں اس ٹیلہ پر جم کر حفاظت کرنا ہوگی، حتیٰ کہ تم سب شہید کر دیے جاؤ۔ خصوصاً تمھیں دشمن کے سوار دستوں کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ہم تک نہ پہنچ پائیں۔

عبداللہ بن جبیرؓ نے اپنے تیر اندازوں کے ساتھ ٹیلہ پر پوزیشن سنبھال لی۔

محمد ﷺ نے تیر اندازوں کے چلے جانے کے بعد بقایا چھ سو افراد یا ایک روایت کے مطابق چھ سو پچاس افراد (اگر تیر اندازوں کی تعداد پچاس شمار کی جائے) سے چند صفیں بنائیں اور جنگِ بدر کی مثل پہلی صف کا علمبردار علیؓ کو مقرر فرمایا۔

مسلمانوں کی تھوڑی سی سپاہ (جس کی تعداد مجھے کسی تاریخ میں نہیں ملی) زبیر بن عوام کی کمان میں محفوظہ (ذخیرہ) میں رکھی گئی۔ محمد ﷺ نے زبیر بن عوام سے کہا: جب تم دیکھو کہ ہماری کوئی ایک صف یا مجموعی طاقت کسی مشکل میں پھنس گئی ہے تو اپنی سپاہ کے ساتھ مدد کو پہنچ جانا۔

محمد ﷺ جنگ شروع ہونے کے آخری لمحے تک مسلمانوں کو یہی ہدایت کرتے رہے کہ انفرادی جنگ سے پرہیز کرنا اور صفوں کی ترتیب کو قائم رکھنا۔ ہماری طاقت چونکہ دشمن سے بہت کم ہے، اگر انفرادی جنگ لڑی تو سب ختم ہو جائیں گے۔

ہند، ابوسفیان کی بیوی جنگ شروع ہونے سے قبل عورتوں کے ساتھ مل کر طبل بجاتی رہی اور اشعار کو مخصوص آہنگ میں قریش کے مردوں اور دوسری سپاہ کو مخاطب کر کے گاتی رہی۔ ان اشعار کا مطلب یہ تھا:

اگر دشمن پر حملہ کرو گے تو ہم تم کو شراب کے لطف اور دوسری لذتوں سے مست کر دیں گی ...... اور اگر تم نے دشمن کو پیٹھ دکھائی تو ہمارے ہاتھوں سے ہرگز تمھیں شراب نصیب نہ ہوگی۔

جنگ کے آغاز سے قبل ہند نے اپنے مخصوص غلاموں سے جنھیں وہ ساتھ لائی تھی، کہا: جو کوئی بھی تم میں سے مسلمان سرداروں یعنی محمد ﷺ، حمزہؓ، ابوبکرؓ، عمرؓ بن الخطاب اور علیؓ بن ابی طالب کو قتل کرے گا، اسی وقت آزاد کر دیا جائے گا۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک گھوڑے پر انسؓ تھے۔ جب مسلمانوں کی صفیں میدانِ جنگ میں آگے بڑھیں تو انسؓ کا گھوڑا اس طرح اچھلا کہ خود اس کی تلوار سے ٹکرایا۔ تلوار کا کچھ حصہ نیام سے باہر آ گیا۔ یہ ایک شگون تھا کہ مسلمان جنگ میں فاتح ہوں گے۔ انسؓ اس واقعہ سے اس قدر خوش ہوئے کہ اس شگون کی سب کو خبر دی۔

مسلمانوں کی صفیں جب قریشی لشکر کی طرف بڑھیں تو اس آخری لمحے میں بھی پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ صفیں ایک مستحکم دیوار ہوتی ہیں۔ انھیں کسی قیمت پر درہم برہم نہ ہونے دینا اور انفرادی جنگ نہ لڑنا۔ اگر تم نے نظم و ضبط قائم رکھا اور صفیں نہ ٹوٹنے دیں تو فتح تمھاری ہوگی۔

باوجودیکہ بت پرستوں کی قوت اسلامی قوت سے چار گنا تھی، جنگ کے اولین لمحوں میں واضح ہوگیا کہ فتح مسلمانوں کی ہوگی۔ قریش جس سمت سے بھی حملہ کرتے انھیں مسلمانوں کی تلواروں اور نیزوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ مسلمانوں کی صفوں میں شگاف پیدا نہیں ہو رہا تھا کہ کفار کی سپاہ پہلو یا عقب میں پہنچ سکتی۔ ادھر مسلمانوں کی صفیں آہستہ مگر منظم طور پر اس طرح آگے بڑھ رہی تھیں کہ قریش کے دلوں پر وحشت طاری ہوگئی اور وہ یکبارگی پسپائی اختیار کر گئے۔

قریش کی پسپائی ان کی کوئی چال نہ تھی بلکہ وہ واقعتاً خوف زدہ ہو چکے تھے اور فرار کو ثابت قدمی پر ترجیح دے رہے تھے۔ قریش کی لشکر گاہ قریب ہی تھی۔ جب مسلمانوں نے دیکھا کہ قریش بھاگ رہے ہیں تو وہ جنگی غنائم کے حصول کے لیے دوڑے۔ قریش کی لشکر گاہ میں دوسرے اموال کے علاوہ بہت زیادہ تعداد میں اونٹ اور گھوڑے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی صفیں توڑ دیں اور مالِ غنیمت جمع کرنے کو دوڑے۔ مسلمان اس امید میں تھے کہ گھوڑوں، اونٹوں اور زر و سیم کے علاوہ قریش کے سپاہیوں خصوصاً سردارانِ قریش کو اسیر بنائیں گے اور ان سے بہت زیادہ فدیہ کی رقم وصول کریں گے۔

صفِ اول کے علمبردار علیؑ نے پکارا: کہاں جا رہے ہو؟ ممکن ہے دشمن فریب دہی کا قصد رکھتا ہو۔ پیغمبر ﷺ نے کہا تھا: نظم و ضبط ختم نہ کرنا۔

مسلمان سپاہ نے کہا: پیغمبر ﷺ نے حکم دیا تھا کہ جب تک جنگ جاری رہے گی، نظم و ضبط قائم رکھنا اور اب جب کہ جنگ ختم ہوگئی ہے، ہم فاتح ہیں، نظم و ضبط کی ضرورت نہیں رہی اور اموالِ قریش کو لوٹنے کے لیے چل دیے۔

مسلمانوں کا وہ گروہ جو ٹیلہ (عینین) پر مامور تھا، نے دیکھا کہ قریش بھاگ رہے ہیں

اور مسلمانوں نے اپنی صفیں توڑ دی ہیں تا کہ غنائم جمع کریں تو عبداللہ بن جبیر سے کہا کہ ہم بھی چلیں اور غنائم جمع کریں۔ عبداللہؓ بن جبیر نے انھیں متنبہ کیا کہ پیغمبر ﷺ کا حکم ہے کہ کیسی ہی پیش آمد کیوں نہ ہو، تم نے یہ جگہ نہیں چھوڑنی ہوگی۔ تیراندازوں نے جواب دیا کہ جب لشکرِ قریش شکست کھا چکا ہے، ہم کیوں یہاں بیٹھے رہیں؟ دوسروں کی طرح مالِ غنیمت کیوں نہ جمع کریں؟

ٹیلہ پر مامور ساری سپاہ بجز بارہ افراد کے جن میں عبداللہؓ بن جبیر بھی شامل تھے، ٹیلہ سے اتر آئی اور وہ لوٹ کے ارادہ سے قریش کی لشکر گاہ کی طرف بڑھے۔

لشکرِ قریش جب بھاگ کر اپنی لشکر گاہ کی طرف گیا تو ان کا سامنا لشکر گاہ میں موجود عورتوں سے ہوا جو لشکر کے ساتھ مکہ سے آئی تھیں۔ عربوں کی یہ رسم قدیم سے چلی آ رہی تھی کہ عورتیں میدانِ جنگ میں مردوں کے ساتھ جاتی تھیں تا کہ انھیں جوش و غیرت دلاتی رہیں اور انھیں ثابت قدمی پر مجبور کریں۔ عرب کا ایک شاعر کلثوم کہتا ہے:

جب ہم برسرِ پیکار ہوتے ہیں، ہماری عورتیں ہمیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اس وقت ان کی نگاہ مشعل کی مانند ہوتی ہے اور ہمارا خون جوش میں آجاتا ہے۔

جنگوں میں جب مردوں کی شکست یقینی ہو جاتی تھی، عورتیں جو لشکر کے ساتھ ہوتیں بالوں کو پریشان کر لیتیں، اپنے کپڑے پھاڑ لیتیں اور دشمن کی طرف دوڑتیں تا کہ اپنے مردوں کو کسی طرح دشمن کے مقابلہ میں لے آئیں۔

اس دن جنگِ اُحد میں مکہ کے لشکر کے ساتھ جو عورتیں تھیں، انھوں نے جب دیکھا کہ ان کے مرد بھاگ رہے ہیں تو ایک عورت (عمرہ بنت علقمہ) کی قیادت میں سر کے بالوں کو کھول کر اپنے لباس کو تار تار کر دیا۔ عمرہ بنت علقمہ نے پکار کر کہا: "تمھاری غیرت و حمیت کہاں چلی گئی ہے اور اگر تم ان مٹھی بھر مسلمانوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تو استقامت دکھاؤ حتیٰ کہ قتل ہو جاؤ۔"

جو مرد میدانِ جنگ میں قتل ہو جائے اس پر کوئی حرف نہیں، اس لیے کہ وہ اپنا وظیفہ انجام

دے چکا ہے اور اپنے انجام کو پہنچا۔ اسے کوئی سرزنش نہیں کر سکتا کہ کیوں فتح نہ پائی لیکن وہ مرد جو اپنے ہی طرح کے مقابل کو پیٹھ دکھائیں اور مرنے سے خوف کھائیں وہ خیموں میں چلے جائیں اور عورتوں کی جگہ لیں، بچوں کی نگہداری کریں، غذا پکائیں۔ تم خیموں میں جاؤ، خیموں کی نگہداری کرو۔ ہم عورتیں میدانِ جنگ میں جائیں گی اور دشمن سے برسرِ پیکار ہوں گی۔

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس دن مسلمانوں نے لشکر قریش کے ۹ علمبرداروں کو قتل کیا اور یہ ۹ افراد قبیلہ عبدالدار سے تھے۔ عمرہ بنت علقمہ جحی اور آخری علمبردار کی لاش کے پہلو سے علم اُٹھالیا، اس کی تلوار ہاتھ میں لی اور اسلامی سپاہ کی طرف بڑھی۔ دوسری عورتیں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ جب قریش نے یہ دیکھا تو مسلمانوں پر پلٹ پڑے۔

قریش کا یہ حملہ قطعی غیر متوقع تھا، اس لیے کہ مسلمانوں کے تصور میں قریش کو مکمل شکست ہو چکی تھی۔ مسلمان اس غیر متوقع حملہ کے لیے تیار نہیں تھے، اپنی ترتیب ختم کر چکے تھے۔ صفوں کو توڑ کر مالِ غنیمت کے پیچھے جا چکے تھے۔

جب قریش نے حملہ کیا تو مسلمانوں نے اپنی صفیں درست کرنے کی کوشش کی، لیکن ان حالات میں یہ ممکن نہ تھا۔ قریش اس تیزی سے پلٹے کہ مسلمانوں کی صفیں دوبارہ نہ بن سکیں۔

خالد بن ولید کے سوار دستہ نے ابھی تک جنگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ میدانِ جنگ کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ قریش کے تعاقب میں مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ گئی ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ سپاہ قریش عورتوں کے غیرت دلانے پر پلٹ آئی ہیں اور مسلمان اب انفرادی جنگ میں الجھ گئے ہیں۔ تب خالد بن ولید نے موقع غنیمت جانا اور مسلمانوں کے عقب پر حملہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ عبداللہؓ بن جبیر اور دوسرے گیارہ تیر اندازوں نے خالد بن ولید کی راہ روکنے کی کوشش کی، مگر ناکام ہوئے اور بارہ کے بارہ افراد قتل (شہید) ہو گئے۔

خالد بن ولید مسلمانوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ اب سامنے سے قریش کا دباؤ اور عقب سے ان کے سواروں کا حملہ۔ عمرہ بنت علقمہ ابھی تک علم اُٹھائے دوسری عورتوں کے ساتھ مردوں کو جنگ پر اکسا رہی تھی۔ ایک سیاہ فام غلام جس کا نام وحشی تھا، ہند کے اعلان کے

مطابق محمد ﷺ کو میدانِ جنگ میں ڈھونڈ رہا تھا، تاکہ آپ کو قتل کر کے آزادی حاصل کر لے۔ وہ محمد ﷺ تک تو نہ پہنچ سکا اور اسی طرح ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کو بھی نہ ڈھونڈ سکا لیکن حمزہؓ کے قریب پہنچ گیا۔ جب ان کا تلوار چلانے کا انداز دیکھا تو اسے جرات نہ ہوئی کہ ان کے نزدیک آئے حتیٰ کہ خالد بن ولید اسلامی لشکر کے عقب پر حملہ آور ہوا۔ علیؓ، حمزہؓ اور عمرؓ جو سپاہ قریش کے خلاف شمشیر زنی کر رہے تھے، فوری واپس پلٹے کہ خالد کے سواروں کی راہ روکیں۔ اس وقت حمزہؓ کی پیٹھ وحشی کی طرف ہو گئی۔ وہ فوری ان تک پہنچا اور اس طرح نیزہ مارا کہ نیزہ کی نوک سینہ کے پار ہو گئی۔ جب ہند زوجہ ابوسفیان نے سنا کہ حمزہؓ کو وحشی نے قتل کر دیا، اسی وقت اس نے نہ صرف اسے آزاد کیا، بلکہ وہیں میدانِ جنگ میں ہاتھوں اور کانوں کا زیور بھی اُتار کر اسے دے دیا۔

خالد بن ولید کے حملے سے مسلمانوں کا شیرازہ کلی طور پر بکھر گیا، لیکن ان میں ابوبکرؓ، عمرؓ بن الخطاب، علیؓ بن ابی طالب، ابودجانہؓ اور کچھ دوسروں نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کو گھیرے میں لے کر ایک چھوٹی سی صف ترتیب دے لی، تاکہ دشمن کے سوار جو ہر طرف سے حملہ آور ہو رہے تھے، ان کا سامنا کر سکیں۔

محمد ﷺ نے اپنے اردگرد والوں سے کہا: یہ جگہ سواروں کے حملہ کے لیے موزوں ہے۔ اگر کوہ (احد) پر پہنچ جاؤ تو سواروں کے حملہ سے محفوظ ہو جاؤ گے اور وہاں ہم امن میں ہو جائیں گے۔ بعد میں محمد ﷺ نے مسلمانوں کی بے انضباطی پر اظہار افسوس کیا۔ فرمایا: میں نے کہا تھا کہ صفوں کو مت توڑنا اور ٹیلہ والے تیر اندازوں کو متنبہ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو تمھیں وہاں سے نہیں ہلنا۔ لیکن آج مسلمانوں نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا، اس لیے میں نہیں سمجھتا ہمیں جنگ بدر کی سی فتح حاصل ہو۔

ان مسلمانوں کے علاوہ جو محمد ﷺ کے گرد حصار باندھ چکے تھے، سبھی مسلمان دونوں اطراف کے حملے کے نتیجے میں متفرق ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران کی آیت ۱۴۳ میں فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

"قبل اس کے کہ تمھیں موت کا سامنا ہوتا، تم (میدانِ جنگ میں) مرنے کی تمنا کرتے تھے۔ لیکن جب تمھیں موت سامنے نظر آئی تو تم دور سے تماشا کرتے رہے"۔

خداوند نے اس آیت اور آل عمران کی دوسری آیتوں میں مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیا اور ان کے جنگِ اُحد سے فرار پر سرزنش کی اور چونکہ (آگے ذکر آئے گا) مشہور کر دیا تھا کہ محمد ﷺ قتل کر دیے گئے ہیں، اسی سورت کی آیت ۱۴۴ میں فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ "اور نہیں ہے محمدؐ مگر ایک پیغمبر اور اس سے قبل دوسرے پیغمبر بھی تھے جنھوں نے وفات پائی اور اگر یہ پیغمبر فوت ہو جائے یا قتل ہو جائے تو کیا تم دین سے روگردان ہو جاؤ گے اور جنگ میں پسپائی کرو گے؟ ہر کوئی جو دین سے روگردانی کرے گا مرتد ہو جائے گا اور خدا کا کچھ نقصان نہیں ہوگا بلکہ اسی کا اپنا ہی نقصان ہوگا"۔

محمد ﷺ اور ان کے جگری فدا کار، خالد بن ولید کے سواروں کے مقابل مزاحمت کر رہے تھے، خود کو اس کی جگہ پہنچانے میں کامیاب ہو گئے کہ خالد بن ولید کے سوار بے اثر ہو کر رہ گئے۔

قریش کے دو جنگجو جن میں سے ایک عبداللہ بن قمیہ تھا، ایک پتھر کی اوٹ میں کمین لگائے بیٹھے تھے اور کمان فلاخن سے پتھر پھینک رہے تھے۔ عبداللہ بن قمیہ کا ایک پتھر پیغمبر اسلام ﷺ کے چہرے پر لگا اور آپ ﷺ کا دانت شہید ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس حال میں محمد ﷺ اور آپ کے مددگار پہاڑ کے اوپر جا رہے تھے تو محمد ﷺ ایک گڑھے میں گرے اور زخمی ہو گئے۔

خالد بن ولید اور اس کے کچھ سوار پیادہ ہو کر تعاقب میں آگے بڑھے، تاکہ محمد ﷺ پر کاری وار کر دیں۔ نیچے سے بقایا سواروں نے تیر اندازی شروع کر دی۔ یہی موقع تھا جب عبداللہ بن قمیہ نے محمد ﷺ کے قتل کی خبر اڑا دی۔ اس نے جو پتھر محمد ﷺ کے چہرہ مبارک پر لگتے دیکھا اور پھر فوراً بعد آپ ﷺ کو گڑھے میں گرتے دیکھا تو اس نے پہاڑ سے نیچے اتر کر

پکارا "محمد ﷺ قتل ہو گیا"۔ اس خبر سے مسلمان مایوس ہوئے اور جو ابھی تک متفرق حالت میں لڑائی جاری رکھے ہوئے تھے، اس سے بھی فرار اختیار کیا۔

علیؑ بن ابی طالب اور عمرؓ بن الخطاب نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کو گڑھے سے نکالا۔ علیؑ دوڑ کر نزدیک ہی ایک چشمہ سے ڈھال میں پانی لائے، محمد ﷺ کے سر پر ڈالا اور آپ کے سر سے خود اُتار دیا۔

تھوڑی دیر میں خالد اور اس کے ساتھی جو اب پیادہ تعاقب کر رہے تھے، ان کے سر پر پہنچ گئے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے خالد ان کے ساتھ نہیں تھا۔ خالد بن ولید کے ساتھی جو پیادہ ہو کر تعاقب کر رہے تھے تقریباً ایک سو کے قریب تھے۔ ان ایک سو افراد نے بارہ اور بعض روایت کے مطابق چودہ مسلمانوں پر جنھوں نے محمد ﷺ کو حصار میں لیا ہوا تھا، حملہ کر دیا۔

یہ چودہ افراد صف بستہ ہو کر لڑ رہے تھے کہ دشمن ان کے عقب میں نہ پہنچ سکے لیکن پہاڑ پر پہنچنے کے بعد وضع کچھ اس طرح تھی کہ صف کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان بارہ یا چودہ افراد میں سے چار محمد ﷺ کی حفاظت پر مامور ہوئے اور بقایا آٹھ یا دس افراد حملہ روکنے کے لیے بڑھے۔

وہ چار افراد بھی لڑ رہے تھے مگر موجودہ حالت میں وہ محمد ﷺ سے دور نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے کہ محمد ﷺ زخمی تھے اور اگر چھوڑ دیے جاتے تو جلد ہی قتل کر دیے جاتے۔ یہ چار افراد علیؑ، عمرؓ، انسؓ اور ابودجانہؓ تھے۔ علیؑ، عمرؓ، انسؓ بغیر توقف کے شمشیر چلا رہے تھے۔

جنگِ اُحد کے وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ چاروں افراد صرف خود پہنے ہوئے تھے اور زرہ زیب تن نہیں تھی۔ اس پر حیران نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ زرہ ایک لباس تھا کہ انسان پہن کر بوجھل ہو جاتا تھا اور عرب کے گرم علاقہ میں خصوصاً شمشیر چلانے میں آسانی محسوس نہیں کرتا تھا۔

جو زخم ان چاروں کو لگے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زرہ پوش نہیں تھے ورنہ اتنے زیادہ زخم ان کو نہ لگتے۔ جنگِ اُحد مارچ کے وسط میں شروع ہوئی تھی یعنی ہنوز بہار کا موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ فصل بہار ۲۱ مارچ سے شروع ہوتی ہے مگر مدینہ کی ہوا سردیوں کے ان آخری دنوں میں بھی گرم تھی۔ زرہ گرم ہو کر اذیت دیتی تھی۔

لشکر قریش کے جنگجوؤں کو علم تھا کہ ان چار افراد کو قتل کر دیں تو محمد ﷺ کو قتل یا اسیر کیا جاسکتا ہے، لہٰذا ان چاروں (علیؓ، عمرؓ، انسؓ، ابودجانہؓ) پر بہت زیادہ دباؤ ڈال رہے تھے۔ ابودجانہؓ، علیؓ، عمرؓ اور انسؓ کے پائے کے شمشیر زن نہیں تھے، لہٰذا فرط خستگی سے ان کے ہاتھ نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ اپنے فرض کی تکمیل میں محمد ﷺ کے سامنے کھڑے ہو گئے، تاکہ آپ ﷺ کی حفاظت میں ڈھال بن جائیں۔ مکہ کے لشکریوں نے اس قدر تیر چلائے کہ چند منٹوں میں ابودجانہؓ کی پشت تیروں سے اس طرح پُر ہو گئی کہ کوئی جگہ خالی نہ رہی لیکن وہ خوش تھے کہ تیر ان کی پیٹھ میں لگ رہے ہیں اور محمد ﷺ محفوظ ہیں۔

ابودجانہؓ جلد ہی زمین پر گرے اور جان دے دی۔ ابودجانہؓ کے بعد انسؓ کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اس قدر نیزہ اور تلوار کے زخم ان کے چہرے پر تھے کہ کوئی نہ پہچان سکا کہ وہ کون ہے (کہتے ہیں کہ وقت دفن کوئی پہچان نہ سکا)۔ ان کی بہن نے ان کو کانوں سے پہچانا کہ یہ اس کا بھائی ہے۔

اب محمد ﷺ کی حفاظت کے لیے صرف دو افراد علیؓ اور عمرؓ رہ گئے تھے۔

علیؓ سرتاپا خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تمام بدن سے خون رس رہا تھا۔

عمرؓ چوڑے سینے اور بلند قامت کے مالک تھے۔ لڑائی کے دوران کبھی کبھی نعرہ زن ہوتے اور مسلمانوں کی رگِ شجاعت کو چھیڑنے کے لیے رجزیہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔ محمد ﷺ کی حالت اب بہتر ہو گئی تھی (آپ ﷺ دانت شہید ہونے اور گڑھے میں گرنے کی وجہ سے زخمی تھے اور کمزوری محسوس کر رہے تھے) عمرؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص سے تیر کمان لے کر دشمن پر تیر اندازی شروع کر دی۔

یہ چند مسلمان جو ایک سو مشرکین کے سامنے سینہ سپر تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ محمد ﷺ کی حالت اب بہتر ہو گئی ہے، آپ ﷺ اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں تو خوشی سے اپنے زخموں اور تھکاوٹ کو بھول گئے اور پہاڑ سے واپس کچھ فاصلے پر پھر صف بستہ ہو گئے۔ یہ چھوٹی سی صف مثلِ دیوار آگے بڑھنے لگی اور مکہ کے لشکر پر حملہ شروع کر دیا۔ ایک سو مشرکین حملہ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے لگے۔

جنگِ اُحد کے واقعات میں سے یہ واقعہ توجہ کا طالب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شجاعت نام کی چیز علیؓ، عمرؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص کے حصے میں بہت زیادہ آئی تھی۔ انھوں نے ایک سو افراد کا مقابلہ کر کے انھیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اگر محمد ﷺ کے گرد جمع افراد کی تعداد چودہ ہی مان لی جائے تو انسؓ اور ابودجانہؓ کی شہادت کے بعد بارہ افراد رہ گئے تھے اور اگر کل تعداد بارہ شمار کریں تو دس افراد نے صف بنائی اور حملہ کر کے ایک سو افراد کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک سو افراد انتہائی دباؤ کے باعث پسپا ہوئے، وگرنہ جنگ میں جس سپاہ کا پلہ بھاری ہو وہ جانتی ہوتی ہے کہ تھوڑی سی استقامت سے دشمن کے سپہ سالار کو قتل یا اسیر کر لیں گے لہٰذا وہ لڑائی سے پسپائی یا کنارہ کشی اختیار نہیں کرتی۔

بہر حال یہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ ان ایک سو افراد کا کماندار خالد بن ولید تھا اور خالد جانتا تھا کہ جنگ میں سپہ سالار کا قتل یا اسیر ہونا کتنا فیصلہ کن اور اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ سو افراد محمد ﷺ کی گرفتاری یا قتل کی کوشش میں مارے بھی جاتے تو تعجب نہ ہوتا۔ یہ بغیر وجہ کے نہیں کہ ابوسفیان نے جنگ کے خاتمہ پر کہا: ”میں نے ہرگز ان جیسے لوگ نہیں دیکھے جو جنگ کی آخری گھڑیوں میں محمد ﷺ کے گرد حصار کیے ہوئے تھے۔ ان کی وفاداری اور فدا کاری ان ایک سو افراد کی نسبت مثال نہیں رکھتی۔“

ان دس یا بارہ افراد نے جنگ کی آخری گھڑیوں میں، جب پیغمبرِ اسلام ﷺ مجروح ہوئے فوق العادہ قوت و شہامت کا مظاہرہ کیا اور ان نازک لمحات میں محمد ﷺ کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہے۔ مارچ کے وسط میں دن اتنے طولانی نہیں تھے جس وقت ان دلیر مجاہدین نے چھوٹی سی صف بنا کر مکہ کے لشکریوں کو پسپائی پر مجبور کیا تو خورشید اس وقت کوہ اُحد کی مغربی چوٹی کے نزدیک تھا اور دن اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو گئی اور مکہ کے لشکریوں نے پھر تجدید حملہ کی جرات نہ کی تھی۔

اس وقت پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دو بیٹیاں فاطمہؓ اور ام کلثومؓ اپنے والد کے پاس آئیں۔

اسلامی مؤرخوں نے کبھی کبھی واقعات رقم کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا اور تاریخ و

مکان کا ذکر چھوڑ گئے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگِ اُحد کی صبح مسلمانوں کی کچھ عورتیں لشکرِ اسلام کے ساتھ تھیں۔ ان عورتوں کے ساتھ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دونوں بیٹیاں بھی تھیں۔

فاطمہؓ زوجہ علیؓ بن ابی طالب تھیں اور ام کلثومؓ عثمانؓ کی زوجہ تھیں۔ عثمانؓ کا جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، رقیہؓ کی وفات کے بعد ام کلثومؓ کو زوجیت میں لے آئے تھے۔ تاریخ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ جب لشکرِ اسلام کے پاؤں اُکھڑے اور وہ منتشر ہوا تو یہ عورتیں کہاں چلی گئی تھیں۔ جب کہ خاتمہ جنگ پر پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دونوں بیٹیاں والد گرامی کے حضور پہنچ گئیں۔

فاطمہؓ، والد محمد ﷺ کے پاس گئیں کہ آپ ﷺ کے زخموں پر پٹی باندھیں۔ لیکن آپ ﷺ نے علیؓ جو کہ خون میں لتھڑے ہوئے تھے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''فاطمہ! جاؤ جا کر علیؓ کے زخموں پر پٹی باندھو۔ اسے تیمارداری کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہے''۔ جب ابوعبیدہ لشکرِ اسلامی کا جراح علیؓ تک پہنچا تو مشاہدہ کیا کہ علیؓ کو اسّی زخم آئے ہیں تو کہا: ''علیؓ! مجھے آپ کو سر سے پیر تک باندھنا پڑے گا اور چارپائی پر ڈال کر مدینہ لے جانا ہوگا۔ میں نے اپنی تمام عمر میں نہیں دیکھا کہ ایک شخص نے جنگ میں اتنے زخم اُٹھائے ہوں۔ میں حیران ہوں آپ کیسے ثابت قدم رہے اور لڑائی جاری رکھی''۔

عمرؓ کو جنگِ اُحد میں اکیس زخم آئے اور سعدؓ بن ابی وقاص کو بارہ زخم آئے تھے۔

ہنوز آفتاب غروب نہیں ہوا تھا کہ ہند زوجہ ابوسفیان میدانِ کارزار میں گئی اور پیغمبر ﷺ کے چچا حمزہؓ کی لاش کو ڈھونڈ نکالا۔ پیٹ اور سینہ چھری سے چاک کیا اور جگر نکال کر اس کا کچھ حصہ کھا گئی۔ اسی وجہ سے اس عورت کو ''ہند جگر خوار'' کہا جاتا ہے۔ ہند نے حمزہؓ کا کلیجہ (جگر) چبانے کے بعد ان کے اور دوسرے مسلمانوں کے جو میدانِ جنگ میں مردہ پڑے تھے، ناک، کان کاٹ کر ایک ہار تیار کیا جسے گلے میں ڈال کر میدان میں رقص کیا۔

قریش کی ایک عورت جس کا نام سلافہ بنت سعد تھا، میدانِ جنگ میں گئی اور جستجو کر کے ایک مجاہد کا جسد ڈھونڈ نکالا جس نے جنگِ بدر میں اس کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ اس عورت نے اس نعش کا سر کاٹ لیا اور کہا میں اس کا گوشت پوست اُتار دوں گی اور جب کھوپڑی خشک ہو

جائے گی تو جب تک زندہ ہوں اس میں پانی پیا کروں گی۔ میرے بیٹے کے قاتل کی کھوپڑی میرا پانی پینے کا برتن ہوگا۔

میدانِ جنگ میں لشکرِ مکہ کی واپسی کے بعد جب پیغمبرِ اسلام ﷺ کی نگاہ حمزہؓ کی لاش پر پڑی اور دیکھا کہ شکم اور سینہ چاک کر کے جگر نکالا گیا ہے ناک اور کان کٹے ہوئے ہیں تو آپ ﷺ بہت غمزدہ ہوئے اور فرمایا: اس کے بعد جو بھی جنگ ہمارے اور کفار کے درمیان ہوگی، میں بت پرستوں کے تین مقتولین کا مُثلہ بناؤں گا۔ اسی وقت وحی نازل ہوئی۔ وہ آیت سورہ نمل کی ۱۲۶ویں آیت ہے:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ﴾

''اگر تم چاہتے ہو کہ دشمنوں کو موردِ عقوبت قرار دو تو اسی پر جتنی تمھیں عقوبت پہنچائی گئی ہو اکتفا کرو لیکن اگر دشمنوں کو عقوبت نہ پہنچاؤ اور صبر اختیار کرو تو البتہ صابرین کے لیے بہتر ہے''۔

اس آیت کے نزول پر پیغمبرِ اسلام ﷺ نے کہا: یارب! میں نے عقوبت سے صرف نظر کیا اور صبر کروں گا''۔

لشکرِ اسلام کے ستر افراد شہید ہوئے جن میں سے چونسٹھ افراد انصار سے تھے اور چھ مہاجرین تھے۔ قبل ازیں کہ آفتاب غروب ہو، ابوسفیان میدانِ جنگ میں مسلمان شہدا کی میتوں کے پاس آیا اور پکارا: ''آیا محمد ﷺ زندہ ہے یا نہیں''۔ ابوسفیان کے اس سوال کی وجہ جنگ کے دوران پھیلنے والی وہ خبر تھی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں جو کہ مسلمانوں کی بددلی کا باعث ہوئی تھی۔ یہ طے ہوا کہ کوئی بھی یہ نہ کہے کہ محمد ﷺ زندہ ہیں لیکن عمرؓ تاب نہ لائے اور جواب دیا: ''ہاں محمد ﷺ زندہ ہیں''۔

ابوسفیان نے جواب سن کر بلند آواز میں کہا: ''اے محمد ﷺ! جنگِ بدر میں ہمارے ستر افراد قتل ہوئے تھے، آج اس جنگِ اُحد میں ہم نے تمھارے ستر افراد کو قتل کر دیا، لہٰذا ہمارا تمھارا حساب برابر ہوا۔ ویسے اگر تم ہم سے جنگ کرنا چاہتے ہو تو اگلے سال بدر کے تجارتی میلہ میں اسی جگہ برسرِ پیکار ہوں گے''۔ اتنا کہنے کے بعد ابوسفیان جو مغرور دکھائی دے رہا تھا،

میدانِ جنگ سے پلٹا اور اپنے لشکر کے ساتھ مکّہ کو کوچ کر گیا۔

جب دشمن کی سپاہ میدانِ جنگ سے دُور ہوگئی تو پیغمبرِ اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کی نعشیں دفن کی جائیں۔ ایک مرتبہ پھر اسلامی مؤرخوں نے تاریخ رقم کرنے میں کوتاہی کی ہے اور یہ تصریح نہیں کی آیا جب آفتاب غروب ہو رہا تھا، اُسی وقت مسلمانوں نے نعشیں دفن کرنی شروع کر دی تھیں (اس طرح وہ رات گئے تک تدفین میں مشغول رہے ہوں گے) یا دُوسرے دن تدفین کا قصد کیا۔ دفن کے لیے کوہِ اُحد کے دامن میں ہی جگہ کا انتخاب کیا گیا۔ عربوں کی رسم تھی کہ وہ میت کو دفن سے قبل نہلاتے تھے تاکہ طاہر ہو جائے۔

یہاں محمد ﷺ نے فرمایا: یہ میدانِ جنگ میں مارے گئے ہیں، اس لیے شہید ہیں۔ مرتبہ شہادت نے ان کی تطہیر کر دی ہے۔ سیدھے بہشت میں چلے گئے ہیں۔ انھیں احتیاجِ غسل نہیں ہے۔ محمد ﷺ ہر میت کے لیے جب قبر میں اُتاری جاتی، دعا مانگتے اور آخری میت کے دفن کے بعد آپ ﷺ نے شہدا کی شان بیان فرمائی۔



جنگِ اُحد اور فوجی نقطۂ نگاہ

بعض اسلامی مؤرخین نے لکھا ہے کہ جنگِ اُحد میں محمد ﷺ اور مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی اور یہی نظریہ آج تک زیرِ مطالعہ ہے۔

ہم اگر کسی جنگی ماہر کے سامنے "شکست ہونے" کا سوال اُٹھائیں تو اس کی وضاحت یوں ہوگی: "اگر دشمن کا لشکر حریف کی مملکت پر قبضہ کر لے اور اس کی فوجی قوت کو نابود کر کے رکھ دے"۔ وہ قوم جس کی مملکت پر قبضہ ہوا اور فوجی طاقت نابود ہوئی، اسے شکست خوردہ کہا جائے گا۔

پس ایک قوم کو شکست خوردہ تسلیم کرنے سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے: ایک یہ کہ ملک پر دشمن کا قبضہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ اس ملک کی فوجی قوت نابود ہو جائے۔

جنگِ اُحد میں مکّہ کا لشکر نہ تو مدینہ پر ہی قبضہ کر سکا اور نہ ہی اسلامی لشکر کو تباہ کر سکا۔ اگرچہ اسلامی لشکر دورانِ جنگ میں متفرق ہو گیا تھا لیکن دوسرے ہی روز مختلف گروہ واپس محمد ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور جب آپ ﷺ نے مدینہ مراجعت کی، آپ ﷺ کے ساتھ ایک منظم لشکر موجود تھا۔ میرے عقیدے کے مطابق محمد ﷺ کو جنگِ اُحد میں شکست نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے کامیاب دفاع کیا۔ ہاں اس جنگ میں اسلامی لشکر کو ایک ناگوار آزمائش کا سامنا ضرور ہوا۔

قرآن میں خداوند نے جنگِ اُحد کی بابت مسلمانوں کی پوزیشن کو ایک قطعی شکست نہیں کہا۔ جنگِ اُحد سے متعلقہ آیات جو کہ سورۃ آل عمران کا حصہ ہیں تسلی بخش ہیں۔ خداوند نے سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۹ میں فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ "تم سست نہ ہو جاؤ اور غمزدہ نہ ہو اور اگر تم مومن رہے تو تمھی غالب رہو گے"۔

اور آیت ۱۴۰ میں فرمایا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ...... الخ ﴾ ”اگر تمھیں (اُحد میں) زخم لگے ہیں تو (بدر میں) قوم قریش کو بھی ایسے ہی زخم لگ چکے ہیں“۔

آیت ۱۴۱ میں فرمایا:

﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ ”خداوند ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں پاک کرتا ہے (یعنی جنگِ اُحد کا صدمہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے تھا) لیکن جب صدمہ کفار پر آتا ہے تو وہ انھیں نابود کرنے کے لیے ہوتا ہے“۔

اسی سورت کی آیت ۱۵۹ میں خداوند نے ان مسلمانوں کی بابت جو میدانِ جنگ سے فرار ہوئے تھے ترحم کا اظہار کیا ہے اور اپنے پیغمبر ﷺ سے کہا ہے ”تو بھی انھیں بخش دے“۔ یہ موضوع اس آیت میں اس طرح ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴾ ”اے محمد ﷺ! رحمتِ خداوندی تمھارے شاملِ حال ہونے کے سبب تم نے اُن سے خوش رُوئی برتی (جنگِ اُحد سے بھاگنے والوں سے) حالانکہ اگر تم سنگدل و تندخُو ہوتے تو یہ تمھارے اردگرد سے چھٹ جاتے اور کوئی بھی تمھارے اردگرد باقی نہ رہتا۔ اے محمد ﷺ! ان کو (بھاگنے والوں کو) معاف کردو اور ان کے لیے خداوند سے مغفرت مانگو اور ان سے مشورہ کرو......۔

خداوند نے جیسا کہ ان آیات اور دوسری آیات میں ذکر کیا ہے، جنگِ اُحد کو شکست نہیں کہا، تاکہ بھاگنے والوں کے متعلق رحم کا اظہار ہو اور محمد ﷺ کو تلقین کی کہ انھیں اپنے سایۂ عفو میں لے لیں۔

جنگِ اُحد کو آج اگر ایک فوجی ماہر کی نگاہ سے پرکھا جائے تو مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی بلکہ مسلمان اس جنگ میں فاتح ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ابوسفیان کے حملہ آور لشکر کو کامیابی

کے ساتھ واپسی پر مجبور کردیا اور یہ جنگی نتیجہ ایک فتح مندی ہے۔ لشکرِ قریش کا جنگِ اُحد میں اپنے مقصود کو نہ پاسکنا کئی ایک وجوہ کی بنا پر ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

جماعتِ قریش اس لیے حملہ آور نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں سے صحرا میں نبرد آزما ہو، بلکہ وہ مسلمانوں کو اچانک گھیر لینا چاہتے تھے، تاکہ منافقوں اور یہودیوں کی مدد سے انھیں تباہ کردیں۔ لشکرِ قریش نے جب مدینہ کا چکر کاٹ کر کوہِ اُحد کے دامن میں کیمپ لگایا تو ان کا خیال تھا کہ مسلمان شہر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ انھیں علم تھا کہ مسلمان مردوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لہٰذا وہ شہر سے باہر نکلنے کی جرأت کرنے کی بجائے محصور ہوکر لڑنے کو ترجیح دیں گے۔

مسلمانوں کے مدینہ سے باہر آنے پر ابوسفیان اور اس کا لشکر حیرت زدہ تھا کیوں کہ وہ سمجھے بیٹھے تھے کہ مسلمان محصور ہوکر لڑیں گے اور وہ یہودیوں اور منافقوں کی مدد سے انھیں تباہ کردیں گے۔

یاد رہے کہ منافقین خود ہی اسلامی لشکر سے علیحدہ ہوکر مدینہ واپس آگئے تھے اور یہودیوں کو خود محمد ﷺ نے بڑی ملائمت سے واپس بھجوا دیا تھا۔ پس مسلمانوں کے علاوہ لشکر میں کوئی دوسرا عنصر نہیں تھا۔ اگرچہ مسلمان سپاہ کی تعداد کفار کے مقابلے میں بہت کم تھی، لیکن اس کے عوض وہ وحدتِ عقیدہ رکھتے تھے اور تاوقتیکہ حصول غنیمت کی فکر میں نہ پڑے، انھوں نے خوب جنگ کی اور قریش کے لشکر کو ہزیمت پہنچائی۔ اگر قریش کی عورتیں اپنا کردار اس شدت سے ادا نہ کرتیں تو ابوسفیان کا لشکر مکمل شکست سے دوچار ہوچکا تھا۔

دوسری وجہ کہ لشکرِ قریش اپنی کثرت کے باوجود کیوں فتح نہ حاصل کرسکا، یہ تھی کہ رات ہوگئی تھی اور عرب اندھیرا چھا جانے سے پہلے ہی جنگ روک دیا کرتے تھے۔

تیسری وجہ ابوسفیان کی حالات سے عدمِ واقفیت تھی۔ قریش کا لشکر آج کی اصطلاح کے مطابق نظامِ جاسوسی نہیں رکھتا تھا اور وہ اسلامی لشکر کے ارادوں اور عمل سے صحیح طور پر مطلع نہیں تھا۔ اس کے برعکس محمد ﷺ نے جاسوسی کا باقاعدہ نظام قائم کیا ہوا تھا اور آپ ﷺ دشمن کے ارادوں سے مطلع تھے۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ ابوسفیان ایک خبطی انسان تھا۔ اس دن بھی اس نے ایک بہت بڑے

خبط کا مظاہرہ کیا جس کی ایک جنگی سوجھ بوجھ رکھنے والے فرد سے توقع نہیں کی جاسکتی اور یہ قابل معافی نہیں تھا۔ اگر ابوسفیان یہ دیوانگی نہ کرتا اور اپنے لشکر کو اس رات یا دوسرے دن تک واپسی کا حکم نہ دیتا تو مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا سکتا تھا۔

ابوسفیان کے خبطی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ جب لشکر کے ساتھ کوہ اُحد کے دامن سے کوچ کر کے راستے میں ایک مقام روحا پر پہنچا تو بہت پشیمان ہوا اور ارادہ کیا کہ وہاں سے پلٹے اور محمد ﷺ اور مسلمانوں کا قصہ ایک ہی بار تمام کردے۔

محمد ﷺ کے ایک موثر اطلاعاتی نظام کی موجودگی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ محمد ﷺ کو ابوسفیان کی پشیمانی، امکانی واپسی اور تجدیدِ جنگ کے ارادے کی اطلاع بروقت مل گئی تھی۔ اس جگہ ہم یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ جنگِ اُحد کے دوسرے دن مسلمان اکٹھے ہو چکے تھے، اور جس وقت وہ مدینہ لوٹے ان کی صفیں ویسے ہی منظم تھیں جیسے میدانِ جنگ کی طرف جاتے ہوئے تھیں۔

مسلمانوں کو مدینہ لوٹ آنے کے ایک رات اور ایک دن بعد خبر ملی کہ مکّہ کا لشکر واپسی اور تجدید جنگ کا قصد رکھتا ہے۔ محمد ﷺ کی رُوح اور ایمان اس قدر قوی تھے کہ لشکرِ مکّہ کی واپسی اور تجدیدِ جنگ کی خبر سے قطعی ہراساں نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ جنگ کے لیے مدینہ سے کوچ کریں۔ تمام مسلمان جنھوں نے جنگِ اُحد میں شرکت کی تھی حتیٰ کہ زخمی بھی کوچ پر آمادہ ہو گئے۔

عمرؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص شدید زخمی ہونے کے باوجود لشکر کے ہمراہ ہو لیے۔ لشکرِ اسلامی کے جراح نے علیؑ کو اجازت نہ دی اور کہا: ”اے علیؑ! اگر آپ لشکر کے ساتھ گئے تو پیش تر اس کے کہ آپ مدینہ کے گلی کوچوں سے نکلیں زخموں کی وجہ سے آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔“

محمد ﷺ اپنے لشکر کے ساتھ حمرا الاسد تک گئے۔ وہاں ابوسفیان کے لشکر کے منتظر ہوئے، لیکن ابوسفیان جس نے واپسی اور تجدیدِ جنگ کا ارادہ کیا تھا، متذبذب ہوا اور بالآخر مکّہ واپسی کو ترجیح دی۔ مسلمان یہ اطمینان ہونے کے بعد کہ اب ابوسفیان واپس نہیں آئے گا، مدینہ لوٹ آئے۔

پیش تر اس کے کہ لشکرِ اسلام صحرا سے لوٹتا، وحشی یعنی وہ غلام جس نے حمزہؓ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچا کو قتل کیا تھا، ابوسفیان کے لشکر سے بھاگ کر محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حمزہؓ کے قتل کا اعتراف کیا۔ محمد ﷺ نے اسے کوئی سزا نہ دی، اس لیے کہ آپ بڑے رحیم اور نرم دل تھے۔ اس غلام سے جو اَب آزاد ہو چکا تھا، صرف اتنا کہا کہ میرے سامنے اور میرے قریب نہ آیا کرو۔ وحشی نے اس کے بعد محمد ﷺ کو اپنی شکل نہ دکھائی بلکہ قتل حمزہؓ کی تلافی کے لیے محمد ﷺ کے دشمنوں میں سے چند افراد کو قتل کیا، جن میں مسیلمہ کذاب بھی شامل تھا۔ مسیلمہ نے پیغمبری کا دعویٰ کر رکھا تھا۔

مسلمان جنگِ اُحد کو ایک تلخ آزمائش سمجھتے تھے، اس کو اپنی شکست نہیں گردانتے تھے۔ لیکن مدینہ کے یہودی یہی کہتے کہ محمد ﷺ کو جنگ اُحد میں شکست ہوئی ہے اور یہ طعن بھی کرتے کہ اگر محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ﷺ ہوتے تو شکست نہ اُٹھاتے۔ اس موقع پر آیت نازل ہوئی جو اَب قرآن کی تیسری سورت میں ہے۔ خداوند نے آیت ۱۴۶ میں فرمایا:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ ایسے پیغمبر بھی گزرے ہیں کہ اپنے لشکر سے قوی تر لشکر سے جنگ کی اور شکست کھائی، بغیر اس کے کہ شکست سے مایوس ہوں، استقامت دکھائی اور فتح مند ہوئے اور خداوند استقامت والے اشخاص کو دوست رکھتا ہے۔

یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ محمد ﷺ کی بابت یہودیوں نے جو پراپیگنڈہ شروع کیا ہوا تھا، ختم کر دیں۔ اس آیت سے مسلمان خوش ہوئے اور ان کا ایمان و عقیدہ مضبوط ہوا۔ البتہ یہودیوں نے اپنا پراپیگنڈہ ختم نہ کیا اور ان کے زراعت پیشہ قبیلہ نے محمد ﷺ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ جب محمد ﷺ کو ان کے ارادہ کی اطلاع ہوئی تو ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا اور ان سے کہا: تمھارا ارادہ مدینہ کے قانونِ اساسی کے خلاف عمل کرنے کا ہے۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایسا ارادہ ترک کر دو تاکہ مسلمان اور یہودی اس شہر میں دوستانہ زندگی گزار سکیں۔

یہودیوں کے طائفہ نے کہا: ہم تمھارا کہنا نہیں مان سکتے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے انھیں پیش کش کی کہ تم بھی زرگروں کی طرح اس شہر کو چھوڑ دو۔ انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ محمد ﷺ نے انھیں اجازت دی کہ وہ اپنی تمام جائیداد (منقولہ) مدینہ سے لے جاسکتے ہیں۔[1]

یہودیوں نے اپنی ہر چیز، حتیٰ کہ گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بھی اُتار لیے اور ساتھ لے گئے۔ اس یہودی قبیلہ کے مدینہ سے کوچ کر جانے کے بعد فقط ایک یہودی قبیلہ مدینہ میں رہ گیا جو پیشہ کے لحاظ سے دباغ تھے۔

عمرؓ بن الخطاب اسلام کے ایک دلیر مرد اور جنگِ اُحد میں محمد ﷺ کے خصوصی محافظوں میں سے تھے۔ بعدازیں انھوں نے دس سال کی مدت میں دنیا کی تین شہنشاہیتوں کو شکست دی۔ ان کی ایک بیٹی حفصہ تھیں اور ان کے شوہر کا نام خنیسؓ تھا۔ خنیسؓ جنگِ اُحد میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئے تھے۔ اس مرد کی شجاعت کے پاس خاطر پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ان کے جنازہ کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا تھا۔ حفصہؓ کی عمر شوہر کی شہادت کے وقت بیس سال تھی۔ وہ دانش منداور شعروادب کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں، لیکن شوہر کی شہادت کے بعد غمزدہ رہنے لگی تھیں۔

عمرؓ بن الخطاب باارادہ اور راست گو آدمی تھے۔ وہ عثمانؓ کے پاس گئے اور کہا کہ میری بیٹی بیوہ ہوچکی ہے، اسے اپنے عقد میں لے لیجیے، تاکہ میری بیٹی اپنے مرحوم شوہر کا غم بھول جائے۔

عثمانؓ اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ عمرؓ بہت آزردہ خاطر ہوئے، اس لیے کہ وہ شخصیت کے لحاظ سے عثمانؓ سے برتر تھے اور خیال کرتے تھے کہ عثمانؓ خوشی سے میری پیشکش قبول کر

۱- یہ یہودی قبیلہ بنونضیر تھا جس نے نبی ﷺ کے قتل کی سازش کی۔ اللہ نے آپ ﷺ کو آگاہ کردیا، چنانچہ ربیع الاول ۴ھ میں انھیں مدینہ سے جلاوطن کردیا گیا اور وہ خیبر میں جابسے۔ [اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، ص۲۶۴]

لیں گے۔ عثمانؓ کا انکار عمرؓ کی نگاہ میں ایک توہین تھی۔[2] محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کی بات بڑے دھیان سے سنا کرتے تھے۔ عمرؓ، اُن (ﷺ) کے پاس آئے ماجرہ بیان کیا۔ بات سننے کے بعد محمد ﷺ فرمایا: ''اے عمرؓ! تمھیں رنجیدہ ہونے کا حق حاصل ہے اگر تم رضامند ہو تو میں حاضر ہوں، تمھاری بیٹی (حفصہ) سے عقد کرلوں''۔

عمرؓ بن خطاب محمد ﷺ کی اس تجویز سے اس قدر خوش ہوئے کہ محمد ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا اور عرض کی: ''اے محمد ﷺ! آج آپ ﷺ نے مجھے سعادت مند کیا ہے۔ اس کے بعد حفصہؓ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے عقد میں آگئیں اور عمرؓ بن الخطاب، محمد ﷺ کے خسر ہوئے۔



۲- عمرؓ کا اپنا بیان ہے کہ عثمانؓ کے انکار کے بعد میں نے یہی بات ابوبکرؓ سے کی مگر وہ خاموش رہے۔ پھر نبی ﷺ نے حفصہؓ کا رشتہ مانگ لیا۔ [بخاری، ۵۱۲۲م ف]

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ازواجِ مطہرات

حضرت محمد ﷺ کے نزدیکی ہم کاروں میں سے چار اشخاص ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ آپ ﷺ کے قریبی عزیز تھے۔

ابوبکرؓ، محمد ﷺ کے خسر تھے۔ ان کی بیٹی عائشہؓ محمد ﷺ کی بیوی تھیں۔

عمرؓ بن الخطاب بھی پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خسر تھے۔

عثمانؓ، محمد کے داماد تھے۔

علیؓ، پیغمبر ﷺ کے داماد تھے۔ فاطمہؓ پیغمبر ﷺ کی بیٹی ان کے حبالۂ نکاح میں تھیں۔

حفصہؓ، عمرؓ بن الخطاب کی بیٹی جب آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں تو محمد ﷺ کے گھر تین چیزیں اپنے ہمراہ لیتی گئیں: اوّل شعر پڑھنا، دوم کتابیں پڑھنا، تیسرے خوش خط لکھائی۔

صرف عائشہؓ زوجہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اور ابوبکرؓ کی بیٹی ایک ایسی عورت تھیں، جن سے محمد ﷺ نے دوشیزگی کی حالت میں نکاح کیا۔ آپ ﷺ کی باقی تمام بیویاں بیوگی یا طلاق کی حالت میں آپ کے نکاح میں آئیں۔ عائشہؓ کو حفصہؓ سے بہت انس تھا۔ گھنٹوں وہ حفصہؓ کے پاس بیٹھی رہتیں۔ ان کو کتاب پڑھتے سنتیں اور کوشش کرتیں کہ حفصہؓ کی طرح لکھنا سیکھ لیں۔

وہ لوگ جو تاریخِ اسلام سے واقفیت رکھتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ قرآن کی آیات تئیس سال تک بتدریج نازل ہوتی رہی تھیں۔ محمد ﷺ کی زندگی میں ایک جگہ جمع نہ ہوئیں، یعنی خود پیغمبرِ اسلام نے ان آیات کی جمع آوری کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔ ایک کتابی صورت میں جمع نہ کی گئیں۔ لیکن پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چند صحابہ جن میں علیؓ بن ابی طالب اور حفصہؓ بھی شامل تھیں، قرآن کی آیات کو اپنے طور پر لکھ لیا کرتے تھے تاکہ مکمل مجموعۂ آیات ان کے پاس رہے۔

محمد ﷺ اُمّی تھے۔ جس وقت وحی کے ذریعہ آیاتِ قرآنی آپ ﷺ پر نازل ہوتیں،

انھیں آپ زبان سے ادا کرتے اور جو اشخاص موجود ہوتے، ان میں سے پڑھے لکھے ان آیات کو کاغذ، کپڑے یا اونٹ کی ہڈی پر لکھ لیتے اور جو اَن پڑھ ہوتے وہ حفظ کر لیتے تھے۔

محمد ﷺ کی رحلت کے بعد خصوصاً عمرؓ بن الخطاب کے دورِ خلافت میں دنیا کی تین بڑی شہنشاہتیں تسخیر ہوئیں اور ان کی سرزمین اسلامی قلم رو میں شامل ہوئی۔ ان جنگوں میں بہت سے حافظ قرآن شہید ہو گئے۔

جب عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھیں خوف ہوا۔ مبادا تمام حفاظِ قرآن جنگوں میں شہید ہو گئے یا ویسے ہی وفات پا گئے تو قرآن کا کچھ حصہ معدوم ہو جائے اور بعد میں ممکن ہے قرآن تحریف سے دوچار ہو جائے اور کئی قرآن وجود میں آ جائیں بالکل ایسے ہی جیسے دینِ مسیحی میں متعدد انجیلیں وجود میں آ گئی تھیں۔ لہٰذا کچھ اشخاص کو مامور کیا کہ قرآنی آیات کی جمع آوری کریں۔ پھر تمام مجموعہ کو لکھ کر قرآن کے حافظوں کو سنائیں اور تصحیح کریں۔[1] عثمانؓ کے حکم کے مطابق دوسرے تمام کاغذات، پارچہ جات اور ہڈیاں جن پر آیاتِ قرآنی متفرقاً لکھی گئی تھیں ضائع کر دی گئیں۔

حضرت محمد ﷺ کی نو بیویاں تھیں۔ ان نو سے خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً نکاح کیے۔ جب تک خدیجہؓ حیات تھیں، آپ ﷺ نے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:

۱- اُمِ سلمہؓ دختر ابی امیہ	۲- سودہؓ دختر زمعہ
۳- عائشہؓ دختر ابوبکرؓ	۴- اُمِ حبیبہؓ دختر ابوسفیانؓ
۵- حفصہؓ دختر عمرؓ بن الخطاب	۶- صفیہؓ دختر حیی بن اخطب خیبری
۷- زینبؓ دختر جحش اسدی	۸- میمونہؓ دختر حارث ہلالیہ
۹- جویریہؓ دختر حارث بن مصطلق	

۱- عہدِ صدیقی میں جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہو گئے تھے لہٰذا جمع قرآن کا بنیادی کام بھی ابوبکرؓ کے حکم ہی پر زید بن ثابتؓ کی نگرانی میں انجام پایا تھا۔ [م ف]

محمد ﷺ کی نو بیویاں تھیں[۲] مگر آپ ﷺ انتہا کے باحیا شخص تھے۔ اس موضوع پر کچھ روایات ملتی ہیں۔ ان روایات میں سے ایک روایت یہ ہے کہ محمد ﷺ ایک دن مدینہ کے نخلستان میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ باغبان کھجور کے پھولوں کے ایک دستہ کو دوسرے پھولوں پر رکھ کر ہلاتا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا ایسا کیوں کر رہے ہو؟ باغبان نے جواب دیا: پھولوں کا یہ دستہ جو میرے ہاتھ میں ہے مذکر ہے اور دوسرے پھول مادہ ہیں۔ ہم مذکر پھولوں کو مادہ پھولوں پر رکھ کر ہلاتے ہیں تاکہ مؤنث پھولوں سے ان کا ملاپ ہو اور یہ بارآور ہوں۔

اس جواب سے آپ ﷺ اس قدر شرمگیں ہوئے کہ چہرے پر پسینہ نمودار ہوگیا۔ فرمایا: "یہ کام نہ کیا کرو"۔ باغبانوں نے آپ ﷺ کے فرمانے کے مطابق ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ اس سال نخلِ مادہ نے پھل نہ دیا۔ پیغمبر ﷺ نے جب یہ سنا کہ کھجوروں کے درخت پھل نہیں لائے تو اس عمل پر سے ممانعت ختم کردی لیکن خود آپ ﷺ زندگی بھر پھول لانے کے ایام میں نخلستانوں میں نہیں گئے۔

مکہ میں صرف سلافہ نے ہی ایک مسلمان مرد کے کاسۂ سر کو پانی پینے کا پیالہ نہ بنایا بلکہ دوسری عورتوں نے بھی مسلمان مرد کی کھوپڑی میں پانی پینے کا پروگرام بنایا۔

جب یہودی زرگروں کے قبیلہ (بنوقینقاع) نے مدینہ سے کوچ کیا تو ان کا ایک حصہ مکہ میں جاکر آباد ہوگیا تھا۔ اس کے بعد یہودیوں کا زراعت پیشہ قبیلہ (بنونضیر) جب جلاوطن ہوا تو ان کا بھی ایک حصہ مکہ میں جا آباد ہوا اور یہ دونوں یہودی قبیلے قریش کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے رہے۔[۳] ان دونوں یہودی قبیلوں نے مسلمانوں کے خلاف قریش سے ایک جنگی معاہدہ کیا۔ چونکہ وہ یہودی تھے اس لیے خانہ کعبہ کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہوکر قسم کھائی کہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے۔

۲- مصنف نے ازواج مطہرات زینبؓ دختر خزیمہ ہلالیہ اور ماریہ قبطیہؓ کا ذکر نہیں کیا۔ یوں نبی ﷺ نے خدیجہؓ کے بعد ۱۱ خواتین سے نکاح کیے تھے۔ (م ف)

۳- بنوقینقاع اور بنونضیر کے مکہ جا آباد ہونے کی بات بے سند ہے۔ بنوقینقاع کو اذرعات شام جلاوطن کیا گیا تھا اور بنوقریظہ خیبر جا بسے تھے۔ [اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، لاہور]

قریش نے ہر اس شخص کے لیے انعام مقرر کیا جو ایک زندہ مسلمان کو ان کے پاس پکڑ کر لائے۔ انعام اس قدر زیادہ تھا کہ بدوی قبائل مسلمان افراد کو گرفتار کرنے کی کوششوں میں لگ گئے تاکہ قریش کی تحویل میں دے کر انعام حاصل کریں۔ مکہ شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہتا تھا، اس لیے بدوی قبائل نے پروگرام بنایا کہ مدینہ کے گردونواح سے مسلمانوں کو اغوا کیا جائے۔

جنگِ اُحد کے بعد مدینہ کے جنوب میں رہنے والے ایک قبیلہ نے محمد ﷺ سے خواہش کی کہ کچھ مسلمانوں کو ہمارے قبیلہ میں بھیجا جائے، تاکہ وہ قبیلہ کے افراد کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کریں۔ محمد ﷺ نے ایک علیم و فہیم مسلمان کو جن کا نام عاصم بن ثابتؓ تھا، سات افراد کی ایک جماعت کے ساتھ اس قبیلہ میں جانے اور ان کو ہدایت کرنے پر مامور فرمایا۔ اس قافلہ کی راہ میں بدوی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی اس جماعت پر حملہ کردیا جس کے نتیجے میں کچھ مسلمان شہید کردیے گئے۔[۴]

انھوں نے ان تین افراد کو گرفتار کیا اور مکہ کی طرف کوچ کر گئے تاکہ ان کو مکہ کے اشراف کے ہاتھوں فروخت کریں۔ ان تینوں میں سے ایک (عبداللہؓ بن طارق) راہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے، کیوں کہ انھیں علم تھا کہ اگر مکہ پہنچا دیے گئے تو شدید عقوبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بدویوں نے فرار ہونے والے مسلمان کا تعاقب کیا اور اسے الرجیع کے مقام پر جالیا۔ اس نے مقابلہ کیا لہٰذا اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے گئے۔

بدوی دوسرے دو افراد (خبیبؓ بن عدی اور زیدؓ بن دثنہ) کو مکہ پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہاں انھیں معلوم ہوا کہ تمام اشرافِ مکہ ان مسلمانوں کو خریدنے کے خواہاں ہیں تاکہ انھیں ہولناک عذاب دے کر قتل کریں۔

بالآخر بدویوں نے ان دونوں کا نیلامِ عام کیا۔ نیلامی میں صفوان بن امیہ نے جو ابوسفیان کے بعد مکہ میں دوسرے نمبر پر تھا، دو مسلمانوں میں سے ایک زیدؓ بن دثنہ کو خرید لیا۔

۴- یہ سانحہ بنوہذیل کی شاخ بنولحیان کے کنویں "رجیع" کے پاس صفر ۴ھ میں پیش آیا۔ بئر رجیع مکہ اور طائف کے درمیان عسفان سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ [اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، ص ۲۶۱]

[صفوان کا باپ امیہ بن محرث غزوۂ بدر میں زید کے ہاتھوں قتل ہوا تھا] دوسرے مسلمان (خبیبؓ بن عدی) کو مکّہ کے غزوۂ بدر میں مقتول سردار حارث بن عامر کے بیٹوں کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔

اہلِ مکّہ جانتے تھے یہ دونوں ان مسلمانوں کو اذیتیں دے کر قتل کر کے لذت حاصل کریں گے، لہٰذا احتجاج کیا اور کہا: ہم نے بھی مسلمانوں سے دکھ اُٹھائے ہیں۔ ہمارے عزیز بھی جنگِ بدر واحد میں قتل ہوئے ہیں۔ ہم بھی ان کے قتل کا منظر دیکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا مکّہ کے میدان میں برسرِ عام انھیں قتل کیا جائے تا کہ ہم بھی ان کے قتل سے محظوظ ہوں۔

صفوان بن امیہ راضی ہو گیا۔ زیدؓ بن دثنہ کو مکّہ کے میدان میں برسرِ عام قتل (شہید) کر دیا گیا۔ ان کے قتل کے لیے ایک شخص نستاس کو مامور کیا گیا تھا۔

صفوان بن امیہ جب زیدؓ کی لاش کے قریب ہوا تو دیکھا کہ زید بن دثنہؓ کی لاش کو موٹی موٹی سنہری زنبوروں نے گھیر رکھا ہے اور زنبوروں کی ایک فوج نعش کے ارد گرد محوِ پرواز ہے تو وہ ڈر گیا اور کہا: اچھا رات کے اندھیرے میں جب یہ زنبوروں کی فوج چلی جائے گی میں سر تن سے جدا کر کے لے جاؤں گا۔ لیکن جیسا کہ اسلامی وقائع نویسوں نے لکھا ہے جب اندھیرا چھایا تو سیلاب لاش کو بہا کر لے گیا۔

دوسرے مسلمان قیدی کو مکّہ سے باہر تنعیم کے مقام پر لے جا کر صلیب پر میخوں میں پرو دیا گیا۔[5]

صلیب کو زمین پر لٹا کر اس قیدی مسلمان کو صلیب کے اوپر لٹایا گیا اور ہاتھوں کو بڑی بڑی میخوں سے صلیب کے ساتھ جڑ دیا۔ اس دوران وہ مسلمان مرد مسلسل کلمۂ توحید لا الہ الا اللّٰہ کا ورد کرتا رہا۔ دونوں ہاتھوں کے بعد دونوں پاؤں میں ایک بڑی میخ عمودی طور پر لگا دی گئی۔ بعد ازاں صلیب کو عموداً کھڑا کر دیا گیا اور تمام ہجوم نے سنگ باری شروع کر دی اور وہ لوگ جن کے پاس نیزے تھے وہ اس کے بدن میں چبھوتے۔

مکّہ کے لوگوں نے اس مسلمان کو مصلوب کر کے اس قدر لذت حاصل کی کہ بعد ازیں جب کبھی کوئی مسلمان اسیر ہوا، اسے صلیب پر چڑھا کر سنگ باری کی گئی۔

۵- تنعیم میں شہید کیے جانے والے قیدی کا نام خبیبؓ بن عدی دیا ہے۔ [بخاری، کتاب المغازی، ح ۳۹۸۹]

مسلمانوں کا ایک اور چالیس افراد کا گروہ ماہ جولائی ۶۲۵ء یعنی ۳ ہجری میں ایک اور قبیلہ کو اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے جا رہا تھا کہ بئر معونہ کے مقام پر بدوؤں کے گھیرے میں آ گیا۔ مسلمان جانتے تھے کہ گرفتاری ہولناک عذاب پر منتج ہو گی۔ بدوؤں سے برسرِ پیکار ہو گئے، حتیٰ کہ سبھی شہید کر دیے گئے۔[6]



۶- یہ المناک واقعہ بھی صفر ۴ھ میں بنو سُلیم کے کنویں "بئر معونہ" پر پیش آیا تھا۔ تبلیغی وفد ۴۰ افراد پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس میں ۷۰ قراء قرآن شامل تھے جن کے قائد منذر بن عمرو ساعدیؓ تھے۔ بنو سُلیم کے قبائل رعل، ذکوان اور عصیہ نے انھیں گھیر کر سب کو شہید کر دیا سوائے عمروؓ بن امیہ ضمری کے جنھیں قاتلوں کے سردار عامر بن طفیل نے اپنی ماں کی طرف سے آزاد کر دیا۔ [اٹلس سیرت نبوی، دار السلام، ص ۲۵۸]

قریش کی نئی چال

جنگِ اُحد کے اختتام پر ابوسفیان نے مسلمانوں کو للکار کر کہا تھا کہ اگر مزید جنگ پر آمادہ ہو تو ایک سال بعد بدر کے تجارتی میلہ میں پہنچ جانا۔

بدر کا تجارتی میلہ ایک ہفتہ کے لیے ہوتا تھا۔ دوسرے سال (ماہ اپریل ۶۲۶ء) میں محمد ﷺ ایک ہزار پانچ سو مجاہدین پچاس گھوڑوں کے ساتھ بدر کے تجارتی میلہ میں پہنچ گئے۔

محمد ﷺ، ابوسفیان پر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان اس کے لشکر سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ وہ جنگ پر آمادہ ہیں لیکن ابوسفیان کہ اس مرتبہ صرف دو ہزار جنگجو اپنے ساتھ لایا تھا، مسلمانوں کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ بہانہ یہ بتایا کہ اس کے لشکر کے اونٹوں کے لیے بدر کے اطراف میں خشک سالی کی وجہ سے چارہ نہیں ہے اور اپنے دو ہزار افراد کے ساتھ واپس مکّہ کوچ کر گیا۔

ابوسفیان کا اس طرح میدانِ جنگ سے کوچ کرنا مسلمانوں کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا۔ سب جان گئے کہ ابوسفیان باوجودیکہ مسلمانوں سے قوی تر لشکر ساتھ لایا تھا، مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔ اس باعث مسلمانوں کا امیج بہت بلند ہوا۔ مسلمانوں نے اس سال بدر کے تجارتی میلہ میں تجارت سے بہت نفع کمایا۔ لیکن جب مسلمان مدینہ واپس پہنچے تو قریش نے محسوس کیا کہ سیاسی نقطۂ نظر سے انھیں مدینہ کا قطعی محاصرہ کرنا ہوگا۔

جماعتِ قریش نے جو مدینہ کے جنوب میں ساڑھے چار سو کلومیٹر دور مکّہ میں رہتی تھی، اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلے اقدام کے طور پر خیبر کے یہودیوں سے جنگی معاہدہ کیا۔

خیبر مدینہ کے شمال میں دو سو کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا اور اس کی آبادی خالصتاً یہودیوں پر مشتمل تھی۔ جماعتِ قریش نے اگلے اقدام کے طور پر پروگرام بنایا کہ دو بدوی قبائل جو کہ

مدینہ کے شمالی صحرا میں سکونت پذیر ہیں، اُن سے بھی جنگی اتحاد کیا جائے۔ یہ دونوں بدوی قبائل بنی فزارہ اور غطفان تھے۔

جماعتِ قریش نے ان سے گفت و شنید کی اور انھیں اس جنگی اتحاد میں شامل کر لیا۔ اس کے علاوہ خیبر کے یہودیوں نے بھی ان سے مذاکرات کیے اور طے پایا کہ یہودی اپنی ایک سال کی تمام پیداوار (خرما) ان دو قبائل کو دیں گے بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے خلاف ان کا ساتھ دیں۔ ان دو قبائل نے یہودیوں کی پیشکش قبول کر لی۔ اس ترتیب سے یہودی، قریش، بنی فزارہ اور غطفان مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے۔

مدینہ کے مشرق میں ایک قبیلہ بنوسُلیم سکونت پذیر تھا۔ جماعتِ قریش اس قبیلہ کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس سازش کے تحت مدینہ کو مکمل طور پر سیاسی محاصرہ میں لے لیا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ سیاسی محاصرہ، اقتصادی محاصرہ میں تبدیل ہو گیا۔ مدینہ کے تجارتی قافلوں کے لیے شمال، جنوب اور مشرق تینوں اطراف بند کر دی گئیں۔

شمال میں دو قبائل بنی غطفان اور بنی فزارہ، جنوب میں قریش اور قریش کے دو اتحادی قبائل کنانہ اور ثقیف اور مشرق میں قبیلہ بنوسُلیم کاروانوں کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اب محاصرہ کی تکمیل میں ایک ہی سمت باقی رہ گئی تھی، یعنی مغرب، اس سمت شام کی سرحد کے قریب ایک شہر تھا دومۃ الجندل، اس کے حاکم نے تہیہ کیا کہ کسی اسلامی قافلہ کو اس طرف سے گزرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اس اقدام سے مسلمان بہت متاثر ہوئے۔

مدینہ چونکہ بارانی علاقہ تھا اس لیے اس علاقہ میں باغ اور زراعت تھی۔ لوگ اپنی تمام ضروریات مقامی طور پر پوری نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا مجبور تھے کہ شام سے تجارت کر کے اپنی احتیاجات باہر سے پوری کریں۔ محمد ﷺ مدینہ کے اس اقتصادی محاصرہ سے بہت دل گیر ہوئے لیکن چونکہ خدا پر توکل تھا، وہ پر امید تھے کہ ان حالات کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔

ہم یورپ والے یہ سمجھتے ہیں کہ توکل سے مسلمانوں کا مقصود یہ ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور اپنا منہ آسمان کی طرف کر کے کھول دیں۔ ہوا سے خود بخود لقمہ ان کے منہ

میں گر پڑے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمان خدا پر توکل کرتے ہیں، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھتے بلکہ اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ اپنی سعی کے دوران وہ خدا پر توکل کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک مومن سخت ترین مواقع پر بھی ناامید نہیں ہوتا اور یقین رکھتا ہے کہ معجزانہ طور پر اس کی رُستگاری ہوگی۔

جب محاصرہ مکمل ہوگیا، قبائل قریش نے اپنے اتحادیوں اور عبداللہ بن ابی کے تعاون سے مسلمانوں کے خلاف ایک پروگرام وضع کیا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کو مدینہ سے کسی بہانے اس طرح باہر نکالیں کہ مسلمان مدینہ میں تنہا رہ جائیں اور محمد ﷺ کی مدینہ سے غیر حاضری کے دوران حملہ کر کے مسلمانوں کا کام تمام کر دیا جائے۔

بحیرۂ احمر کے نزدیک ایک قبیلہ بنام بنومصطلق رہتا تھا۔ رئیس قبیلہ کا نام حارث تھا۔ جماعتِ قریش نے اس قبیلہ کو تحریک دی کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو۔

محمد ﷺ کو یہ خبر ملی کہ قبیلہ بنومصطلق مسلمانوں پر حملہ کا قصد رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے ارادہ کیا کہ پہل کر کے اس قبیلہ پر حملہ کر دیں۔

چنانچہ مدینہ سے کوچ کے وقت محمد ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو دعوت دی کہ مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر کی کمان سنبھالے۔ عبداللہ بن ابی رئیس منافقین تھا۔ یہودیوں کی خواہش تھی کہ محمد ﷺ کی غیر حاضری کے دوران اس (عبداللہ بن ابی) کی مدد سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گے اور قصہ تمام کر دیں گے لیکن عبداللہ بن ابی، محمد ﷺ کی اس دعوت پہ انکار نہ کر سکا اور مجبوراً ان کی پیش کش قبول کر لی۔

محمد ﷺ اس مہم میں عبداللہ بن ابی کو اپنے ہمراہ لے گئے اور منافقین مدینہ میں بغیر رئیس کے رہ گئے۔ نتیجتاً قریش اور یہودی محمد ﷺ کی غیر حاضری میں اپنے منصوبہ پر بروقت عمل نہ کر سکے۔

محمد ﷺ کے اس لشکر کے ساتھ صرف تیس افراد تھے جن میں دس مہاجر اور بیس انصار تھے۔ قبیلہ بنومصطلق کی جنگی طاقت دو سو افراد تھی۔ محمد ﷺ کے مجاہد مدینہ سے مغرب کی سمت آٹھ منزل دور قبیلہ بنومصطلق سے جا ٹکرائے۔ باوجودیکہ بنومصطلق مسلمانوں سے سات گنا

طاقت ور تھے، مسلمانوں نے ان کے دس آدمی قتل کیے اور تمام قبیلہ اسیر بنا لیا۔ مسلمانوں کا صرف ایک مجاہد شہید ہوا۔

قبیلہ بنومصطلق اس جنگ سے قبل قریش کا مطیع اور حقیقت میں حمال (سامان ڈھونے والا) تھا۔ مسلمان انھیں بھی کافر حربی گردانتے تھے یعنی وہ کافر جنھوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی ہو، لہٰذا قبیلہ کے تمام مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیزیں بنا لیا گیا۔ لڑائی میں قبیلہ کا رئیس حارث بھی گرفتار ہوا۔

اعراب کی رسم کے مطابق اسیروں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس قبیلہ کی ایک عورت موسوم بہ جویریہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بیوی بن گئیں۔ اس ازدواج کے بعد مسلمان متوجہ ہوئے کہ حارث تو اب نبی ﷺ کا خسر بن گیا، اس لیے زیبا نہیں کہ وہ کسی مسلمان کا غلام ہو۔ لہٰذا حارث کے آقا نے اسے یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ تم اب ہمارے پیغمبر ﷺ کے خسر ہو۔

عرب کے چھوٹے چھوٹے قبائل کے افراد باہم قریبی رشتہ دار ہوتے تھے، لہٰذا تمام افراد جو اس دن گرفتار ہوئے، ازدواج جویریہ کے بعد محمد ﷺ کے خویش قرار پائے۔ مسلمان انھیں غلام اور کنیزیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ وجہ ہوئی کہ مسلمانوں نے تمام قبیلہ کے افراد کو آزاد کر دیا۔ قبیلہ کے افراد نے جب یہ فداکاری کا جذبہ دیکھا تو متاثر ہو کر سب مسلمان ہو گئے۔ حارث، جویریہؓ کا باپ اور محمد ﷺ کا خسر سب سے پہلے ایمان لایا۔

قبیلہ بنومصطلق مسلمان ہو کر اسلام کا وفادار ہو گیا اور بعدازاں اس کے افراد نے بہت سی جنگوں میں اسلام کے لیے فداکاری کی۔ قبیلہ بنومصطلق کے مسلمان ہونے کے بعد مسلمان سمجھ سکے کہ اس ازدواج سے محمد ﷺ کے پیشِ نظر کیا تھا۔ جویریہؓ سے ازدواج سے نبی ﷺ کو امید تھی کہ مشرک قبیلہ مسلمان ہو جائے گا۔

عبداللہ بن ابی اپنی مرضی کے خلاف لشکرِ اسلامی کے ساتھ اس جنگ پر تو چلا آیا مگر مسلمانوں کی فتح اور بعد میں قبیلہ مذکور کے مسلمان ہونے پر بہت خشمگیں ہوا اور ارادہ کیا کہ محمد ﷺ کے مدینہ پہنچنے سے پہلے آپ ﷺ کو قتل کر دے۔

قبیلہ بنومصطلق کے مسلمان ہوجانے کے بعد محمد ﷺ نے واپس چلنے کا ارادہ کیا تو عبداللہ بن ابی نے فتنہ انگیزی شروع کردی۔ اس نے لشکر کے مہاجر مجاہدوں کو جمع کیا اور کہا: تم نے دیکھا نہیں کس طرح پیغمبر ﷺ نے تمھیں تمھارے حق سے محروم کیا ہے۔

انھوں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

عبداللہ بن ابی نے کہا: تم مدینہ سے چلے، یہاں پہنچے، پھر اس امید پر جنگ کی کہ مالِ غنیمت حاصل کروگے، لیکن محمد ﷺ نے فتح کے بعد جویریہؓ بنت حارث سے نکاح کرلیا، جس کے نتیجہ میں تم مجبور ہوئے کہ غلاموں اور کنیزوں کو بغیر کسی مالی فائدہ کے آزاد کردو۔ اب تم خالی ہاتھ مدینہ جاؤ گے۔ اس کے بعد اس نے انصار مجاہدوں کو اکٹھا کر کے کہا: تم نے اس سفر میں فریب کھایا ہے۔

انھوں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

عبداللہ بن ابی نے کہا: وہ ایسے کہ تم مالِ غنیمت سے محروم کیے گئے ہو اور مجھے حیرت ہے تم نے کیوں اپنی کنیزوں اور غلاموں کو آزاد کیا۔ اگر محمد ﷺ نے جویریہؓ سے نکاح کرلیا ہے تو تمھیں کیا؟ تم مالِ غنیمت یا زرِ فدیہ سے کیوں محروم رہو؟

انصار نے کہا: محمد ﷺ کے نکاح کرنے کے باعث اسلام کی توسیع ہوئی ہے۔ ایک قبیلہ مسلمان ہوگیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ہمیں مالِ غنیمت سے محروم ہونے کا کوئی افسوس نہیں۔

عبداللہ بن ابی نے محسوس کیا کہ انصار اور مجاہدین اس کی باتوں میں نہیں آئیں گے تو انصار اور مہاجر مجاہدوں کو لڑانے کا قصد کیا۔ مہاجرین سے کہا: ''انصار کہہ رہے ہیں کہ محمد ﷺ ایک چالاک انسان ہیں۔ گرچہ ہمیں اس جنگ میں مالِ غنیمت نہیں ملا، پھر بھی ہم خوش ہیں۔ اب یہ تم (عبداللہ بن ابی) پر ہے کہ انصار کو سمجھاؤ کہ وہ محمد ﷺ سے مات نہ کھائیں''۔

نزدیک تھا کہ مہاجر و انصار آپس میں دست و گریباں ہوں کہ عبداللہ بن ابی کے بیٹے نے جو اس سفر میں باپ کے ساتھ تھا، محمد ﷺ کو اس واقعہ سے آگاہ کیا اور عرض کی: اگر آپ ﷺ

نے فوری اقدام نہ کیا تو کشت و خون شروع ہوجائے گا۔ محمد ﷺ نے دستوں کو طلب کیا اور بات کو آگے نہ بڑھنے دیا اور فوری مدینہ کی طرف کوچ کرنے اور تیزی سے سفر کرنے کا حکم دیا، کیوں کہ مجاہدین پراگندہ خاطر تھے اور آہستہ روی سے وسوسوں کو ذہن میں دوبارہ جڑ پکڑنے کا موقع ملتا۔

سفر کے دوران عبداللہ بن ابی کا لڑکا آپ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یا محمد ﷺ! جیسا کہ میں پہلے آپ ﷺ کو بتا چکا ہوں، میرے والد کا ارادہ تھا کہ مجاہدین میں شورش پیدا کر کے آپ کو قتل کردے۔ چونکہ اس نے آپ ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا ہے، اس لیے وہ واجب القتل ہے۔ اگر آپ ﷺ حکم فرمائیں تو میں اس کو قتل کردوں۔ ویسے میں یہ بھی عرض کردوں کہ مدینہ میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مجھ سے زیادہ میرے والد کا وفادار ہو۔ لیکن جب مجھے یہ علم ہوا کہ میرا والد، پیغمبر ﷺ کو قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے مستوجب قتل سمجھتا ہوں اور جب بھی آپ ﷺ اس کے قتل کا حکم صادر کریں گے قتل کردوں گا۔

محمد ﷺ اس جوان (عبداللہ بن ابی کے بیٹے) سے بہت متاثر ہوئے، اس لیے کہ وہ صمیم قلب سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمھارے باپ کے قتل کا حکم صادر نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ قتل کیا جائے بلکہ میری خواہش ہے وہ زندہ رہے اور ہمارے درمیان زندگی بسر کرے۔

محمد ﷺ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ابی نے خیانت کی ہے، پھر بھی اس کے قتل کی فکر نہ کی۔ اس لیے کہ آپ ﷺ مجسم بخشش تھے اور دشمنوں سے انتقام نہیں لیا کرتے تھے۔ لیکن عبداللہ بن ابی حق شناس نہ تھا۔ وہ بجائے اس کے کہ آپ ﷺ کا سپاس گزار ہو کہ آپ ﷺ نے اس کے قتل سے صرفِ نظر کیا ہے، وہ اس کے برعکس محمد ﷺ کو زک پہنچانے کے مواقع تلاش کرتا رہا۔ بالآخر اسے محمد ﷺ پر ضرب لگانے کا موقع ہاتھ آہی گیا۔ وہ اُم المومنین عائشہؓ سے متعلق ایک اتفاقی واقعہ تھا اور اس نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ ہر سفر میں اپنی کسی ایک بیوی کو ساتھ لے جایا کرتے تھے اور انتخاب قرعہ اندازی سے کیا کرتے تھے، تاکہ کسی ایک کے لیے بھی رنج کا باعث نہ ہو۔

بنومصطلق پر حملہ کے لیے جو سفر اختیار کیا گیا، اس کے لیے قرعہ عائشہؓ کے نام نکلا۔ عائشہؓ اونٹ کے کجاوہ میں بیٹھ گئیں اور محمد ﷺ کے ساتھ میدانِ جنگ کو روانہ ہو گئیں۔ میدانِ جنگ سے واپسی کے سفر میں عائشہؓ کجاوہ سے اُتر کر رفع حاجت کے لیے چلی گئیں۔ فراغت کے بعد جب وہ واپس پڑاؤ میں پہنچیں تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں کہ لشکر وہاں سے جا چکا تھا۔

جب لشکر کوچ کرنے والا تھا، محمد ﷺ نے دیکھا کہ عائشہؓ کے کجاوہ کا پردہ گرا ہوا ہے۔ سوچا سو رہی ہوں گی۔ اس وجہ سے آپؐ کو اُن کی غیر حاضری کا پتہ نہ چل سکا۔ اونٹ کھڑے ہوئے اور لشکر چل دیا۔

عائشہؓ نے جب دیکھا کہ لشکر جا چکا ہے تو انھیں دھچکا سا لگا۔ روتی ہوئی لشکر کے پیچھے دوڑیں لیکن قافلہ کو نہ پا سکیں۔ وہ زمین پر بیٹھ گئیں اور خدا سے دعا کی: اے خداوند! تو نے مجھے مسلمان پیدا کیا ہے۔ اپنے پیغمبر ﷺ کی بیوی بنایا ہے۔ اب مجھے نجات دے۔

کچھ دیر بعد ایک اونٹ سوار وہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ صفوانؓ بن معطل سلمی عقب دار لشکرِ اسلام ہے۔ اس کی نگاہ ایک عورت پر پڑی کہ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔

صفوانؓ جب عائشہؓ کے نزدیک گیا تو پہچان لیا اور عرض کی: آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اور کیوں یہاں بیٹھی ہوئی ہیں؟ عائشہؓ نے واقعہ بتایا۔ صفوان نے آپ کو اونٹ پر بٹھا لیا اور خود ساتھ ساتھ پیادہ مدینہ کی راہ لی۔ لشکر کے مدینہ پہنچنے کے دوسرے دن یہ مدینہ پہنچے۔

عبداللہ بن ابی نے جب یہ سنا کہ عائشہؓ کو صفوانؓ بن معطل سلمی اپنے ساتھ مدینہ لایا ہے تو اس موقع کو غنیمت جانا کہ تہمت باندھے۔ محمد ﷺ کو دکھ پہنچائے اور بدنام کرے۔ دوسرے کچھ لوگ بھی عبداللہ بن ابی کے ہم آواز ہو گئے۔ مثلاً زید بن رفاعہ، حسان بن ثابت کہ شاعر تھا اور مسطح بن اثاثہ۔ یہ تیسرا شخص عائشہؓ کا دور کا رشتہ دار تھا یعنی ابوبکرؓ کی خالہ کا نواسا تھا۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے ہمنوا صبح سے شام تک مدینہ کی گلیوں میں لوگوں سے کہتے پھرتے کہ صفوان ایک جوان آدمی ہے اور عائشہؓ بھی جوان ہیں اور دونوں ایک دن اور ایک رات صحرا میں تنہا رہے ہیں، لہٰذا ان کے درمیان وہ تعلقات پیدا ہوئے جو نہیں ہونے چاہئیں تھے۔ یہودی تو محمد ﷺ کے دشمن تھے ہی، وہ اس حکایت کو اور پھیلاتے۔ حسان بن ثابت

نے ہجو لکھی اور محمد ﷺ کے دشمنوں نے اپنے تخیل سے اس واقعہ کی تفصیلات تیار کیں۔

محمد ﷺ نے اُسامہ بن زیدؓ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ اُسامہؓ نے کہا: آپ ﷺ کی بیوی میں کوئی نقص نہیں، بجز اس کے کہ ابھی کم عمر ہیں۔

محمد ﷺ نے اس کے بعد علیؓ سے مشورہ کیا اور کہا: اے علیؓ! میں عائشہؓ کے معاملہ میں کیا کروں؟

علیؓ نے جواب دیا اگر آپ عائشہؓ کو گنہگار نہیں سمجھتے تو ان افواہوں پر توجہ نہ دیں اور اگر گنہگار سمجھتے ہیں تو طلاق دے دیں۔ آپ ﷺ کے لیے عورتوں کی کوئی کمی نہیں۔

اس موقع پر محمد ﷺ پر وحی نازل ہوئی۔ پہلی آیت جو عائشہؓ کے متعلق نازل ہوئی، وہ آج سورۂ نور کی گیارھویں آیت ہے۔ اس آیت کا مضمون یہ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ "وہ لوگ جنھوں نے بہتان تراشی کی اور جھوٹ گھڑا، وہ تم میں سے ہی ہیں۔ تم یہ نہ سوچنا کہ یہ بہتان اور جھوٹ تمھارے لیے کوئی خطرہ پیدا کرے گا بلکہ اس کے برعکس تمھارے لیے سودمند اور باعثِ خیر ہوگا۔ ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا۔ اور وہ جس نے بہت بڑا جھوٹ کہا (عبداللہ بن ابی) وہ عذاب عظیم سے دوچار ہوگا"۔

اور اسی سورت کی بارھویں آیت میں فرمایا:

﴿لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ﴾ "اگر انھوں نے یہ تہمت لگائی تو کیوں اس پر چار گواہ نہ لائے، تاکہ ثابت کریں کہ عائشہؓ نے گناہ کیا ہے اور چونکہ بہتان طراز چار گواہ نہیں لائے، لہٰذا وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے شمار ہوتے ہیں"۔

وہ لوگ جو اسلامی احکام سے مطلع ہیں، جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی عورت یا مرد پر تہمت لگائے کہ وہ زانیہ یا زانی ہے تو قرآنی احکام کے مطابق چار گواہ پیش کرے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس مرد و عورت کو ارتکابِ گناہ کرتے دیکھا ہو۔

چار گواہوں کی شہادت صریح اور بغیر کسی ابہام کے ہونی چاہیے۔

اگر گواہ شہادت دیں کہ انھوں نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو باہم میاں بیوی نہیں ہیں، ایک مدت تک ایک گھر میں دروازے بند کر کے رہے ہیں تو یہ شہادت ان پر گناہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے ممکن ہے وہ مرتکب گناہ نہ ہوئے ہوں۔ جو شخص بھی کسی دوسرے پر تہمت زنا لگائے، وہ چار گواہ لائے اور تہمت لگانے کے بعد اگر وہ شخص چار گواہ نہ لا سکے تو وہ شخص گناہ گار اور مستوجب سزا ہوتا ہے۔

عائشہؓ کی بے گناہی میں خداوند نے سورۃ نور کی آٹھ آیات (گیارہ سے بیس تک) نازل فرمائیں اور خاص طور پر ان کی بے گناہی کا ذکر فرمایا۔ ان آیات کے نزول کے بعد محمد ﷺ اور مسلمان مطمئن ہوئے۔ ان آیات کا نزول مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ مسرت کا باعث ہوا۔ اس لیے کہ تمام مسلمان جو نسباً عرب تھے، بڑے بااخلاق تھے، منافقوں کے پراپیگنڈہ اور ہجو سے ان کا دل جلتا تھا۔

لیکن مذکورہ آیات کے نزول کے بعد تمام مسلمان بہت شاداں ہوئے۔

عبداللہ بن ابی جو سوچ رہا تھا کہ اس کی یہ تہمت محمد ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ ثابت ہوگی، اس کی یہ مہم بھی ناکام ہوگئی۔ ان آیات کے نزول پر محمد ﷺ اور مسلمانوں نے آسودہ خاطر ہو کر خود کو ایک اور جنگ کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔



جنگِ خندق

محمد ﷺ اپنا خبر رسانی کا ایک قابلِ اعتماد اور مؤثر نظام رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے علم میں تھا کہ قریش مکہ میں لام بندی کر رہے ہیں اور دس ہزار کا ایک لشکر مدینہ پر حملہ کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ قریش، مدینہ پر حملہ کے لیے تیاری تو کر رہے تھے، مگر دل میں وہ محمد ﷺ کی جنگی استعداد سے خوف زدہ بھی تھے۔ پس منتظر تھے کہ محمد ﷺ مدینہ سے خارج ہوں تو وہ مدینہ پر حملہ کریں اور منافقین اور یہودیوں کی مدد سے اسلام کی بیخ کنی کریں۔

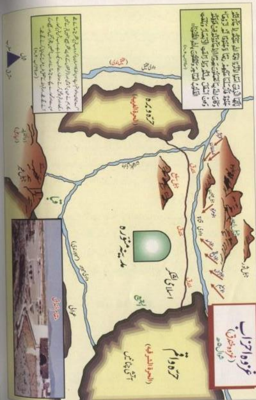
قریش کو اطلاع مل چکی تھی کہ محمد ﷺ، دومتہ الجندل پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حاکم دومتہ الجندل نے قریش اور خیبر کے یہودیوں سے ایک جنگی معاہدہ کی رو سے مدینہ کے کاروانوں کا جو مدینہ سے شام اور النہرین کا سفر کرتے تھے، اپنے علاقے سے عبور ممنوع قرار دے دیا تھا۔ محمد ﷺ کو معلوم تھا کہ قریش ایک بہت بڑا لشکر تیار کر رہے ہیں اور وہ کسی وقت بھی مدینہ پر چڑھ دوڑیں گے، لیکن آپ ﷺ کی دومتہ الجندل کی مہم بھی ناگزیر تھی۔ اس لیے مذاکرات یا جنگ دونوں صورتوں میں کاروانوں کے عبور کی ضمانت حاصل کرنا ضروری تھا۔

حاکم دومتہ الجندل کا یہ اقدام ایسا تھا جیسے مدینے والوں کی گردن شکنجہ میں کس دی گئی ہو۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ مجبور تھے کہ اس راستے کو کھولیں وگرنہ مدینہ کی تجارت تباہ ہو جاتی۔

محمد ﷺ نے دو وجوہ کی بنا پر اس سفر کا حتمی ارادہ کر لیا، ایک یہ کہ دومتہ الجندل مدینہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا۔ دوسرے وہ باخبر تھے کہ قریش کی لام بندی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔

ان وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے محمد ﷺ ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور دومتہ الجندل کی طرف پیش قدمی کی۔ سب سے پہلے آپ ﷺ کا گزر قبیلہ غطفان کی سرزمین پر سے ہوا۔ آپ ﷺ نے رئیس قبیلہ سے مذاکرات کیے۔ مذاکرات کے ضمن میں رئیس قبیلہ



نے محمد ﷺ کو تمام حقیقت بتادی کہ وہ طائفہ قریش اور خیبر کے یہودیوں کا اتحادی ہے، اور اس کے اتحاد کے عوض یہودیوں سے خرما یعنی کھجوریں وصول کی ہیں۔ اور اگر محمد ﷺ ان سے زیادہ خرما دینے پر آمادہ ہوں تو وہ اتحاد سے علیحدہ ہو جائے گا اور پھر کہا: اے محمد ﷺ! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ طویل مذاکرات کروں۔ اس لیے مجھے اپنے آدمیوں کے ساتھ فوری کوچ کرنا ہے کیونکہ لشکر قریش جو میرا منتظر تھا، اب مکہ سے مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم سب مل کر مدینہ پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔

محمد ﷺ نے رئیس قبیلہ کی اس بات کی تصدیق چاہی تو معلوم ہوا کہ خبر صحیح ہے۔

محمد ﷺ جانتے تھے کہ رئیس قبیلہ جھوٹ نہیں بول رہا، لیکن خیال کیا کہ شاید قریش نے اسے ایسے ہی کہلا بھیجا ہو۔ خبر کی تصدیق پر محمد ﷺ نے فوری مراجعت فرمائی اور بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے بروقت مدینہ پہنچ گئے۔

عبداللہ بن ابی اور یہودی، محمد ﷺ کو واپس مدینہ میں دیکھ کر بہت متعجب ہوئے۔ انھیں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی اس عادت کا علم تھا کہ جب کبھی جنگی مقاصد کے لیے سفر پر نکلتے ہیں تو جنگ کیے بغیر نہیں لوٹا کرتے۔ محمد ﷺ کے راہ سے ہی لوٹ آنے کے بعد چند افراد قبیلہ بنوخزاعہ کے مدینہ آئے اور محمد ﷺ کو اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مکہ سے چل پڑا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ لشکر قریش کو مدینہ پہنچنے کے لیے عام حالات میں تقریباً گیارہ دن سفر کرنا ہوگا۔ مگر لشکر قریش چار دن میں ہی مدینہ پہنچ گیا۔ دراصل پیغمبرِ اسلام ﷺ کے مدینہ سے باہر جانے کی خبر کے بعد وہ روز و شب سفر کرتے رہے تھے کہ جلد از جلد مدینہ پہنچ جائیں۔

ان دو اشخاص نے مزید بتایا کہ: لشکر کی تعداد دس ہزار ہے۔ تمام سپاہ پوری طرح مسلح ہے اور ان کا ارادہ ہے کہ جب تک مدینہ سے اسلام کی بیخ کنی نہ کرلیں، مکہ واپس نہیں لوٹیں گے۔ محمد ﷺ نے ان اشخاص سے یہ سب سننے کے بعد ایک لحظہ تاخیر نہ کی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا: اس دفعہ لشکر قریش کی تعداد گزشتہ سے بہت زیادہ ہے۔ دشمن کے اس حملہ کو روکنے کے لیے کوئی حتمی وسیلہ اپنانا ہوگا۔

وسیلۂ دفاع جو محمد ﷺ کے پیشِ نظر تھا وہ عبارت تھا ایک خندق سے۔ اسی مناسبت سے اس جنگ کو جو ماہ شوال ۵ ھ میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہوئی جنگِ خندق کا نام دیا گیا۔ چونکہ اس جنگ میں قریش کے ساتھ مختلف قبائل کے دستے بھی شامل ہوئے اس لیے اسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں۔

جنگِ خندق میں محمد ﷺ کی جنگی حکمت عملی اور طریق دفاع پر نہ صرف ایک عام آدمی حیرت کا اظہار کرتا ہے، بلکہ جنگی ماہرین کو بھی حیرانی ہے کہ کس طرح اور کیسے محمد ﷺ نے ان جنگی چالوں اور طریقۂ دفاع کا استنباط کیا اور پھر عمل کیا۔ ایسے اشخاص کی کمی نہیں جو گھر میں بیٹھے بیٹھے کاغذ پر جنگ کا نقشہ بناتے اور دشمن کو معدوم کر دیتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی قدرت نہیں رکھتا کہ ان کاغذی چالوں کو میدانِ جنگ میں بروئے کار لا سکے۔

عربستان میں ایک بڑے لشکر کے مقابلے میں خندق کے ذریعے دفاع ایک نئی چیز تھی۔ ایسے ہی جیسے میدانِ جنگ میں صف بندی ایک انوکھی چال تھی۔ ان نئی چالوں کا عربستان میں محمد ﷺ نے ہی آغاز کیا۔ مسلمانوں میں ایک شخص تھا جس کا نام مہ یار فارسی تھا۔ عرب میں اسے سلمان فارسی کہتے ہیں۔ انھوں نے محمد ﷺ سے عرض کی: ایران میں ایک قلعہ و شہر کے دفاع کے لیے اس کے اطراف خندق کھودتے ہیں۔ یہ خندق اس قدر عمیق و عریض ہوتی ہے کہ دشمن کے سوار و پیادہ اسے عبور نہیں کر سکتے۔

سلمان فارسیؓ بلند قامت اور چوڑے شانوں والے ایک قوی مرد تھے اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بابت بہت زیادہ مخلص تھے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ان کے مشورہ کو قبولیت بخشی۔ لیکن خندق کی کھدائی میں بہت زیادہ مشکلات تھیں۔ خندق بھی ایسی جو دشمن کے حملے سے حفاظت کرے اور مدینہ کی کل آبادی کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ خندق کی کھدائی کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی محمد ﷺ کے اشارے پر کھدائی کا کام شروع کر دیا گیا۔

خندق کی کھدائی کے حکم کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ ہر قسم کی زرعی پیداوار جو

شہر سے باہر ہے فوری شہر کے اندر لائی جائے، تاکہ جب لشکر قریش مدینہ پہنچے تو کھیتوں اور باغوں کی اس پیداوار سے استفادہ نہ کر سکے۔

اس چال کو دوسری عالمگیر جنگ [۴۵۔۱۹۳۹ء] میں حکومت روس نے جرمنی کے خلاف اختیار کیا تھا اور جرمن فوجوں کے اگلے علاقہ سے تمام کھیتوں اور باغوں کی پیداوار اپنے عقب ہی میں پہنچا دی یا تباہ کر دی تھی، تاکہ دشمن کی افواج اس اناج اور پھلوں سے استفادہ نہ کر سکیں۔ اس سے تیرہ سو سال پہلے محمد ﷺ نے جنگ میں یہ روش اختیار کی اور تمام زرعی پیداوار کو مدینہ شہر میں منتقل کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب قریش کا لشکر مدینہ پہنچا تو خوراک اور چارے کی قلت کا شکار ہو گیا۔

مدینہ کے تمام مسلمان مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں جو بیلچہ، کدال اور گینتی سے کام کرنے کے قابل تھے، خندق کی کھدائی میں مشغول ہو گئے۔

خندق کا نقشہ اس طرح بنایا گیا تھا۔ مدینہ کا شمالی، مغربی، جنوب مغربی اور جنوب کا کچھ حصہ اس میں شامل تھا۔ یہ شمال میں قلعہ شیخین سے شروع ہوتی تھی اور جنوب میں حومہ (قبا) کے پاس ختم ہو جاتی تھی۔ خندق کے نقشہ میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا گیا کہ زمین کی طبیعی رکاوٹیں خندق کے اندرونی طرف رہیں تا کہ شہر کے اندر جو مسلمان ہیں وہ ان طبیعی رکاوٹوں سے پورا استفادہ کر سکیں۔ مدینہ میں اس وقت طول ماپنے کا ایک ہی پیمانہ تھا: ذراع، یعنی کہنی سے لے کر ہاتھ کی درمیانی انگلی کے آخر تک لمبائی۔ ذراع ایک اکائی شمار ہوتی تھی۔

ایک ذراع تقریباً آج کے آدھے میٹر کے برابر ہے۔ محمد ﷺ نے خندق کی کھدائی کے لیے مسلمانوں کو دس دس کے گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ہر بیس میٹر (چالیس ذراع) فاصلہ کی کھدائی ان کے سپرد کر دی۔

افسوس کہ وقائع نگاروں نے یہ نہیں بتایا کہ مدینہ کے تین اطراف جو کھدائی ہوئی اس کا عرض کتنا تھا۔ خندق کا طول البتہ بارہ ہزار ہاتھ (ذراع) یعنی ۶ کلو میٹر تھا۔ خندق کی گہرائی پانچ ذراع سے زیادہ تھی، لہٰذا اس حساب سے گہرائی تقریباً تین میٹر ہوتی ہے۔ ہم بلا تردید یہ

کہہ سکتے ہیں کہ خندق کی کھدائی کافی عریض اور عمودی تھی۔ اگر عرض کم ہوتا تو سوار اسے چھلانگ کر دوسری سمت پہنچ سکتے تھے۔ اور اگر کھدائی گہری نہ ہوتی تو پیادہ و سوار سپاہ اس میں سے گزر کر دوسری طرف شہر میں پہنچ سکتی تھی۔ قدیم جنگوں میں ایک خشک خندق، آبی خندق سے زیادہ مفید تھی۔ اس لیے کہ اگر خندق پانی سے پر ہو تو سوار اس میں سے آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ اسی طرح دشمن سپاہ کشتیوں کے ذریعے سے خندق کو عبور کر سکتی ہے۔

مسلمانوں نے اطراف مدینہ اس چھ کلو میٹر لمبی خندق کی کھدائی میں روز و شب بہت زیادہ مشقت اُٹھائی۔ ہر دس افراد کا ایک گروپ خندق کے ایک مخصوص حصہ کی کھدائی پر مامور تھا۔ کچھ لوگ مسلسل بیدار رہتے تھے۔ انھیں سونے کی اجازت نہیں تھی مگر اپنی باری پر۔

محمد ﷺ بذات خود دوسروں کی مدد کے لیے گینتی چلاتے اور مٹی اُٹھاتے تھے۔

ابوبکرؓ اور عمرؓ نے اپنی ٹوکریاں دوسروں کو دے دی تھیں اور وہ دونوں جو عرب کے قابل احترام بزرگ تھے اور ہجرت سے پہلے مکّہ کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، اپنی چادروں میں مٹی بھر کر دور لے جا کر پھینکتے تھے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں خندق قلعہ شیخین سے شروع ہو کر حومہ (قبا) میں ختم ہوتی تھی۔ اس ترتیب سے مشرق، شمال مشرق اور جنوب مشرقی سمت میں خندق نہیں کھودی گئی تھی۔ ان اطراف میں دشمن کی پیش قدمی میں بہت سی رکاوٹیں تھیں، یعنی تنگ راستوں والے گھنے باغات تھے۔ ان اطراف میں تیر انداز اور پتھر پھینکنے والے اگر کھجوروں اور دوسرے درختوں پر مورچے سنبھال لیتے تو قریش کے لشکر کا اس طرف سے عبور ممکن نہ تھا۔ قریش کے سوار اور پیادہ باآسانی ان راستوں سے نہیں گزر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے محمد ﷺ نے اس سمت خندق کو ضروری خیال نہ کیا۔ بعدازاں جنگ میں ثابت ہو گیا کہ محمد ﷺ کا نظریہ اس بابت صائب تھا۔

محمد ﷺ نے کھدائی کرنے والوں کو کام کے اوقات میں بلند آواز سے جو وہ پسند کریں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی اور فرمایا کہ اچھی آواز والے ایسا ضرور کریں تاکہ دوسروں کی تھکاوٹ دور ہو، نیز یہ بھی فرمایا: وہ لوگ جو شعر سرائی کر سکتے ہیں وہ جوش و جذبہ بڑھانے

والے اشعار پڑھیں تا کہ کھدائی میں مشغول افراد کو کام میں تقویت حاصل ہو۔

عمارہ بن حزم ایک بارہ سالہ بچے کی آواز بڑی دل نشیں تھی۔ ایک دن محمد ﷺ وہاں پہنچے جہاں عمارہ کام کر رہا تھا تو اس کی دل نشیں آواز سنی۔ اس کے بعد آپ ﷺ جب خندق کے دوسرے حصوں میں لوگوں کی مدد کے لیے تشریف لے جاتے تو اس لڑکے کو بھی ساتھ لے جاتے، تا کہ دوسرے لوگ بھی اس کی دل نشیں آوازسنیں اور ان کی خستگی دور ہو۔

جب ایک گروپ اپنا کام ختم کر لیتا تو بجائے اس کے کہ وہ آرام کے لیے چلے جاتے، وہ پھیل کر دوسرے گروہوں کی مدد کرتے تھے۔ ایسی ہمت، ڈسپلن اور ایثار کی نظیر قدیم دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ دورِ جدید میں صرف ایک نمونہ سٹالن گراڈ کے مردوں اور عورتوں کی فداکاری نے پیش کیا۔ مکّہ کا لشکر جس وقت مدینہ کی حدود میں داخل ہوا تو خندق کی کھدائی کا کام تمام ہو چکا تھا اور مسلمان مرد اسلحہ سنبھال چکے تھے۔ جنگِ اُحد کے بیان میں ہم نے یہ ذکر کیا تھا کہ مکّہ کا لشکر جنوبی سمت سے مدینہ کے نزدیک نہیں آسکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی سنگلاخ زمین اونٹوں کی نقل وحرکت کے لیے ناموافق تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دفعہ بھی مکّہ کے لشکر نے مدینہ کا چکر کاٹا تا کہ شمال مغرب کی راہ یعنی کوہ اُحد کے دامن سے گزرتے ہوئے مدینہ پہنچیں۔

اس جنگ میں بھی لشکر کی کمان ابوسفیان کے پاس تھی۔ وہ جب کوہ اُحد کے دامن میں پہنچا تو اس کا خیال تھا مسلمانوں کا لشکر وہاں ملے گا اور وہ انھیں نابود کر دے گا۔ مکّہ کا لشکر دس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ ان میں اکثریت مکّہ کے رہنے والوں کی تھی۔ اور کچھ حصہ دوسرے جنگجو قبائل مثلاً بنی فزارہ، بنوغطفان، احابیش، اہلِ تہامہ اور بنوکنانہ پر مشتمل تھا۔ ابوسفیان مطمئن تھا کہ مسلمان لشکر سے سامنا ہوتے ہی وہ انھیں پیس کر رکھ دے گا۔ لیکن جب اس نے کوہ اُحد کے دامن میں مسلمانوں کا لشکر نہ پایا تو مدینہ پر حملہ کا حکم صادر کیا۔ لشکر حکم کی تعمیل میں جب مدینہ کی طرف بڑھا تو اپنے مقابل خندق کو پایا۔ جنگی حصار عربوں کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی لیکن خندق کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور ان کی پیش قدمی رک گئی۔ ابوسفیان بھی اپنی سپاہ کی طرح جب خندق پر پہنچا تو حیران رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا عبور بہت مشکل

ہے۔ اگر کوئی ایرانی یا رومی عہدیدار وہاں ہوتا تو اسے علم ہوتا کہ اس خندق کو کیسے عبور کیا جاتا ہے لیکن ابوسفیان ایک تاجر تھا اور اُمورِ جنگی سے ناآشنا۔

بدوی عربوں کی بے خبری اور سادگی کا علم ہمیں یہیں سے ہی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ دس ہزار جنگجو خندق کو مقابل پا کر رک گئے جیسے اس کا عبور ان کے لیے غیر ممکن ہے، چنانچہ ابوسفیان کے حکم کے بغیر ہی خندق کے اس پار اپنے خیمے گاڑنے شروع کر دیے۔ ان کا خیال تھا کہ خندق ناقابلِ عبور ہے، لہٰذا کوئی اور چارہ نہیں بجز اس کے کہ شہر کا محاصرہ کر لیا جائے۔ مکّہ کی سپاہ خندق کے اس پار اور مسلمان دوسری طرف اس طرح چاک و چوبند کھڑے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور ایک دوسرے کی آواز سنتے تھے۔

مکّہ کے لشکری مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے کہ: تم نہ عرب ہو اور نہ جنگجو۔ اگر تم عرب یا جنگجو ہوتے تو اس کھائی کے پیچھے پناہ نہ لیتے۔ اس کھائی کا کھود لینا ثابت کرتا ہے کہ تم ڈرپوک ہو۔ آیا تمھارے آباؤ اجداد تمھاری طرح کھائیاں کھودا کرتے تھے اور اس کی پناہ میں چلے جایا کرتے تھے؟ اگر تم عرب اور جنگجو ہو تو آؤ اس خندق کو عبور کر کے ہماری طرف آؤ یا ہم تمھاری طرف آ کر قوتِ بازو آزمائیں۔

مسلمان اس طعن و تشنیع کو سنتے، مگر جواب نہ دیتے اور ایسے اقدامات میں مشغول رہتے کہ دشمن خندق کو عبور نہ کر سکیں۔ جب مکّہ والوں نے مدینہ پر ہجوم کیا اس وقت موسم سرد ہو رہا تھا اور مکّہ کے لشکریوں کو خیموں میں خنکی محسوس ہوتی تھی۔ چوکیوں میں مسلمان جو نگہبانی کرتے وہ بھی اس سردی سے محفوظ نہیں تھے، لیکن ہر مسلمان کو اپنی باری ختم ہونے پر گھر جانے کی اجازت تھی۔ محمد ﷺ تمام رات نگہبانی کی چوکیوں میں گزارتے اور گھر تشریف نہیں لے جاتے تھے۔

دونوں اطراف کے فرد ایک دوسرے کی دسترس سے باہر تھے، اس لیے دور ہی سے ایک دوسرے پر تیر اندازی کرتے رہتے تھے، جس کے نتیجے میں دونوں اطراف کے چند افراد زخمی ہوئے۔ جب اندھیرا چھا جاتا اور تیر اندازی ممکن نہ رہتی تو ایک دوسرے کو ہدف ملامت

بناتے، ایک دوسرے کا تمسخر اُڑاتے۔ شعرا بلند آواز سے ہجو پڑھتے، گویا کہ دن کو بھی تیر اندازی کے ساتھ ساتھ ملامت و ہجو جاری رہتی۔

مسلمانوں نے قبیلہ غطفان کو پیش کش کی کہ وہ مکّہ کے لشکر کا ساتھ چھوڑ کر ان سے آملیں اور عوض میں کھجوروں کی تمام فصل انھیں دی جائے گی۔ اس طرح کا معاملہ جنگ کے دوران جب کہ سب لوگ آوازیں سن رہے ہوتے، بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ اس قسم کے معاملات دشمن کے لشکر میں تفرقہ ڈالنے کے لیے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کچھ دوسرے مقاصد کے لیے ایسا کیا جاتا ہے، مگر یہ ہر حال میں خفیہ طور پر طے پاتے ہیں نہ کہ علانیہ۔ لیکن بدوی عرب بہت سادہ تھے، ان کی سوچ اور کلام میں تضاد نہیں ہوتا تھا۔ جیسا سوچتے زبان پر لے آتے۔ بنی غطفان سے مسلمانوں کا معاملہ طے نہ ہو سکا جس کی وجہ ابوسفیان کی مداخلت تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ لشکر مکّہ خندق کو عبور نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی بنا پر ابوسفیان نے مدینہ کے یہودیوں کو آمادہ کرنے کی سوچی کہ وہ مسلمانوں پر عقب سے حملہ کریں۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے تھے۔ ہم بتا چکے ہیں ان تین میں سے دو کو جلاوطن کیا جا چکا تھا۔ اب صرف بنی قریظہ جن کا پیشہ دباغی تھا، مدینہ میں موجود تھا۔ ابوسفیان خندق کو تو عبور کرنے میں ناکام رہا، لیکن بنو قریظہ سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

محمد ﷺ کا اطلاعاتی نظام کام کر رہا تھا۔ آپ ﷺ کو اطلاع مل گئی کہ ابوسفیان، یہودی قبیلے بنو قریظہ کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے دو ساتھیوں سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو یہودیوں کے پاس بھیجا کہ انھیں قانون اساسی کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ یہودیوں نے مبہم سا جواب دیا اور ظاہر کیا کہ وہ مکّہ کے لشکر سے معاملہ کرنے کی جانب مائل ہیں۔

محمد ﷺ کو ایک اور اطلاع ملی کہ ابوسفیان اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ طے پانے والا ہے اور اس معاہدے کی بنا پر یہودی مسلمانوں پر عقب سے حملہ آور ہوں گے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر یہود (بنو قریظہ) نے عقب سے حملہ کیا تو

مسلمان دو تلواروں کے درمیان میں ہوں گے اور خندق مسلمانوں کو نہیں بچا سکے گی۔ عام مسلمانوں کو جب معلوم ہوا کہ معاہدہ طے پا جانے والا ہے تو خوفزدہ ہوئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی ہمیں خطرہ ہے کہ اگر یہودیوں نے عقب سے ہم پر حملہ کر دیا تو ہم نابود ہو جائیں گے۔

محمد ﷺ نے فرمایا: ابوسفیان کو امید ہے کہ یہودیوں کی کمک حاصل کر لے گا، لیکن ہماری امیدیں خدا سے وابستہ ہیں اور خداوند ہمیں تنہا نہیں رہنے دے گا۔ تم نے دیکھا کہ جنگ اُحد میں ہم نے زک اُٹھائی لیکن وہ بھی اس باعث کہ بعض مسلمانوں نے نظم و ضبط کا خیال نہ کیا، جو ہدایات انھیں دی گئی تھیں ان پر عمل نہیں کیا۔

آپ ﷺ کا ارشاد صحیح ثابت ہوا۔ خداوند نے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ جس وقت مسلمانوں کو یقین تھا کہ یہود اور قریش مکّہ میں معاہدہ ہوا چاہتا ہے، نعیم بن مسعود، محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جو قریش اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل میں رابطہ کا کام دے رہا تھا۔ اس نے حاضر ہو کر عرض کی۔ اگرچہ میری ماموریت یہ ہے کہ ابوسفیان اور یہودیوں کے درمیان اتحاد پیدا کروں۔ لیکن مدت سے میں آپ کا طرف دار ہوں، اور میں نہیں چاہتا کہ آپ شکست کھائیں، بلکہ میں آپ ﷺ کی فتح کا خواہش مند ہوں۔

محمد ﷺ نے جب نعیم بن مسعود کے خیالات کو سنا تو مطمئن ہوئے کہ لطف خداوندی ہمارے شامل حال ہے۔ وہ شخص جو مسلمانوں کی تباہی کے لیے وسیلہ بنا ہوا تھا، آج مسلمانوں کی حمایت پر آمادہ ہو گیا ہے۔

نعیم بن مسعود نے عرض کی کہ: میں کس طرح مسلمانوں کی خدمت بجا لا سکتا ہوں؟

محمد ﷺ نے فرمایا: چونکہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں، اس لیے دشمنوں سے متعلق ہر اطلاع اپنے مفاد میں استعمال کرنا ہم پر جائز ہے لہٰذا جو بھی اطلاع میسر آئے اسے تغیر دے کر دشمنوں تک پہنچائیں تو یہ عمل ایک جنگی چال ہو گی۔ پس یہودی قبیلہ اور قریش سے جو بھی اطلاع تمھیں ملے وہ مجھے بتلاؤ، پھر میں تمھیں بتاؤں گا کہ یہ اطلاع کس شکل و صورت میں ابوسفیان یا یہودیوں کو پہنچانی ہو گی۔

نعیم بن مسعود نے حکم کی تکمیل کی۔ اسی وقت یہودیوں کے پاس گیا اور جیسا کہ محمد ﷺ نے سمجھایا تھا ان سے کہا: تم جانتے ہو ایک مدت سے میں تمھارا دوست ہوں، پس امید کرتا ہوں تم مجھے اپنا خیر خواہ ہی سمجھتے ہو گے۔ تم خندق کے اس پار کی لشکر کی وجہ سے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ چونکہ مکّہ کے لشکری مدینہ سے نہیں ہیں اور نہ وہ قبائل جو ان کا ساتھ دے رہے ہیں، لہٰذا جب تک وہ جنگ شروع نہ کریں تم کوئی قدم نہ اُٹھانا۔ وہ لوگ بہرصورت جلد ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس وقت مدینہ میں تم ہو گے اور مسلمان۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ وہ جلد کوچ نہیں کریں گے اور جنگ جاری رہتی ہے لیکن یہ تو معلوم نہیں کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ جنگِ اُحد میں ابوسفیان کے مقابل کوئی خندق نہیں تھی، اس کا لشکر بھی مسلمانوں کے مقابلے میں چار گنا تھا پھر بھی وہ محمد ﷺ کو قتل نہ کر سکا۔ موجودہ صورت میں وہ کیسے محمد ﷺ پر بالادستی حاصل کر سکے گا کہ اسے معدوم کرے۔ اس لیے تم ذرا سوچ سمجھ کر مسلمانوں سے تعلقات ختم کرنا اور دیکھ لینا کہ آیا تمھارے لیے مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ سود مند ہو گا کہ نہیں؟

مزید کہا: میں چونکہ تمھارا دوست ہوں، اس لیے کہوں گا کہ مجھے ذاتی طور پر ابوسفیان اور دوسرے قبائل کی وفاداری پر اعتماد نہیں۔ ابھی اگر انھیں کسی خطرہ کا احساس ہو تو وہ تم کو اتحادی ہونے کے باوجود اکیلا چھوڑ جائیں گے۔ مسلمانوں سے قطعی تعلقات توڑنے سے پہلے تمھیں چاہیے کہ اہلِ قریش کے کچھ افراد کو اپنے پاس گروی (یرغمال) رکھو، تا کہ اہلِ قریش آخر وقت تک تمھارا ساتھ دینے پر مجبور ہوں اور جنگ بھی جاری رکھے۔ اگر تمھارے پاس یرغمالی نہ ہوئے تو جیسے ہی وہ خطرے کا احساس کریں گے تمھیں اکیلا چھوڑ جائیں گے۔

یہودیوں نے جب نعیم بن مسعود کے خیالات سنے تو قائل ہوئے اور یقین دلایا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے پہلے سوچیں گے۔ بعد میں نعیم بن مسعود نے ابوسفیان کے پاس جا کر کہا: تو جانتا ہے کہ میں قریش کے پکے دوستوں میں سے ہوں اور مکّہ کا رہنے والا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس جنگ میں شکست اُٹھاؤ۔ میری اطلاعات کے

مطابق بنو قریظہ ابھی تک مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور اپنی اس وفاداری کو نبھانے کے لیے انھوں نے ارادہ کیا ہے کہ تمھارے کچھ معتبر افراد کو تم سے بطور یرغمال لے کر محمد ﷺ کے حوالے کر دیں۔ تم یہودیوں سے کہو کہ وہ بروز ہفتہ جنگ شروع کریں اور اگر انھوں نے عذر تراشی کی تو تم سمجھ لو کہ وہ محض وقت گزار رہے ہیں اور مسلمانوں سے جنگ نہیں چاہتے۔

ابوسفیان بھی نعیم کی باتیں سن کر بہت فکر مند ہوا۔

مسلمانوں نے قریش کے سرداروں کی یرغمالی کا قصہ خوب پھیلایا۔ مسلمان کہتے: یہودی قریشی سرداروں کو یرغمال بنا کر ہمارے حوالے کر دیں گے اور ہم انھیں قتل کر دیں گے۔ جب آپ ﷺ سے اس خبر کی صحت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''شاید ہم نے ایسا حکم دیا ہو''۔

ہر شخص اپنے خیال کے مطابق اس فرمان کی تعبیر کرتا۔ مکّہ کے سرداروں کو یقین ہو گیا کہ بنو قریظہ اور مسلمانوں میں اتحاد کی خبر ٹھیک ہی ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے یہودیوں کو اس کھیل پر آمادہ کیا ہے کہ سردارانِ قریش کو یرغمال بنا کر محمد ﷺ کے حوالے کر دیں اور پھر وہ انھیں قتل کر دیں۔

یہودیوں نے بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد ابوسفیان کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ ہم مسلمانوں پر عقب سے حملہ کریں تو اسے قریش کے چند سردار ہمارے پاس یرغمال رکھنے ہوں گے، تا کہ جب ہم عقب پر حملہ کریں تو مکّہ کا لشکر ہمیں تنہا چھوڑ کر واپس کوچ نہ کر جائے۔

یہودیوں کا مطالبہ نعیم کے کہنے کے عین مطابق تھا۔ ابوسفیان اور دوسرے سرداروں نے سوچا کہ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہودی ہمیں دھوکا دیں گے۔ ان کا ارادہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش کو محمد ﷺ کے حوالے کریں تا کہ قتل کر دیے جائیں۔

ابوسفیان یرغمالی دینے پر آمادہ نہ ہوا اور مطالبہ کیا کہ وہ بروز ہفتہ مسلمانوں پر حملہ کا آغاز کریں۔ مزید کہا کہ جنگ طولانی ہو رہی ہے، پس اس سے زیادہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ تم مسلمانوں پر مقررہ دن حملہ کا آغاز کر دو۔ ہم اس پار حملہ کا آغاز کریں گے۔ ہماری یہ کوشش ہو گی کہ نقصانات کی پروا کیے بغیر مدینہ میں داخل ہو جائیں۔

یہودیوں نے کہا: ہم یوم سبت (ہفتہ کے دن) حملہ کا آغاز نہیں کریں گے۔ سب جانتے

ہیں جب بھی یہودی اس دن جنگ کا آغاز کریں تو دنیا میں بہت بڑی بدبختی سے دوچار ہوتے ہیں اور آخرت میں عذاب ہوگا۔

یوں اہلِ قریش اور یہودیوں کے درمیان شک کی دیوار حائل ہوگئی اور وہ دونوں مسلمانوں کے خلاف متحدہ اقدام نہ کر سکے۔ دس ہزار سپاہ کے ساتھ مدینہ کا محاصرہ کیے پندرہ دن گزر گئے۔ لشکر کے لیے رسد کی کمی نے ابوسفیان کے لیے مشکل پیدا کر دی۔ مسلمانوں کو مدینہ شہر کے اندر رسد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر مکّہ کے لشکریوں کو فاقوں کا سامنا تھا۔

ابوسفیان جب مدینہ کے لیے عازمِ سفر ہوا تھا تو اس کا خیال تھا کہ لشکر کے لیے رسد وہ مدینہ کے باغات اور کھیتوں سے حاصل کرے گا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ مسلمانوں نے محمد ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہر قسم کی خوراک کو مدینہ کے اندر منتقل کر لیا ہے اور خندق کے اس پار کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو مکّہ کے لشکری استعمال کر سکیں۔

اس فاقہ زدگی کے علاوہ سرد ہوائیں لشکر قریش کے لیے اذیت کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ مکّہ کے جنگجو گرم علاقوں کے رہنے والے تھے۔ سال کے اس حصہ میں جب کہ مدینہ کی راتیں بہت خنک ہوتی ہیں ان کے لیے خیموں میں راتیں کاٹنی بہت مشکل ہوئی جا رہی تھیں۔ دوسرے ماہ شوال ختم ہو رہا تھا۔ ذیقعد شروع ہونے والا تھا۔ ذیقعد چونکہ ماہ ہائے حرام میں سے ہے، اس لیے ابوسفیان کو فکر تھی کہ اگر شوال گزر گیا تو پھر مسلمانوں سے جنگ نہیں کر سکے گا، اِلّا یہ کہ تین ماہ بعد، اس لیے کہ ذیقعد، ذوالحجہ اور محرم میں جنگ حرام تھی۔

اس پندرہ روزہ محاصرہ کے دوران گاہے گاہے انفرادی مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ ایک موقع پر لشکر قریش کے دو افراد عمرو بن عبدؤد اور نوفل مخزومی، علیؓ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ نوفل مخزومی گھوڑے پر سوار ہو کر خندق میں کودا۔ اسی لمحے علیؓ بھی خندق میں کودے۔ گھوڑا اور نوفل دونوں خود کو سنبھال نہ سکے اور گر گئے۔ علیؓ اس فرصت سے فائدہ اُٹھا سکتے تھے، مگر آپ منتظر ہوئے تاکہ نوفل مخزومی زمین سے اُٹھ کر اپنی تلوار نکال لے۔ جس وقت نوفل خندق میں کودا تو سورج اس کی پشت پر غروب کے قریب تھا اور علیؓ کے سامنے ان کی آنکھیں خیرہ کیے دیتا تھا۔

علیؓ، نوفل کے مقابل ناموافق وضع میں تھے۔ ان حالات میں بھی علیؓ نے نوفل کو قبل اس کے کہ سورج غروب ہو اور تاریکی چھا جائے قتل کر دیا۔

چونکہ قریش کی عورتوں نے جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی نعشوں کا مُثلہ کیا تھا، ابوسفیان کو فکر ہوئی مبادا مسلمان جسد نوفل کو جو کہ لشکر کے دولت مند سرداروں میں سے تھا مثلہ کریں۔ علیؓ کو پیغام بھجوایا کہ میں تمھارے لیے ایک سو اونٹ بھجواؤں گا، بشرطیکہ تم نوفل مخزومی کی لاش بغیر سر تن سے جدا کیے اور بغیر کوئی دوسرے اعضا کاٹے صحیح سالم ہمارے حوالے کر دو۔ علیؓ نے ابوسفیان کی سو اونٹوں والی شرط تو قبول نہ کی، مگر نعش کو صحیح حالت میں واپس کر دیا کہ وہ اپنی لشکر گاہ میں لے جائیں۔

دوسرا قریشی سردار عُمرو بن عبدؤد دلیری اور شجاعت کے علاوہ جسمانی لحاظ سے بھی بہت طاقت ور تھا۔ اس نے علیؓ کو معرکہ شمشیر زنی کے دوران دو مرتبہ زخمی کیا، مگر علیؓ وہ نہیں تھے کہ دو زخموں کی وجہ سے ہار مان جاتے۔ دونوں میں جنگ جاری رہی، حتیٰ کہ عُمرو بن عبدؤد کے ہاتھ پر علیؓ کی شمشیر سے ضرب آئی۔ عُمرو گرا اور شمشیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

علیؓ نے نزدیک جا کر اس کی شمشیر پر پاؤں رکھ دیا تاکہ وہ اسے دوسرے ہاتھ سے نہ اُٹھا لے اور کہا کہ اے عُمرو! اگر تو اسلام قبول کر لے تو میں تجھے قتل نہیں کروں گا۔ عُمرو نے علیؓ کے منہ پر تھوک کر کہا: میں اسلام قبول نہیں کروں گا۔ علیؓ نے اپنے دامن سے چہرہ صاف کیا اور سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئے۔

عُمرو بن عبدؤد نے کہا: اے علیؓ! میں نے قبول اسلام سے انکار کیا ہے۔ کیوں مجھے قتل نہیں کرتے؟

علیؓ نے فرمایا: اس لیے کہ جب تو نے میرے چہرے پر تھوکا تو مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اگر میں اسی موقع پر تمھیں قتل کرتا تو وہ ایک انتقام ہوتا اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے غصے کی وجہ سے قتل کروں۔ ہم چونکہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اس لیے قتال بھی خدا کی خوشنودی کے لیے کرتے ہیں نہ کہ ذاتی انتقام کے لیے۔ اے عمرو! میں تمھیں دوبارہ اسلام قبول کرنے کی

دعوت دیتا ہوں۔ عمرو نے کہا میں مسلمان نہیں ہوں گا۔ اس وقت علیؓ نے اس کا سر قلم کر دیا۔

عمرو بن عبدوُد نے ایک بہت قیمتی زرہ پہنی ہوئی تھی جس میں طلائی کڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ علیؓ نے یہ زرہ اس کی بہن کو بھجوادی تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ علیؓ نے اسے زرہ کے لالچ میں قتل کیا ہے۔

فاقوں اور سردی کے علاوہ ایک ناگہانی طوفان آیا اور لشکر قریش کو بالکل متزلزل کر گیا۔ ایک رات تیز ہوا چلی یہاں تک کہ خیمے پھٹ گئے، آگ بجھ گئی اور ریت کے جھکڑ بڑی شدت سے چلے اور پھر بارش سے سیلاب آ گیا۔ ابوسفیان کو یہ خوف دامن گیر ہوا کہ اس حالت میں کہیں لشکرِ اسلام حملہ نہ کر دے لہٰذا کوچ کا حکم دے دیا۔

وقائع نویسوں نے لکھا ہے کہ ابوسفیان خود اس قدر جلدی میں تھا کہ فرار کے لیے جب اونٹ پر سوار ہوا تو اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ اس کا بندھا ہوا گھٹنا کھول لے۔ اونٹ کو چابک مارتا جاتا مگر اونٹ بے چارہ اپنی جگہ سے اُٹھنے نہ پایا۔ طوفانی رات کو مکّہ کے لشکر نے کوچ کیا اور اطراف مدینہ سے چلا گیا۔ جنگِ خندق یا جنگ احزاب اسی شب ختم ہوگئی۔

جنگِ خندق میں قریش کے آٹھ آدمی قتل ہوئے اور لشکرِ اسلام سے چھ افراد شہید ہوئے۔ یہ چودہ افراد نامور جنگجو تھے اور انفرادی معرکوں میں قتل اور شہید ہوئے۔

جنگ خندق کے خاتمے اور قریش کے لشکر کی واپسی کے بعد بھی مدینہ کا اقتصادی محاصرہ جوں کا توں تھا۔ مدینہ شہر دونوں اطراف یعنی خیبر جو شمال میں دو سو کلومیٹر اور مکّہ جو جنوب میں ساڑھے چار سو کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، کے درمیان ناکہ بند تھا۔ یہ دونوں شہر (خیبر و مکہ) مدینہ کے کسی قافلے کو آزادی سے عبور نہیں کرنے دیتے تھے اور یہ دونوں حریف طاقت ور بھی تھے۔ خیبر کے یہودی ایک دولت مند جماعت تھے۔ جتنا لشکر چاہیں مہیا کر سکتے تھے۔ مکّہ کے لوگ جماعتِ قریش کے ماتحت تھے اور قریش میں محمد ﷺ کے طاقت ور دشمن مثل ابوسفیان، عکرمہ، صفوان بن امیہ اور ابوسفیان کی بیوی ہند وغیرہ تھے۔ اقتصادی محاصرہ توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان ان دو حریفوں میں سے کسی ایک پر حملہ کر کے اسے تاخت کریں۔ خیبر

اور مکّہ کے درمیان معاونت کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اگر پیغمبرِ اسلام ﷺ اور مسلمان خیبر پر حملہ آور ہوتے ہیں تو مکّہ معاہدہ کے تحت فوری مداخلت کرتا ہے اور اگر مسلمان مکّہ کا رُخ کرتے ہیں تو خیبر کے یہودی مدینہ پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

مدینہ میں مسلمانوں کے دو حریف موجود تھے: ایک منافقین، دوسرے یہود بنو قریظہ۔

طبری نے لکھا ہے کہ منافق جب پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت مصمم ارادے سے عاری ہوتا ہے، لیکن جنگِ خندق میں منافقوں کے ارادوں میں قطعیت تھی اور انھوں نے متاسفانہ مکی لشکر کی طرف داری کی۔ طبری کے یہ الفاظ ایک ادبی مبالغہ ہیں۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ جب کبھی مسلمانوں اور مشرکین یا یہودیوں کے درمیان کسی اختلاف یا نزاع نے سر اُٹھایا تو منافقین غیر جانبدار ہو جاتے تھے، جب کہ بظاہر وہ مسلمان تھے۔ جنگِ خندق میں پہلی مرتبہ وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچے اور قریش کی حمایت کی۔ وہ بھی اس لیے کہ انھیں یقین تھا مکّہ کا دس ہزار کا لشکر مسلمانوں کو شکست دے گا اور محمد ﷺ قتل یا گرفتار ہو جائیں گے۔

مکّہ کا لشکر جب دو ہفتہ کے محاصرے کے بعد واپس کوچ کر گیا تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ منافقین نے مسلمانوں کے خلاف کوئی راست اقدام نہیں کیا تھا۔ ان کی طرف سے قریش کی حمایت ایک معنوی حمایت تھی۔ منافقین نے مکّہ والوں کی حمایت میں ظاہراً کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا تھا، جس سے ان کی طرف داری ظاہر ہو۔ جنگ کے خاتمے پر محمد ﷺ نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا، لیکن مسلمانوں نے جنگ کے دوران ان کی جو روش تھی اسے فراموش نہ کیا، اور جیسا کہ آئندہ ذکر آئے گا، مسلمانوں کا رویہ ان کی نسبت بہرحال تبدیل ہو گیا تھا۔

لیکن بنو قریظہ کے یہودیوں نے جنگِ خندق کے دوران مدینہ کے قانون اساسی کے خلاف روش اختیار کی تھی اور دشمن سے متحد ہونے کے لیے اقدام بھی کیے جب کہ مدینہ کے قانون اساسی کے مطابق انھیں مسلمانوں سے متحد ہو کر شہر کا دفاع کرنا تھا۔ جنگ اُحد میں محمد ﷺ نے خود ہی یہودیوں کو اجازت دے دی تھی کہ یہ ایک مذہبی جنگ ہے لہٰذا تم مجبور نہیں ہو کہ اس جنگ میں ہمارا ساتھ دو۔

جنگِ اُحد مدینہ سے باہر لڑی گئی تھی جس میں شہر کا دفاع شامل نہیں تھا لیکن جنگِ خندق شہر کے اندر رہ کر لڑی گئی تھی۔ یہ واضح ہے کہ محمد ﷺ نے جنگِ اُحد میں یہودیوں کو بے اعتمادی کی بنا پر واپس کر دیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگِ اُحد میں شہر کے دفاع کا مسئلہ نہیں تھا۔ لہٰذا جنگِ خندق میں یہودیوں نے قانونِ اساسی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی تھی اور مسلمانوں سے بدعہدی کی تھی۔

چونکہ بنی قریظہ کے یہودیوں کو اپنی اس بدعہدی کا احساس تھا، لہٰذا وہ جنگ کے خاتمے پر خود بخود اپنے مکانوں میں محصور ہو گئے۔ محمد ﷺ نے علیؑ کو ان یہودیوں کی سرکوبی کے لیے مامور فرمایا۔ علیؑ بن ابی طالب نے مسلمان سپاہیوں کا ایک جتھا اپنے ساتھ لیا اور بنی قریظہ کے محلّہ کی طرف چل دیے۔

یہودی جو زرگری، کشاورزی (زراعت) اور دباغی جیسے پیشوں سے منسلک تھے، کافی ثروتمند ہو چکے تھے۔ انھوں نے خوب مستحکم گھر بنائے ہوئے تھے یعنی یہودیوں کے گھر رہائش کے علاوہ ایک قلعہ کی صورت میں تھے۔ یہودیوں نے جو دیکھا کہ مکی لشکر کوئی فیصلہ کن اقدام کیے بغیر ہی واپس ہو گیا ہے تو وہ اپنے قلعہ نما گھروں میں اس ارادہ سے محصور ہو گئے کہ مسلمانوں کا مقابلہ کریں گے۔

علیؑ بن ابی طالب نے محاصرہ مکمل کر لینے کے بعد یہودیوں کو پیش کش کی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ لیکن بنو قریظہ کے یہودیوں نے کہا: ہم محمد ﷺ کو پیغمبر ہی نہیں مانتے کہ اس کے دین کو قبول کریں۔ ویسے بھی محمد ﷺ ایک عرب ہے اور عرب پیغمبر نہیں ہو سکتے۔ پیغمبر ہونے کی استعداد فقط بنی اسرائیل کے افراد میں ہے۔ تمام انبیا سلف بنی اسرائیل سے تھے اور اس کے بعد بھی بنی اسرائیل سے ہی منتخب ہوں گے۔

چار ہفتے اور بعض روایتوں کے مطابق چھ ہفتے کے محاصرہ کے بعد یہودیوں کو خوراک کی قلت کا سامنا ہونے لگا۔ بنی قریظہ کے رئیس کعب بن اسد نے فصیل کے اوپر سے کہا: ''اے علیؑ! ہمارے شیر خوار بچوں کے لیے بھی ہمارے پاس دودھ نہیں رہا۔ ان کی ماؤں کے دودھ

خشک ہو گئے ہیں، ان کی مائیں فاقوں کی وجہ سے بچوں کو دودھ مہیا نہیں کر سکتیں''۔

علیؑ نے جواب دیا: ''اے کعب بن اسد! ہم محاصرہ کرنے والے بھی چھوٹے بچوں کے باپ ہیں۔ ہمیں علم ہے بچہ جب بھوکا ہو کتنی بیتابی کا اظہار کرتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے تمھارے بچوں کو کوئی تکلیف پہنچائیں، مگر تم نے خود ہی مدینہ کے قانون اساسی کو پامال کیا۔ تم خود ہی اس پیتا کے ذمہ دار ہو۔ اب ہم مجبور ہیں، تم پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ آیا تمھیں ثالثی قبول ہے؟

کعب بن اسد نے کہا: میں اس کا جواب فوری نہیں دے سکتا۔ مجھے ایک ساعت مہلت دو تاکہ میں قبیلہ کے سرکردہ افراد سے مشورہ کر سکوں۔

مدینہ کے قانونِ اساسی کے مطابق قانون اساسی نافذ کرنے والے خود محمد ﷺ ہی تھے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے موجودہ اختلاف پر ثالث مقرر فرمائیں۔ علیؑ بن ابی طالب نے اپنی اس پیشکش کی آپ ﷺ سے اجازت حاصل کی اور یہودیوں کو مطلع کیا کہ ہم ثالثی کے لیے حاضر ہیں۔ کوئی ایک ساعت بعد کعب بن اسد نے فصیل کے اوپر سے فریاد کی: ''اے علیؑ! ہم ثالثی پر آمادہ ہیں''۔

علیؑ نے جواب دیا: چونکہ ہمارا ارادہ تم پر ظلم کرنے کا نہیں، اس لیے تم ثالث کے انتخاب میں آزاد ہو۔ جسے چاہو ثالث مقرر کر لو۔ ثالث کے انتخاب کے بعد ہم دو نمائندے اپنی طرف سے اور تم دو نمائندے اپنی طرف سے ثالث کے پاس بھیجو گے۔ قانونِ اساسی کی خلاف ورزی جو تم نے کی ہے ہمارے نمائندے اس کی بابت ثالث کو صورت حال سے آگاہ کریں گے اور تمھارے نمائندے جس طرح چاہیں اپنا کیس پیش کر سکتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی ختم ہونے پر ثالث جو بھی فیصلہ دے گا، اس کی پابندی تم پر لازم ہوگی۔ آیا تمھیں یہ قبول ہے؟

یہودیوں نے کہا: ہاں، اے علیؑ!

علیؑ بن ابی طالب نے فرمایا: ہم بھی اس فیصلہ کی پابندی کریں گے۔

جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہودی محاصرہ میں تھے۔ اس کے باوجود علیؑ نے حکم دیا کہ ایک ہفتہ کی خوراک یہودیوں کو دی جائے۔ جس قسم کا سامان یہ خواہش کریں انھیں دیا جائے

تا کہ ان کی عورتیں اس قابل ہو جائیں کہ بچے بھوکے نہ رہیں۔

بنو قریظہ کے یہودیوں نے باہمی مشورہ سے سعدؓ بن معاذ کو ثالث منتخب کیا۔

سعدؓ بن معاذ طرفین کا دوست اور قبیلہ اوس کا رئیس تھا۔

ثالث کے انتخاب کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں نے اپنے دو دو نمائندے ثالث کے پاس بھجوائے۔ مسلمان نمائندوں نے اپنی شکایت پیش کی۔ سب سے پہلے قانون اساسی سے سعدؓ بن معاذ کو مطلع کیا اور کہا کہ اس پیمان کے مطابق جب کبھی مدینہ پر دشمن حملہ آور ہو تو تمام قبائل پر فرض ہے کہ متحد ہو کر شہر کا دفاع کریں۔ لیکن بنو قریظہ نے بجائے اس کے مسلمانوں سے متحد رہتے اور دشمن کو پیچھے دھکیلنے میں مدد دیتے، دشمن ابوسفیان کے ساتھ ایک سازش کے تحت معاہدہ استوار کرنے کی کوشش کی، جس کے تحت انھیں عقب سے مسلمانوں پر حملہ کرنا تھا اور ابوسفیان کو سامنے سے پیش قدمی کرنی تھی۔ مسلمانوں کو دونوں اطراف سے گھیر کر ختم کرنا تھا۔

یہودیوں کے نمائندوں نے اپنے دفاع میں جنگِ اُحد کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اس جنگ میں مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے تھے، لیکن انھوں نے ہماری امداد قبول نہ کی۔ اسی بنا پر ہم نے یہ سمجھا کہ اب بھی جنگِ خندق کے موقع پر محمد ﷺ ہماری امداد قبول نہیں کریں گے۔

مسلمان نمائندوں نے کہا: بنو قریظہ نے قانونِ اساسی کے برخلاف دشمن سے مذاکرات شروع کیے اور اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی اور اگر محمد ﷺ ان مذاکرات کو ناکام کروانے میں کامیاب نہ ہوتے تو یہ معاہدہ طے پا چکا تھا اور بنو قریظہ ہمارے عقب پر حملہ کر چکے ہوتے۔

بنو قریظہ کے نمائندوں نے ابوسفیان سے مذاکرات کا انکار کیا۔

مسلمانوں نے نعیم بن مسعود کو بطور گواہ پیش کر دیا اور اس نے مذاکرات کی تمام تفصیل بیان کر دی۔ ان تمام یہودیوں کے نام بھی بتا دیے جنھوں نے مذاکرات میں حصہ لیا تھا۔ ثالثی کی کارروائی چند دن جاری رہی۔ سعدؓ بن معاذ نے طرفین اور ان کی شہادتوں کو سنا اور فیصلہ دیا۔ چونکہ بنو قریظہ کے یہودیوں نے قانونِ اساسی کے خلاف روش اختیار کی اور اسے پائمال کر کے چاہتے تھے کہ دشمن سے جو مدینہ کو تسخیر کرنے آیا تھا پیمان باندھیں،

مسلمانوں پر عقب سے حملہ کریں، لہٰذا یہ سب مستوجب سزائے موت ہیں۔

یہ فیصلہ مسلمانوں کا صادر کردہ نہیں تھا بلکہ اس شخص نے صادر کیا تھا جس کو یہودی اپنا دوست سمجھتے تھے اور خود ہی انھوں نے اسے اپنا ثالث منتخب کیا تھا۔

فیصلہ صادر ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے اعلان کیا: نابالغ لڑکے اور لڑکیاں، بوڑھے مرد اور عورتیں اس سزا سے معاف کیے جاتے ہیں۔ دوسرے اگر ایمان لے آئیں تو معاف کر دیے جائیں گے۔ اس اعلان پر بہت سے یہودی مسلمان ہو گئے۔

اس کے بعد علیؓ کو ایک اور ماموریت (ذمہ داری) دی گئی اور وہ یہ تھی کہ مکہ کو روانگی کی تیاری کریں جس کا آئندہ ذکر آئے گا۔ دوسری ماموریت پر جاتے ہوئے علیؓ کی آخری وصیت یہ تھی: عورتوں، لڑکیوں، شیرخوار اور نابالغ افراد کو اجازت ہے کہ وہ محاصرہ سے باہر آ جائیں، تا کہ جب دوبارہ جنگ شروع ہو تو بھوکوں نہ مریں۔ بنو قریظہ نے اس پر عمل کیا۔ بقیہ بنو قریظہ جنگ کرتے ہوئے قتل ہو گئے۔



عمرہ کے لیے روانگی

مسلمانوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر اقتصادی محاصرہ توڑنا ہے تو انھیں مکّہ یا خیبر دونوں میں سے ایک پر حملہ کرنا ہوگا۔ لیکن محمد ﷺ نے ایک اور ہی راہ نکالی جو کہ مسلمانوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ وہ یہ کہ عمرہ کی ادائگی کے لیے تمام مسلمانوں کے ہمراہ مکّہ جائیں۔

مکّہ وہ شہر تھا جہاں محمد ﷺ کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے گئے اور کوششیں کی گئیں۔ مکّہ وہی شہر تھا جہاں سے لشکر کئی دفعہ مدینہ پر حملہ آور ہوئے کہ مسلمانوں کو معدوم کر سکیں۔ ان سب باتوں کے باوجود آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کے ہمراہ مکّہ جا کر عمرہ ادا کرنے کا ارادہ فرمایا۔

مسلمان چونکہ اس فکر میں تھے کہ مکّہ جنگ کے لیے جائیں گے لہٰذا محمد ﷺ سے پوچھے: کیا مکّہ کو تسخیر کرنے کا ارادہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم صرف عمرہ کی ادائگی کے لیے مکّہ جا رہے ہیں۔

محمد ﷺ سردیوں کے موسم میں (مطابق ٦ ہجری) دو ہزار مسلمانوں اور چند سو اونٹوں کے ساتھ عازمِ مکّہ ہوئے۔ مسلمانوں کی تعداد دو ہزار سے کچھ متجاوز تھی جب کہ کچھ صحرا نشین مسلمان ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کا خیال تھا چونکہ قریش مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہیں اس لیے محمد ﷺ کو مکّہ میں قریش سے جنگ کرنی پڑے گی۔ وہ صحرا نشین نہیں چاہتے تھے کہ حرم میں جا کر لڑیں۔ مزید یہ کہ حضرت محمد ﷺ جب عازمِ مکّہ ہوئے، ماہ حرام شروع ہو چکے تھے۔ عرب ان مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ جنگ کریں۔ وہ لوگ جو آپ ﷺ کے ساتھ نہ گئے نومسلم تھے۔ ان کے عقیدہ میں بھی انصار و مہاجرین کی سی پختگی نہ تھی کہ محمد ﷺ کے حکم پر مطیع محض ہوں۔

مسلمان مہاجرین اس سفر سے بہت خوش تھے۔ مکّہ شہر تمام اعراب کی نظر میں ایک محترم و مقدس شہر تھا۔ نیز وہاں آدمؑ نے پہلی عبادت گاہ بنائی۔ بعدازاں ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی بنا رکھی کہ اس گھر میں خداوند کی عبادت کرے۔

مکّہ، مہاجرین کا وطن تھا۔ وہ وہاں پیدا ہوئے تھے اور ان کی یہ آرزو تھی کہ وہ اپنے وطن واپس جائیں، اپنے عزیز و اقربا میں زندگی بسر کریں۔ وہیں موت سے ہمکنار ہوں۔ ایک اصلی عرب کے لیے وطن سے دور ہونا، عزیز و اقربا سے جدائی ایک بہت بڑا سانحہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ کسی کو نفرین کرتے تو کہتے "تجھے قبیلہ سے دور غریب الوطنی میں موت آئے"۔ لہٰذا یہ فطری امر ہے کہ جب مسلمانوں نے مدینہ سے مکّہ کا سفر شروع کیا تو مہاجرین خوش خوش سفر کر رہے تھے۔

مکّہ کو مذہب کے لحاظ سے بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی اور تمام مذاہب کے پیروکاروں نے کعبہ کے آس پاس اپنے اپنے حجرے بنا رکھے تھے اور اپنے بتوں کو ان حجروں میں نصب کر رکھا تھا۔ ہر وہ شخص جو زیارت کے لیے مکّہ جاتا خانہ کعبہ میں عبادت اور خانہ کعبہ کا طواف کرتا تھا۔ چونکہ اسلام بھی مکّہ والوں کی دانست میں ایک مذہب تھا۔ لہٰذا مکّہ والے مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ سے روکنے کے مجاز نہیں تھے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اگر محمد ﷺ نے بتوں کی مخالفت نہ کی ہوتی اور بتوں کے زوال کے خواہاں نہ ہوتے تو کوئی شخص بھی اس نئے مذہب کی مخالفت نہ کرتا۔

جماعتِ قریش نے اسلام کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ محمد ﷺ کہتے تھے کہ تمام بت پرست مذاہب باطل ہیں۔ ان بتوں کو تباہ کر کے خدائے یگانہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ لیکن اب جب کہ محمد ﷺ مکّہ جا رہے تھے، آپ ﷺ کا مقصد فقط طوافِ کعبہ تھا، بالکل ایسے ہی جیسے دوسرے مذاہب کے پیروکار وہاں جا کر عبادت اور طواف کیا کرتے تھے۔

قریش اُصولاً محمد ﷺ کے اس اقدام کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے لیکن دشمنی اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی مسلمان مکّہ میں داخل ہوں۔ جب محمد ﷺ نے اس سفر کا آغاز کیا تو ابوسفیان مکّہ میں موجود نہیں تھا۔ دوسرے اہلِ مکّہ نہیں جانتے تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق کیا اقدام کیا جائے۔

اہلِ مکّہ کی عافیت اسی میں تھی کہ زائرین جو جزیرہ نمائے عرب کے اطراف سے آئیں

بلاامتیاز مذہب مکّہ میں خرید وفروخت کریں اور ایامِ حج میں قربانی کریں، تاکہ مکّہ والوں کو گوشت میسر آئے۔ اب اگر وہ دو ہزار مسلمانوں کی راہ روکتے ہیں تو اس میں مکّہ والوں کا ہی نقصان ہوتا تھا۔ دوسرے اگر ان کے داخلے پر پابندی لگائی جاتی تو یہ خلافِ ضابطہ ہوتا۔ تاہم، اتنی جنگ وجدل کے بعد ان کے لیے انھیں مکّہ میں آزادانہ داخل ہونے دینا بھی مشکل تھا۔

ایک طرف وہ مسلمانوں کے مذہب کو دوسرے مذاہب سے جدا گردانتے اور مسلمانوں کو مکّہ میں داخلے کی اجازت دینے سے انکاری تھے۔ دوسری طرف کعبہ ایک عالمی اور غیر جانبدار علاقہ تھا۔ اس جزوی پابندی سے اس کی غیر جانبداری پر حرف آتا تھا۔ ایک ہی اقدام اس کے قانونِ غیر جانبداری کو ختم کر کے رکھ دیتا اور مکّہ کے تجارتی میلے میں تعطل پیدا ہو جاتا۔

دوسری صورت میں اگر مسلمانوں کو اجازت دی جاتی تو ممکن تھا مسلمان مکّہ کو زیرِ تصرف لے آئیں۔ لہٰذا ان حالات میں مکّہ والوں نے مسلمانوں کو روکنے کا فیصلہ کیا۔ چالیس سواروں کو مامور کیا گیا کہ آگے بڑھ کر مسلمانوں کو روکیں اور انھیں آگے بڑھنے سے منع کریں۔ لیکن یہ چالیس سوار جب مسلمانوں کے نزدیک پہنچے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ان کے ہتھیار اتروا لیے گئے۔

تاہم، محمد ﷺ نے ہتھیار واپس کرنے اور انھیں بغیر فدیہ کے رہا کرنے کا حکم دیا۔

یہ حکم خود مکّہ کے سواروں کے لیے عجیب تھا، اس لیے کہ یہ عربوں کی روایات کے خلاف تھا۔ عربستان میں جنگی اسیروں کو بغیر ادائیگی فدیہ یا مبادلہ آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔

کچھ مسلمان افراد نے محمد ﷺ سے پوچھا: ان چالیس افراد کو بغیر فدیہ کے کیوں آزاد کیا گیا ہے اور پھر ان کا اسلحہ بھی واپس کر دیا گیا ہے۔

محمد ﷺ نے وضاحت فرمائی: ہم زائر ہیں، جنگ ہمارا مقصد نہیں۔ زائر جنگ نہیں کیا کرتے اور قیدی نہیں بنایا کرتے۔

اس کے فوری بعد دو سو سوار مکّہ سے مسلمانوں کے پاس پہنچے۔ ان کا مقصد بھی مسلمانوں کو مکّہ میں داخل ہونے سے روکنا تھا۔ ان سواروں کا سالار ابوجہل کا لڑکا عکرمہ تھا۔ ان

سواروں نے دیکھا کہ تمام مسلمان حالتِ نماز میں ہیں۔ تمام کا رُخ مکّہ کی طرف ہے۔ یہ منظر اتنا پرشکوہ تھا کہ عکرمہ کو جرأت نہ ہوئی کہ مسلمانوں پر حملہ کرے۔ بلکہ واپس مڑ کر تھوڑی دور ٹھہر گیا تاکہ مسلمانوں کا راستہ روک سکے۔

محمد ﷺ نے مکّہ والوں کو اپنے مقصد سے آگاہ کرنے کے لیے ایک ایلچی مکّہ بھجوایا کہ وہ جا کر وضاحت کرے کہ ہمارا مقصد زیارتِ کعبہ ہے جنگ نہیں، اس لیے ہم اسلحے سے لیس نہیں ہیں، اگر ہمارا مقصد جنگ ہوتا تو ہر قسم کا اسلحہ اپنے ہمراہ لاتے۔

عکرمہ نے مسلمانوں کے ایلچی کو مکّہ نہ جانے دیا بلکہ ایلچی اور اس کے ساتھیوں کا بیابان میں تعاقب کیا۔ ایلچی اور اس کے ساتھی تعاقب سے بچنے کے لیے صحرا میں سرگرداں ہو گئے۔ پیاس کی وجہ سے ان کی ہلاکت میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی مگر خوش قسمتی سے اپنے لشکر میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

عکرمہ جو تعاقب میں تھا کہیں پیچھے رہ گیا اور مسلمان پھر مکّہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب مسلمان حرم کی حدود کے نزدیک پہنچے تو محمد ﷺ نے وہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ قربانی والے جانوروں کو نشان لگا دو۔ قربانی کے جانوروں کو نشان لگانا دورِ جاہلیت کی ایک مخصوص رسم تھی۔ محمد ﷺ نے اس رسم کو ادا کرنے کا حکم دیا تاکہ مکّہ والے جان لیں کہ مسلمانوں کا مقصد واقعتاً زیارتِ کعبہ ہے، جنگ نہیں۔

بہت سے مناسکِ حج جو بعثت نبویؐ سے پہلے مروّج تھے، آج بھی معمول ہیں۔ حج ہو یا عمرہ، پیغمبر ﷺ اسلام نے ان مراسم کو اس لیے ملحوظ رکھا کہ عرب دینِ اسلام سے وحشت زدہ نہ ہوں۔ انھیں بدعتی نہ سمجھ لیں کہ ان کی تمام رسومات کو ختم کر دیا گیا ہے۔

اس سفر میں بھی محمد ﷺ نے ان رسومات کو ملحوظ رکھا، تاکہ عرب جان لیں کہ ان کا مقصد حج کی رسوم وشعائر کو ختم کرنا نہیں ہے۔ مکّہ کی مرکزی حیثیت ختم کرنا مقصود نہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ خانہ کعبہ مسلمانوں کی نظر میں اتنا ہی محترم ہے جتنا کہ دوسرے مذاہب والوں کی نگاہ میں یعنی اگر ایک بت پرست کی نظر میں خانہ کعبہ محترم ہے تو مسلمان بھی اس گھر کے لیے اتنے ہی احترام کے قائل ہیں۔

محمد ﷺ اہلِ مکّہ سے زیادہ فہیم تھے۔ آپ ﷺ کو معلوم تھا قریش بتوں سے قلبی تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کا یہ تمام لگاؤ محض تجارتی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ جماعتِ قریش کا احترامِ کعبہ اقتصادی منفعت کے پیشِ نظر تھا۔ اگر کعبہ کی مرکزیت اور تقدس ختم ہوتا تو جماعتِ قریش کی زندگی میں بھی اختلال واقع ہو جاتا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ جانتے تھے کہ قریش و اطراف مکّہ میں بسنے والے قبائل کی نگاہ میں زیارتِ کعبہ کے لیے ظاہری اور مادی رسومات اہمیت رکھتی ہیں۔ قریش کا خیال تھا کہ جب تک یہ رسومات باقی ہیں، عربستان کے تمام مذاہب کا مرکز مکّہ ہی رہے گا، تجارت برقرار رہے گی اور وسائل زندگی میسر آنے میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔

ابنِ ہشام، حمید اللہ، سرخسی، طبری، ابوداؤد اور سہیلی، یہ تمام مؤرخین اسلام جو آپ ﷺ کی زندگی کے شارح ہیں، لکھتے ہیں: جس وقت قربانی کے جانوروں کو نشان زدہ کیا جا رہا تھا محمد ﷺ نے کچھ لوگوں کو اردگرد کے قبائل کی طرف بھیجا کہ انھیں دعوت دیں کہ وہ آکر اس رسم کا مشاہدہ کریں۔ نشان زدگی جسے عرب ''سلیقہ'' کہتے ہیں پوری کی گئی۔ ہر اونٹ کی گردن میں ''افساری'' باندھی گئی۔ سلیقہ کے معنی جو آج کل لیے جاتے ہیں وہ ہیں آدابِ معاشرت میں روش مخصوص یا کھانا کھانے میں روش مخصوص یا اظہارِ ہنر و ادب۔ زیادہ تر یہ لفظ (سلیقہ) ذوق کے ساتھ استعمال ہوا ہے یعنی ذوق و سلیقہ۔ لیکن قدیم زمانہ میں ''سلیقہ'' بمعنی علامت تھا۔ وہ ایسے کہ اونٹ کے ہودہ کو اس کے پہلو سے باندھتے تھے۔ جب اونٹوں کو قربانی کے لیے مخصوص کرتے تو ان کی جلد پر تسمہ یا پٹہ کا نشان لگاتے اور اسی علامت کو سلیقہ کہا جاتا تھا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے مادہ شتر کو جزیرہ نمائے عرب میں شان و شوکت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ یہ بہت مہنگے ہوتے تھے۔ مادہ شتر ایک تیز رفتار اور مخصوص سواری شمار ہوتی تھی اور اس کو ''شجانہ'' کہتے تھے۔ اس سفر میں محمد ﷺ کچھ شجانہ اپنے ہمراہ لائے تھے تا کہ عربوں کو معلوم ہو کہ مسلمان مناسکِ حج کی ادائیگی میں بت پرستوں سے زیادہ سنجیدہ اور سخت ہیں۔ مسلمانوں نے قربانی کے جانوروں کو نشان لگانے کے بعد دوبارہ مکّہ کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ لیکن اس دفعہ عکرمہ نے اپنے دو سو سواروں کے ساتھ راستہ کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ ابنِ ہشام نے

عکرمہ کا قول نقل کیا ہے ''اتینا هم عند السله'' یعنی جب ہم مسلمانوں کے قریب پہنچے تو ان کی تلواریں نیاموں سے باہر تھیں۔ لیکن تلوار کو ان دنوں جنگی ہتھیار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جسے مرد ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ آج بھی جزیرہ نمائے عرب اور خلیج فارس کے جنوبی ساحل پر رہنے والے اپنے لباس پر خنجر لگاتے ہیں اور چونکہ یہ خنجر جزو لباس ہے لہٰذا اسے جنگی ہتھیار شمار نہیں کیا جاتا۔

اگر مسلمانوں کی تلواریں نیاموں سے باہر تھیں تو ظاہر ہے کہ عکرمہ کے سوار دستہ کو دیکھ کر نیاموں سے تلواریں نکالی ہوں گی۔ لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ تلوار استعمال نہیں ہوئی۔ محمد ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ اس سفر میں خون ریزی ہو۔ عکرمہ کا قول ضعیف ہے۔

جس جگہ محمد ﷺ اونٹوں کو نشان لگانے کے لیے ٹھیرے اس جگہ کا نام ذوالحلیفہ[1] ہے۔ اسی جگہ پر احرام باندھے گئے اور دوبارہ سفر شروع ہوا۔ ذوالحلیفہ سے مکّہ کے لیے پہاڑی راستہ اختیار کیا گیا تا کہ ہر قسم کے ناخوشگوار واقعہ سے بچا جا سکے۔ مسلمانوں نے اس راستہ پر پیاس اور گرمی سے بہت تکلیف اُٹھائی۔ یہ تکلیف دہ سفر کر کے مسلمان حدیبیہ پہنچے۔

حدیبیہ مکّہ سے سولہ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ مکّہ مسلمانوں کے سامنے تھا۔ جو مسلمان مکّہ کے باسی تھے، ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔ انھیں یقین تھا دو ساعت بعد وہ مکّہ میں ہوں گے اور وطنِ مالوف کو دیکھ سکیں گے۔ لیکن عین اس وقت پیغمبرِ اسلام ﷺ کا اونٹ موسوم بہ ثعلب ٹھیرا، اور پھر بیٹھ گیا۔ محمد ﷺ نے اونٹ کو اُٹھایا مگر وہ بجائے آگے بڑھنے کے چند قدم پیچھے ہٹ کر پھر بیٹھ گیا۔

محمد ﷺ اونٹ سے اُتر آئے اور فرمایا: ''اللہ کی یہی مرضی ہے کہ ہم یہاں توقف کریں'' پس تمام مسلمان اونٹوں سے اتر آئے۔ وہ بہت غمزدہ تھے کہ مکّہ کے دروازے پر پہنچ کر حکم توقف ملا۔ جہاں مسلمانوں نے توقف کیا اس جگہ کا نام غدیر الاشطاط تھا جو کہ حدیبیہ کی حدود میں ایک مقام ہے۔ موسمِ بہار میں اس مقام پر پانی مل جایا کرتا تھا لیکن جب مسلمانوں نے وہاں توقف کیا تو پانی میسر نہیں تھا۔

۱۔ ذوالحلیفہ مدینہ منورہ سے متصل ہے۔ مصنف کو اس میں مغالطہ ہوا ہے۔

مسلمان، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے حضور گئے اور عرض کی: ہم دو ہزار کی جمعیت ہیں (ایک روایت میں ایک ہزار پانچ سو باون اور دوسری روایت میں ایک ہزار چھ سو افراد مذکور ہیں) اور کئی سو اونٹ ہمارے ساتھ ہیں۔ اس بے آب علاقہ میں ہم نہیں ٹھہر سکتے۔ بہتر ہوگا کہ ہم کچھ آگے بڑھ کر جہاں پانی ہو قیام کریں۔

محمد ﷺ جانتے تھے کہ اگر آگے بڑھے تو مسلمانوں اور مکہ والوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی اور حرم کی سرزمین میں خون بہے گا۔ علاوہ ازیں ماہ ہائے حرام میں جنگ حرام ہے۔

اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ہم اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ خداوند کا حکم یہی ہے کہ ہم اسی جگہ توقف کریں۔ مسلمانوں نے عرض کی: پھر پانی کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

روایت ہے کہ محمد ﷺ نے دستِ مبارک اُٹھا کر دعا کی: ''اے اللہ! اگر ہمیں پانی نہ ملا تو مسلمان سرزمین حرم میں داخل ہو جائیں گے''۔ جیسے ہی محمد ﷺ نے دعا ختم کی، ایک مسلمان جو کاریز کی کھدائی میں بہت تجربہ کار تھا، اس نے کہا: اے محمد ﷺ! آپ ﷺ کے پاؤں کے نیچے پانی ہے۔ اگر کھدائی کی جائے تو مل جائے گا۔ مسلمانوں نے اس مقام پر کھدائی کی اور پانی حاصل کر لیا۔ اس کنویں سے اس قدر پانی حاصل ہوا کہ جب تک مسلمان وہاں رہے ان کی ضرورت سے زیادہ ثابت ہوا۔

جب مسلمان پانی کی فکر سے آزاد ہوئے تو محمد ﷺ نے عمرؓ سے فرمایا: تم ایک ایلچی کی حیثیت سے مکہ جاؤ اور قریش کو سمجھاؤ کہ ہم صرف زیارت کعبہ کا قصد لے کر مکہ آئے ہیں۔ ہمارا جنگ کرنے کا قطعی ارادہ نہیں۔ اور ان سے خواہش کرو کہ ہم مکہ آ کر زیارت کعبہ کر لیں۔

عمرؓ نے عرض کی: اے محمد ﷺ! میں یہ کام نہیں کروں گا۔ آپ ﷺ جب مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ زیارتِ کعبہ کر سکتے ہیں، پھر آپ ﷺ قریش سے کیوں اجازت کے طالب ہیں؟

عمرؓ ایک قوی ارادہ مگر سادہ لوح انسان تھے۔ وہ بعض سیاسی نکات کی تہ کو نہ پا سکے۔ عمرؓ ذکی شمار ہوتے تھے۔ عرب ان اشخاص کو جو راست گو اور درست کردار ہوتے ''ذکی'' کہتے

تھے۔ انسان کو زندگی میں ایسے مراحل پیش آتے ہیں جو وضع کے اعتبار سے نہ بد ہوتے ہیں نہ خوب۔ ان کا شمار نہ اچھائی میں ہوتا ہے اور نہ برائی میں۔

لیکن عمرؓ ان اشخاص سے بالاتر اور راست رو تھے۔ عمرؓ کی نظر میں اچھائی ہو یا برائی، عدل ہو یا ظلم، سچ ہو یا جھوٹ، ان میں راہِ متوسط کوئی نہیں تھی۔ عمرؓ کے لیے دین اسلام ایک سچا دین تھا۔ تائید خداوندی بھی شاملِ حال تھی۔ لہٰذا ان کے خیال میں مکہ میں داخلے کے لیے قریش سے اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قریش کے پاس بطور ایلچی جانے کو تیار نہ ہوئے۔ لہٰذا اس پر عثمانؓ کو مامور کیا گیا۔

عثمانؓ، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے داماد تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے پہلے حبشہ اور بعدازاں مدینہ ہجرت کی۔ عثمانؓ پہلے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بیٹی رقیہؓ کے شوہر تھے۔ ان کی وفات کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دوسری بیٹی ام کلثومؓ کے شوہر ہوئے۔

عثمانؓ ایک خوش لباس اور خوش گفتار مرد تھے۔ وہ بات چیت میں کسی موضوع پر فوری مخالفت کے عادی نہیں تھے جب کہ عمرؓ بغیر کسی جھجک اور مصلحت کے اپنا عقیدہ ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ عثمانؓ ایک مجلسی آدمی تھے اور ان لوگوں کی طرح جو زیادہ تر مجالس میں بیٹھتے ہوں، ان کی اس طرح بات کرنے کی عادت تھی کہ کسی پر گراں نہ گزرتی۔ عثمانؓ حکم ملتے ہی اونٹ پر سوار ہوئے اور مکہ کی راہ لی مگر واپسی میں تاخیر کر دی۔ مسلمانوں میں یہ خبر اُڑی کہ عثمانؓ کو مکہ میں روک لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ خبر بھی اُڑ گئی کہ عثمانؓ قتل کر دیے گئے ہیں۔

جب پیغمبرِ اسلام ﷺ نے سنا کہ عثمانؓ قتل کر دیے گئے ہیں تو اپنا رویہ بدلنے کا ارادہ کیا۔ آپ ﷺ کو اس سفر کا مقصد بھی یاد تھا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ہر طور مکہ والوں سے صلح و آشتی رہے۔ اہلِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو، تاکہ مدینہ اقتصادی محاصرے سے نجات حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ اپنے رویہ سے یہ بھی واضح کر دینا چاہتے تھے کہ اسلام وہ دین ہے جو عربوں کا مخالف نہیں اور انھی کی طرح کعبہ کو محترم رکھتا ہے۔

قریش کو یہ وہم ہو چلا تھا کہ ابرہہ کی طرح محمد ﷺ بھی چونکہ جدید دین لائے ہیں، وہ بتوں کو ختم کر کے مکّہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دیں گے۔ قریش کے لیے مکّہ کا مذہبی مرکز ہونا اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر فقط تجارتی نقطۂ نگاہ سے اس کی مذہبی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر محمد ﷺ بتوں کو کعبہ سے اُٹھوا دیں گے یا توڑ دیں گے تو کعبہ کی مرکزی حیثیت ختم ہو جائے گی اور ان کی تجارت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ انھی وجوہ کی بنا پر قریش محمد ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ پیغمبر ﷺ اسلام نے عمرہ کا پروگرام بنایا تا کہ قریش پر ثابت کر سکیں کہ مسلمان بھی کعبہ کے بہت زیادہ احترام کے قائل ہیں۔

لیکن جب عثمانؓ کے قتل کی خبر محمد ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس علاقہ میں موجود ایک بڑے درخت کے نیچے اکٹھا کیا۔ یہ درخت اس قدر بڑا تھا کہ تمام مسلمان اس کے نیچے بیٹھ سکتے تھے۔ اس وقت نبی ﷺ نے مسلمانوں کو مخاطب کیا: "میں نے تمھیں یہاں اس لیے جمع کیا ہے کہ تم سے عہد لوں کہ بغیر کسی حیل و حجت کے تم میرے احکام کی اطاعت کرو گے، خواہ وہ احکام تمھارے مزاج کے برخلاف اور عقل سے بالا ہی کیوں نہ ہوں۔

جب پیغمبرِ اسلام ﷺ کا خطاب تمام ہوا تو ایک مسلمان جس کا نام سنان تھا آگے بڑھا اور کہا: اے محمد ﷺ! میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ ﷺ کے ہر حکم کو بلا تاخیر بجا لاؤں گا، خواہ وہ حکم میری نظر میں اچھا ہو یا اچھا نہ ہو، اسے عقل کے مطابق سمجھوں یا نہ سمجھوں۔ یہ کہہ کر وہ محمد ﷺ کے قریب گیا اور بیعت کے لیے اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے ہاتھ میں دیا۔

باقی مسلمان بھی یکایک محمد ﷺ کے قریب ہوئے اور ان سے بیعت کی یعنی عہد کیا کہ جو حکم بھی محمد ﷺ کی طرف سے صادر ہوگا اس کی موقع پر تعمیل اور اسے نافذ کریں گے۔

اس بیعت کو "بیعت الرضوان" کا نام دیا گیا۔ خداوند نے قرآن میں اس بیعت کی اہمیت بیان کی اور سورۂ فتح کی آیت اُٹھارہ میں اپنی رضامندی کا اظہار اس طرح فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ "اے محمد ﷺ! جب

مومنوں نے درخت کے نیچے تم سے بیعت کی، خداوند ان سے راضی ہوا۔ خداوند کو معلوم تھا کہ مومنوں کے دلوں میں کیا ہے۔ ان پر وہ چیز نازل کی گئی جو ان کے لیے باعثِ تسکین ہوئی اور صلہ میں ان کو جلد ہی فتح یاب کیا جائے گا"۔

غرض یہ کہ مسلمانوں نے حدیبیہ میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی نسبت جس صدق و اخلاص کا اظہار کیا، اس سے خداوند کو ان کا مافی الضمیر معلوم ہوا اور اس نے جان لیا کہ مسلمان واقعتاً پیغمبرِ اسلام ﷺ کے وفادار ہیں۔

اہلِ مکّہ اور قریش بیعت الرضوان سے خوفزدہ ہو گئے۔ جماعتِ قریش نے اس بیعت سے یہ اخذ کیا کہ محمد ﷺ مکّہ پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ جس کسی نے مزاحمت کی اسے قتل کر دیا جائے گا اور جو مرد و زن سرِ تسلیم خم کریں گے غلام اور کنیزیں بنا لیے جائیں گے۔

جماعتِ قریش پچھلی تین جنگوں بدر، اُحد اور خندق میں محمد ﷺ کی جنگی لیاقت کے قائل ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی ثابت قدمی بھی دیکھ چکے تھے۔ وہ اب اس اندیشہ میں تھے کہ جس وقت بھی محمد ﷺ نے مکّہ پر حملہ کیا وہ یقیناً شہر کو تسخیر کر لیں گے۔ یہی اندیشہ عثمانؓ کی فوری آزادی کا باعث ہوا۔ وہ مکّہ سے حدیبیہ پہنچے اور محمد ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ قریش آپ ﷺ سے مذاکرات کرنے پر آمادہ ہیں اور اس کے لیے کسی آدمی کو بھیجنے پر مائل ہیں۔

مذاکرات پر آمادگی کے علاوہ اشرافِ مکّہ نے عکرمہ کو جو کہ کوہستانی علاقے کا چکر کاٹ کر حدیبیہ پہنچ چکا تھا، حکم دیا کہ جنگی مظاہرہ نہ کرے اور مسلمانوں کے مزاحم نہ ہو۔

اگر محمد ﷺ، عمرؓ کی رائے پر عمل فرماتے تو یقیناً خون ریزی ہوتی اور اشرافِ مکّہ کو ایک بہانہ مل جاتا کہ محمد ﷺ نے حرم کعبہ کے اندر ماہ حرام میں خون ریزی کی ہے، لیکن محمد ﷺ نے ایک قطرہ خون بہائے بغیر ہی قریش کو اپنی روش تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ جنگِ اُحد جنگی ماہرین کی نگاہ میں ایک شکست نہ تھی، اس لیے کہ مکّہ کا لشکر اسلامی لشکر کو نابود نہیں کر سکا تھا اور نہ اسلامی مملکت (مدینہ) پر تصرف حاصل کر سکا تھا۔ اسی طرح

محمد ﷺ کا حدیبیہ میں توقف کرنا، برخلاف اس کے جو بعض وقائع نگاروں نے لکھا ہے، ایک سیاسی شکست نہیں تھی بلکہ ایک سیاسی کامیابی شمار ہوتی ہے۔ ایک غیر سیاسی فہم وشعور کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے سیاسی اقدام سے، حریف کو اپنے ارادے کا مطیع کرلیا۔

مذاکراتی ٹیم بھجوانے سے قریش کا مقصد صرف مذاکرات ہی نہ تھا بلکہ یہ دیکھنا بھی تھا کہ مسلمان مسلح ہیں یا نہیں اور اگر مسلح ہیں تو محمد ﷺ کے وہ کس حد تک وفادار ہیں۔ قریش کی طرف سے پہلا آدمی جو مذاکرات کے لیے مامور ہوا وہ عروہ بن مسعود ثقفی تھا۔ وہ قبیلہ ثقیف سے تھا اور طائف کے اشراف میں سے تھا۔ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ طائف سے نقل مکانی کرکے اب مکّہ میں مقیم ہو چکا تھا۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے اسی بیعت الرضوان والے درخت کے نیچے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے ملاقات کی اور پوچھا: آپ ﷺ کا مکّہ آنے کا مقصد کیا ہے؟

محمد ﷺ نے فرمایا: ”ہم فقط خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ جنگ قطعی ہمارا مقصد نہیں“۔ پھر مسلمانوں کو مخاطب ہو کر فرمایا: عروہ کو قربانی کے نشان شدہ اونٹ دکھائے جائیں۔

عروہ چند مسلمانوں کے ہمراہ گیا اور قربانی کے اونٹوں کو دیکھ کر واپس آیا۔ مگر گومگو اور بے یقینی کی کیفیت اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ لہٰذا اپنے ہاتھ کو آگے بڑھا کر محمد ﷺ کے چہرہ مبارک پر رکھ دیا اور کہا: اے محمد ﷺ! کیا آپ ﷺ کو یقین ہے کہ آپ کے ساتھی جو یہاں اردگرد کھڑے ہیں جنگ چھڑ جانے پر آپ کے وفادار رہیں گے۔ آپ کو تنہا نہ چھوڑ جائیں گے۔

اسی دوران ایک مسلمان جس کا نام مغیرہ بن شعبہ تھا، اس نے اپنی شمشیر کی نوک سے عروہ کے ہاتھ پر خراش لگائی اور کہا: اے عروہ! مؤدب رہو اور کلام کرتے وقت اپنے ہاتھ کو رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر مت رگڑو۔

عروہ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ابوبکرؓ نے کہا: اگر تو ایک ایلچی کی حیثیت میں نہ ہوتا تو ہم تجھے اس توہین کی پاداش میں قتل کر دیتے۔ ہم تجھے بتائے دیتے ہیں کہ ہم جنگ کے موقع پر اپنے پیغمبر ﷺ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تو جنگِ بدر و اُحد میں ہوتا تو رسول اللہ کے حق میں ہماری فداکاری دیکھ چکا ہوتا۔

عروہ مکّہ لوٹ آیا اور قریش کے بزرگوں سے کہا: میں نے روم اور حبشہ کے دربار دیکھے ہیں لیکن مسلمانوں کی وفاداری محمد ﷺ کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہے جو میں نے روم وحبشہ میں قیصر اور نجاشی کی بابت محسوس کی تھی۔ عروہ کے بعد قبیلہ بنی کنانہ کا ایک شخص مکّہ سے حدیبیہ پہنچا۔ اس کی آمد کا مقصود بھی محمد ﷺ اور مسلمانوں سے مل کر ان کے مقصد کا تعین کرنا تھا۔

محمد ﷺ کو اطلاع بہم پہنچائی گئی کہ مکّہ سے جو شخص آیا ہے وہ بنی کنانہ کا ایک فرد ہے۔

محمد ﷺ نے فرمایا: اس آدمی کا قبیلہ قربانی کے اونٹوں کی بہت آرائش کرتا ہے۔ تم قربانی کے اونٹوں کو ہانک کر اس کی طرف لے جاؤ کہ وہ دیکھ لے۔

مسلمانوں نے اونٹوں کو آگے ہانکا اور ذکر معروف لبیك اللھم لبیك...... الی آخر کرتے ہوئے اس مرد کی طرف بڑھے۔

قبیلہ بنی کنانہ کے اس شخص نے جب یہ منظر اور قربانی کے اونٹ دیکھے تو وہیں سے مکّہ لوٹ آیا اور قریش سے کہا: میں نے اپنی آنکھوں سے قربانی کے نشان زدہ اونٹ دیکھے ہیں۔ مسلمان احرام باندھے ہوئے ذکر کر رہے تھے۔ میں بلاتردد کہہ سکتا ہوں کہ ان کا قصد زیارت کعبہ ہی ہے، پس ان کی راہ نہ روکی جائے۔

جماعتِ قریش پھر بھی مخمصہ میں مبتلا رہی اور کوئی فیصلہ نہ کرسکی۔ ایک اور شخص کو بھجوانے کا پروگرام بنایا۔ اس مرتبہ بدوی قبیلہ احابیش کے رئیس حلیس بن علقمہ کو مسلمانوں کے پاس بھیجا۔ قبیلہ احابیش صحرانشین اور مکّہ کا مجاور تھا۔ قریش حلیس کو ایک صحیح اور دوست آدمی سمجھتے تھے۔ حلیس مسلمانوں کے پاس پہنچا۔

محمد ﷺ نے حکم دیا: اسے اجازت دے دو۔ کیمپ میں جہاں چاہے جائے۔ جس کسی سے چاہے بات کرلے۔ جو چاہے مشاہدہ کرے۔

حلیس بن علقمہ نے مشاہدہ کیا کہ تمام مسلمان احرام بند ہیں۔ قربانی کے اونٹ نشان زدہ ہیں۔ حلیس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پاس جنگی اسلحہ بھی نہیں ہے۔ بعض اونٹوں نے تو

بھوک کی وجہ سے ایک دوسرے کے بال بھی کھا لیے ہیں۔ حلیس بن علقمہ سرعت کے ساتھ مکّہ واپس آیا۔ قریش سے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کا مقصد بجز زیارتِ خانہ کعبہ اور کچھ نہیں۔ تم انھیں آزادانہ مکّہ آنے دو تا کہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کر سکیں۔

اکابر قریش نے کہا: ہمیں محمد ﷺ پر اعتماد نہیں۔ ممکن ہے وہ مکّہ میں داخل ہونے کے بعد مکّہ کو تسخیر کر لے۔

حلیس نے کہا: میں قسم کھاتا ہوں کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی سوائے زیارت اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ اگر ان کا ارادہ جنگ کا ہوتا تو جنگی سامان ساتھ لاتے۔ میں کیمپ کے تمام اطراف چکر لگا کر دیکھ چکا ہوں۔ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے پاس ایک زرہ، کمان، نیزہ وخود تک نہیں۔ پھر بھی قریش، مسلمانوں کے مکّہ آنے پر رضامند نہ ہوئے۔

اس پر حلیس غصہ میں آ گیا اور کہا: تمھارا یہ عمل ایک گناہ ہے جو قابلِ بخشش نہیں۔ تمھارے پاس ان کی راہ روکنے کا کیا جواز ہے؟ زیارتِ کعبہ تمام جہان والوں کے لیے آزاد ہے، اس شرط کے ساتھ کہ کعبہ سے اعتقاد رکھتے ہوں۔ تم کس بنا پر مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ سے روک رہے ہو؟ اگر تم نے مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ کی اجازت نہ دی تو میں تم سے جدا ہو جاؤں گا اور اس کے بعد تمھارا حامی و متفق نہیں رہوں گا۔

قریش کے چند بزرگوں نے اسے چپ کرایا اور کہا: تم ایک صحرانشین، راست گو، درست کردار اور اس قدر سادہ لوح ہو کہ دوسروں کے چھپے ارادوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم ذرا صبر کرو۔ ہم اس پر مزید غور کریں گے اور کوئی ایسی راہ نکالیں گے جس میں اہلِ مکّہ کی بہتری ہو۔

متواتر دو دن مشاورتی اجلاس ہوتے رہے۔ ان دو دنوں میں بھی جو لوگ تحقیق کے لیے حدیبیہ جاتے اپنی رپورٹ دارالندوہ (قریش کی مجلسِ شوریٰ) میں پیش کرتے۔ اپنے مشاہدات سے ارکان شوریٰ کو جب وہ کانفرنس ہال سے باہر آتے آگاہ کرتے۔

وہ بتاتے کہ مسلمان، محمد ﷺ کا خارق العادہ احترام کرتے ہیں حتیٰ کہ محمد ﷺ اگر ایک پیالہ پینے کا پانی مانگیں تو دس آدمی پانی لانے کو دوڑتے ہیں اور جو پانی پلانے سے محروم رہ

جاتے ہیں وہ خود کو بدقسمت تصور کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو بہت ہی عجیب ہے۔ وہ دن میں چند بار صف باندھتے ہیں اور کعبہ رُخ ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کی ادائگی میں ان کا نظم وضبط حیرت انگیز ہے۔ جو لوگ حدیبیہ سے واپس آتے وہ بیان کرتے۔ مسلمانوں کی وفاداری محمد ﷺ کے لیے اس قدر ہے کہ اگر وہ حکم دیں کہ اپنے خویش واقربا کو اپنے ہاتھوں قتل کرو تو بلاتردّد وہ ایسا کر گزریں گے۔

جماعتِ قریش ان رپورٹوں کی وصولی پر اور زیادہ متوحش ہوتی۔ بالآخر دو دن اور دو رات کی مشاورت کے بعد قریش کے ایک سرکردہ سردار کو ایک نمائندہ جماعت کے ساتھ حدیبیہ بھیجا، تا کہ محمد ﷺ سے مذاکرات کر کے مسلمانوں سے ایک صلح وآشتی کا معاہدہ کریں۔

روایت ہے کہ جب محمد ﷺ نے سہیل بن عمرو کو دیکھا تو فرمایا: "ہمارا کام آسان ہو گیا"۔

محمد ﷺ اور قریشی نمائندوں کے درمیان مذاکرات میں معاہدہ طے پا گیا۔ اب اس معاہدہ کا لکھا جانا باقی تھا، یعنی معاہدہ صلح اور عدم جارحیت۔

محمد ﷺ نے اپنے داماد علیؓ بن ابی طالب سے فرمایا: معاہدہ کی تحریر خدا کے نام سے شروع کرو۔ علیؓ نے قلم پکڑا اور معاہدہ کی تحریر کا آغاز یوں کیا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" اس پر سہیل بن عمرو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ہم رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتے۔ علیؓ! اسے اس طرح لکھو: "باسمك اللهم" ویسے بھی عرب میں تمام معاہدات اسی طرح آغاز ہوتے تھے۔

علیؓ نے عرض کی: یارسول اللہ! کیسے لکھوں؟

محمد نے فرمایا: ایسے ہی لکھو "باسمك اللهم"

علیؓ نے اطاعت کی اور حسب ہدایت لکھنا شروع کیا۔ "باسمك اللهم" کے بعد املائے محمد ﷺ کے مطابق اس طرح لکھا:

''یہ پیمان محمد ﷺ رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پا رہا ہے''۔

اس پر بھی سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا اور کہا اس طرح مت لکھو، اس لیے کہ ہم تمھیں پیغمبر ﷺ خدا نہیں مانتے اور اگر پیغمبر ﷺ مانتے ہوتے تو تمھیں مکّہ میں داخل ہونے سے منع کیوں

کرتے۔ پس لکھو: ''یہ معاہدہ محمد ﷺ بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا ہے''۔

محمد ﷺ نے فرمایا: علیؓ ایسے ہی لکھ دو۔ سہیل کی رضامندی ملحوظ رکھو۔

ان دو نکات کے علاوہ سہیل نے کوئی اور اعتراض نہ کیا، اس لیے کہ دوسرے تمام اُصولوں پر موافقت ہو چکی تھی۔

علیؓ بن ابی طالب جیسے دانش مند خوشنویس اور اسلام کے ایک سرکردہ فرد نے مندرجہ ذیل معاہدہ تحریر کیا گیا:

باسمك اللهم

''یہ معاہدہ محمد ﷺ بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے مابین طے پایا ہے۔ اس معاہدہ کے بموجب طرفین اتفاق کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور شہریانِ مکّہ کے درمیان دس سال تک جنگ بندی رہے گی۔ اس دس سالہ مدت میں طرفین کا کوئی فرد دوسرے کی جان و مال کو نقصان نہیں پہنچائے۔

معاہدہ کی رُو سے اس دس سالہ مدت میں اگر قبائلِ قریش کا کوئی فرد، قریشی رؤسا کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے پاس پناہ لے گا تو قریش اسے مسلمانوں سے واپس لے سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا اور اگر مسلمانوں کا کوئی فرد مسلمانوں کی اجازت کے بغیر قریش کے پاس پناہ لے گا تو قریش اسے لوٹانے کے پابند نہیں ہوں گے۔

اس دس سالہ مدت میں جنگ بندی برقرار رہے گی۔ طرفین کا کوئی فرد دوسرے کی جان و مال کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ نہ دونوں میں سے کوئی ایک جماعت دوسری پر حملہ آور ہوگی۔ نہ کوئی ایسا پروگرام ہی وضع کرے گی جس سے دوسری طرف کے جان و مال کو ضرر پہنچ سکتا ہو۔ اس دس سالہ مدت کے دوران قریش اور مسلمان دوسری جماعتوں اور قبائل سے معاہدات کرنے اور اتحاد کرنے میں آزاد ہوں گے۔

مسلمان اس سال زیارت کعبہ کو نہیں جائیں گے تاہم آئندہ سال وہ زیارت کعبہ کے لیے مکّہ آسکتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ وہ مکّہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہیں کریں

گے اور شمشیر کے علاوہ کوئی دوسری نوع کا اسلحہ ہمراہ نہیں لائیں گے۔

یہ معاہدہ جو ذوالقعدہ ۶ ہجری میں طے پایا تھا بعض مسلمان مفکرین اس معاہدہ کی مکمل افادیت کو نہ جان سکے۔ وجہ یہ تھی کہ معاہدہ برپا ہونے کے وقت مسلمانوں میں شدید ردِ عمل ہوا تھا۔

مسلمان اس وقت احرام باندھے قربانی کے اونٹوں کو تیار کیے ہوئے تھے۔ وہ طواف کعبہ کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ خود کئی مسلمانوں کی یہ بہت بڑی آرزو تھی۔ معاہدہ طے پا جانے تک وہ مطمئن تھے کہ مکّہ جا کر طواف کریں گے۔ لیکن معاہدہ کی وہ شق جو اس سال زیارتِ کعبہ نہ کرنے سے متعلق تھی ان کی امیدوں کے خلاف تھی۔ ایک طرف مہاجرین دلبرداشتہ ہوئے تو دوسری طرف انصار اور دوسرے مسلمان اس ممانعت کو بہت بڑی توہین تصور کرنے لگے تھے۔

مسلمان چونکہ آپ ﷺ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اس لیے خاموش تھے۔ لیکن عمرؓ بن الخطاب ایک واحد شخص تھے جو اپنی عدم رضامندی کا اظہار کھلم کھلا کر رہے تھے۔ عمرؓ اتنے صادق و سادہ تھے کہ اپنے احساسات کو پنہاں نہ رکھ سکتے تھے۔ ان کی جو فکر ہوتی زبان پر لے آتے تھے۔ عمرؓ، محمد ﷺ کے پاس گئے اور عرض کی: ''اے محمد ﷺ! کیا آپ ﷺ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم مکّہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟''

محمد ﷺ نے جواباً فرمایا: ''ہاں اے عمرؓ میں نے ایسا ہی کہا تھا، لیکن یہ تو نہیں کہا تھا اسی سال ایسا ہوگا''۔

عمرؓ نے عرض کی: ''وہ موقع کب آئے گا؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''آئندہ سال تو مکّہ جائے گا اور کعبہ کی زیارت کرے گا''۔

مسلمانوں کی عدم رضامندی ایسی جذباتی کیفیت کے دوران ایک اور واقعہ ہوا جس سے مسلمان مزید متاثر ہوئے۔ وہ یہ کہ سہیل بن عمرو جو مذاکراتی ٹیم کا لیڈر تھا، اس کا لڑکا ابو جندلؓ مسلمان ہو چکا تھا، معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد مسلمانوں کے کیمپ میں (حدیبیہ) پہنچ گیا اور کہا: ''میں مسلمان ہوں، تم میرے دینی بھائی ہو، مجھے پناہ دو۔''

ابو جندلؓ کے کچھ ہی دیر بعد اس کا باپ سہیل بن عمرو حدیبیہ پہنچ گیا اور محمد ﷺ سے

ابوجندلؓ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ محمد ﷺ کے پاس جواز نہیں تھا کہ ابوجندلؓ کو اپنی پناہ میں رکھتے۔ لہٰذا معاہدہ کے مطابق ابوجندلؓ کو ان کی تحویل میں دے دیا۔ قبل اس کے کہ ابوجندلؓ کو اس کے باپ کے حوالے کیا جاتا۔ اس نے محمد ﷺ سے عرض کی: یا محمد ﷺ! میرا باپ مجھے قتل کر دے گا۔

محمد ﷺ نے فرمایا: خوف نہ کرو، اللہ تمھیں نجات دے گا اور ایسے ہی ہوا۔ ابوجندلؓ قتل نہ ہوا بلکہ زندہ رہا۔ لیکن اس واقعہ پر مسلمان جو پہلے ہی آزردہ تھے اب بہت رنجیدہ ہوئے۔ اگر مسلمان آپ ﷺ سے بیعت نہ ہو چکے ہوتے تو ممکن تھا شورش برپا کرتے۔

مسلمان جو محمد ﷺ کی سی سیاسی بصیرت، استعداد اور دور اندیشی نہیں رکھتے تھے، اس دس سالہ معاہدہ کی افادیت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ محمد ﷺ نے اس معاہدہ سے مدینہ کو فوری طور پر اقتصادی محاصرہ سے آزاد کرا لیا۔ اب مدینہ کے کاروان بلا خوف وخطر مکہ کی سرزمین عبور کر سکتے تھے۔

معاہدہ کے دن تک مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن مکہ والے تھے جو مسلمان امت کا علیحدہ وجود تسلیم ہی نہیں کر رہے تھے۔ اس معاہدہ کی رُو سے انھوں نے مسلمانوں کی حیثیت کو مان لیا اور مسلمان دس سال کے لیے ان کی دشمنی سے بے فکر اور آسودہ خاطر ہو گئے تھے۔

عام مسلمان محمد ﷺ کی اس نفع بخش سیاسی فتح کو نہیں سمجھ رہے تھے جو جنگ کیے اور کچھ ہاتھ سے دیے بغیر ہی حاصل ہوئی تھی۔ مسلمان اس سال زیارتِ کعبہ نہ کر سکنے اور ابوجندلؓ کی واپسی کو اپنی ناکامی سمجھ رہے تھے۔ ابوجندلؓ کی واپسی زیارتِ کعبہ سے زیادہ آزردگی کا باعث بنی، اس لیے کہ ایک بدوی عرب سے جب کوئی پناہ کا خواستگار ہوتا تو وہ اسے موردِ حمایت قرار دیتا تھا کجا کہ ایک مسلمان خود اپنے مسلمان بھائیوں سے پناہ مانگے اور نہ دی جائے۔

لیکن ان کی جذباتی کیفیت نے انھیں بھلا دیا کہ ابوجندلؓ کی واپسی ایک معاہدہ کے تحت عمل میں آئی تھی۔ ابوجندلؓ جو معاہدہ مکمل ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی پناہ میں آیا تھا، اس کی واپسی کسی صورت بھی مسلمانوں کی شکست نہیں تھی۔

محمد ﷺ نے جب دیکھا کہ مسلمان بہت آزردہ و ناخوش ہیں تو انھیں ایک جگہ جمع کر کے فرمایا: یہ معاہدہ جو ہم نے مکہ والوں سے کیا ہے ایک فتح مبین اور درخشندہ و برجستہ کامیابی ہے۔

اس بہت بڑی سیاسی فتح کے بارے میں جو مسلمانوں کو حدیبیہ میں نصیب ہوئی، خداوند نے پیغمبرِ اسلام ﷺ پر آیت نازل فرمائی جو آج قرآن کی اڑتالیسویں سورۂ فتح کی پہلی آیت ہے اور اس جملہ سے شروع ہوتی ہے: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ یعنی "ہم نے تمھیں ایک درخشندہ اور واضح فتح دی"۔ بعض اسلامی مفکرین کا خیال ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی اور کچھ اسے فتح خیبر سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض مفکروں کا خیال ہے یہ تمام فتوحات اسلامی سے متعلق ہے جن میں صلح حدیبیہ بھی شامل ہے۔

قبل اس کے کہ محمد ﷺ مزید وضاحت فرماتے، ایک مسلمان نے اُٹھ کر عرض کی: ہم نہ زیارتِ کعبہ کر سکے اور نہ طواف کر سکے۔ پیغمبر ﷺ اسلام نے فرمایا: تم اگر یہاں سے بھی زیارتِ کعبہ کرو گے تو خداوند اس سفر کو زیارتِ کعبہ کے لیے قبول فرمائیں گے اور تمھارا عمل ایسے ہی ہوگا جیسے تم نے طوافِ کعبہ کیا ہو۔

میں خود بھی یہیں سے زیارتِ کعبہ کروں گا۔ یہیں اونٹوں کی قربانی دوں گا۔ سر بھی منڈواؤں گا اور احرام سے باہر آؤں گا۔ تم بھی میری طرح کرو گے، سر منڈاؤ گے اور احرام اُتارو گے۔

مسلمانوں میں سے ایک نے عرض کی: یارسول اللہ! ابوجندل کو واپس کرنے کی کیا وجہ تھی اور کیوں؟ آپ ﷺ نے مشرکین سے اس طرح کا معاہدہ کیا کہ وہ تو اپنے مفروروں کو واپس لے جا سکتے ہیں اور ہم اپنے مفروروں کو واپس طلب نہیں کر سکتے۔

آپ ﷺ نے جواباً فرمایا: ابوجندل کی واپسی معاہدہ کے مطابق تھی، لہٰذا ہمارے لیے اس میں کوئی شکست کا پہلو نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے ابوجندل قتل نہیں ہوگا، زندہ رہے گا۔ فرض کرو اگر قتل کر ہی دیا گیا تو وہ سعادتِ جاوید پائے گا، شہید ہوگا۔ ایک شہید کا مقام بہشت ہے۔ ہم نے معاہدہ میں اپنے مفروروں کی واپسی کا مطالبہ کیوں نہیں رکھا؟ سیدھی سی بات ہے۔ مسلمان جب اسلام چھوڑ کر دینِ کفار کو قبول کرتا ہے تو ہمارے لیے اپنی افادیت کھو بیٹھتا

ہے۔ وہ شخص خائن اور مرتد ہے۔ ہم اسے اپنے درمیان برداشت نہیں کر سکتے۔ نہ اسے اپنوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ایک مسلمان کے لیے جو ہم سے جدا ہو کر مکّہ والوں سے جاملتا ہے، صرفِ نظر کیا ہے۔ ہم اسے دوبارہ اپنے درمیان قبول نہیں کر سکتے۔ اس معاہدہ کی وجہ سے جو کہ ایک فتح مبین ہے ہمارا ذہن مکّہ والوں کی طرف سے دس سال تک آسودہ رہے گا۔ ان دس سالوں میں ہم تمام اطراف مدینہ میں رہنے والوں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں گے بغیر اس کے کہ مکّہ والے کوئی حیلہ بہانہ یا مداخلت کر سکیں۔ ان دس سالوں میں ہم جس کسی سے چاہیں گے پیمان باندھیں گے اور یہ ہماری تقویت کا باعث ہوگا۔ اس معاہدہ کا فوری فائدہ یہ ہے کہ مدینہ آج تک اقتصادی محاصرہ کے تحت تھا اور آج کے بعد اس کا محاصرہ نہیں ہو سکے گا۔

ایک مسلمان نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! کیوں آپ ﷺ نے اس معاہدہ میں محمد بن عبداللہ لکھنا قبول فرمایا، جب کہ محمد رسول اللہ لکھا جانا چاہیے تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس معاہدہ میں خود کو محمد بن عبداللہ لکھوایا، مگر کہیں بھی یہ رقم نہیں کہ میں خدا کا بھیجا ہوا نہیں ہوں اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میں نے اس لیے خود کو خدا کا بھیجا ہوا ذکر نہیں کیا کہ مشرکین نے ایسا چاہا تھا۔ مشرکین کی یہ خواہش ایک بچگانا عمل تھا اور اگر میں بھی ان کی اس خواہش کو قبول نہ کرتا تو یہ ایک بچگانا حرکت ہوتی لہٰذا میں نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی۔ ان کی اس درخواست کو قبول کر لینے سے ہماری پوزیشن میں کوئی کمی یا کمزوری واقع نہیں ہوئی۔ ہم نے قریش سے اپنا مقصد یعنی جنگ بندی حاصل کر لی ہے۔

اس کے بعد کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا، مگر عمرؓ بن الخطاب نے عرض کی: "یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہمارا دین برحق نہیں ہے؟ اور کیا مشرکین کا دین، دینِ باطل نہیں ہے؟ پھر کیوں حق باطل کے سامنے خفیف ہو؟" بالآخر حدیبیہ سے مراجعت کے چند ماہ بعد عمرؓ بن الخطاب نے بھی تسلیم کیا کہ یہ جنگ بندی کا معاہدہ (صلح حدیبیہ) مسلمانوں کے لیے بہت سود مند ہوا ہے۔

مدینہ کے اطراف کے قبائل مکّہ والوں کی طاقت سے خوف زدہ تھے۔ صلح حدیبیہ کی وجہ سے ان کا خوف جاتا رہا اور وہ مسلمان ہو گئے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے سر منڈوائے یا ان میں سے کچھ نے سر منڈوائے اور احرام کھول دیے اور شمال کی طرف یعنی مدینہ واپس چل دیے مگر بہت ملول تھے۔ اس کی وجہ ابوجندلؓ کی واپسی تھی۔ اس شخص کو پناہ دینا جو اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان کے پاس آیا ہو صحرا نشین عربوں کے مقدس قوانین میں سے ایک تھا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ محمد ﷺ نے اس قانون کو نظر انداز کیا ہے۔

دورِ جاہلیت کا ایک عرب شاعر جس کا نام طرفہ تھا، کہتا ہے:

میں بوقتِ مرگ اس جہان سے مسکراتے چہرے کے ساتھ جاؤں گا۔ اس لیے کہ اس زندگی میں مجھے تین چیزیں حاصل رہی ہیں اور اس جہان میں میرے لیے باعثِ سعادت ہیں۔ پہلی یہ کہ جب کوئی شخص خطرہ سے بھاگ کر مجھ سے پناہ مانگتا تو میں اسے پناہ دیتا۔ دوسری یہ کہ شراب پیتا ہوں اور تیسری یہ کہ برسات کے دنوں میں جب انسان غمگین ہوتا ہے تو میں خوبصورت عورتوں سے اپنا غم غلط کرتا ہوں۔

اس عرب شاعر نے پناہ دینے کو اولین اہمیت دی ہے اور دوسری لذتوں پر اس کو فوقیت دی۔

مسلمان اس حال میں کہ ملول و دل گرفتہ تھے، مدینہ کی راہ طے کر رہے تھے۔ ایک اور مسلمان جس کا نام ابوبصیرؓ تھا مکّہ سے بھاگ کر ان کے پاس پہنچا اور درخواست کی کہ اسے پناہ دیں۔ محمد ﷺ نے اس شخص کو کوئی جواب نہ دیا، کیوں کہ ممکن تھا اس میں کوئی فریب ہوتا اور جماعتِ قریش نے اسے بھجوایا ہوتا کہ دیکھیں کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔

لیکن جلد ہی تحقیق ہو گئی کہ ابوبصیرؓ واقعی ایک سچا مسلمان ہے اور مکّہ میں اسے آزار پہنچایا جا رہا تھا۔ اسے جان کا خوف تھا کہ کہیں قریش اسے قتل نہ کر دیں لہٰذا وہ مسلمانوں کے پاس چلا آیا۔

ابوبصیرؓ کے مسلمانوں کے پاس پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد قریش کے دو افراد بھی وہاں پہنچ گئے اور محمد ﷺ سے ابوبصیرؓ کی واپسی کا تقاضا کیا۔ عمرؓ بن الخطاب نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ!

اس مرتبہ آپ اس کو ان کی تحویل میں نہ دیں۔ اس نے ہم سے پناہ مانگی ہے۔ اگر ہم نابود بھی ہو جائیں تو ابوبصیر کو ہم واپس نہیں کریں گے۔

لیکن محمد ﷺ نے فرمایا: میں نے جو معاہدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔

قریش کے دونوں آدمیوں نے جو مکّہ سے آئے تھے، مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے ابوبصیرؓ کو اونٹ پر باندھا اور مکّہ کی طرف چل دیے۔ ابوبصیرؓ ایک دلیر اور طاقت ور انسان تھا۔ راستہ میں وہ رسیوں کو کاٹ کر خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ مسلمانوں کے پاس پہنچا اور پناہ کے لیے درخواست کی۔ اس دفعہ ابوبصیرؓ نہ صرف قریش کا مفرور تھا، بلکہ ایک آدمی کا قاتل بھی تھا۔ اب تو قریش اس سے خون بہا کا مطالبہ بھی کرتے۔

محمد ﷺ نے حکم دیا: ابوبصیر کو حراست میں رکھا جائے تاوقتیکہ مکّہ سے لوگ آکر اسے لے جائیں۔ دوسرے ہی دن ابوبصیرؓ کے دو نگہبانوں میں سے ایک نگہبان جو بھاگ نکلا تھا، مسلمانوں کے پاس پہنچ گیا اور ابوبصیرؓ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ محمد ﷺ کے حکم کے مطابق ابوبصیرؓ کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔

لیکن قبل اس کے کہ قریش کا آدمی اسے مسلمانوں کے پڑاؤ سے دور لے جاتا، ابوبصیرؓ بھاگ گیا۔ پہلی مرتبہ ابوبصیرؓ مسلمانوں کے پاس پناہ کے لیے آیا تھا تو محمد ﷺ نے فرمایا تھا: ہم تمھیں پناہ نہیں دے سکتے۔ تم مکّہ واپس چلے جاؤ۔ تمھیں خداوند تعالیٰ نجات دیں گے۔ اب ابوبصیرؓ نے سوچا میں ایک قاتل بھی ہوں، اس لیے قریش مجھے قتل کر دیں گے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جس وقت مجھے نجات کا مژدہ سنایا تھا اس وقت میں قاتل نہیں تھا۔ اب اگر مکّہ واپس جاؤں تو مجھے قتل کر دیا جائے گا یا پھر خون بہا کا مطالبہ ہوگا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر اس نے بیابان کی راہ لی۔

عرب کے شاعر شنفرہ نے ابوبصیرؓ کی بابت کہا: "اے میرے بھائیو! میرا پیچھا مت کرنا۔ میں نے بیابانوں کی راہ لی ہے۔ میں وہاں نئے ساتھی ڈھونڈھ لوں گا۔ اے دوستو! میرا پیچھا مت کرنا۔ مجھ میں تنہا رہنے کی طاقت ہے۔ تاریک راتوں میں راہ پیمائی کر سکتا

ہوں۔ بیابان میں طاقت ور چیتے، چالاک بھیڑیے اور کرگس میرے دوست ہوں گے"۔

ابوبصیرؓ نے دوسری بار فرار ہونے کے بعد ایک علاقہ ذوالمروہ کی راہ لی۔ بعدازاں جو بھی مسلمان مکّہ سے فرار ہوتا، سیدھا ذوالمروہ پہنچ جاتا۔ بتدریج ذوالمروہ میں ایک وحدتِ اسلامی وجود میں آتی گئی۔ یہ ذوالمروہ کے مسلمانوں کی جماعت کسی معاہدہ جنگ بندی کی پابند نہیں تھی۔ ذوالمروہ کا علاقہ جزوِ مدینہ بھی نہیں تھا، اس لیے محمد ﷺ کے حدودِ اختیار سے وہ باہر تھے۔

ابھی حدیبیہ کے معاہدہ کو ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ذوالمروہ میں مسلمانوں کی تعداد خاصی زیادہ ہوگئی اور انھوں نے اپنا ایک لشکر تشکیل دے کر مکّہ کے کاروانوں پر حملے شروع کر دیے۔ اگر قافلہ کے مرد مقابلہ پر آتے تو انھیں قتل کر کے اموالِ قافلہ لوٹ کر لے جاتے۔

قریش کو بہت مشکل پیش آئی۔ انھوں نے محمد ﷺ سے درخواست کی کہ ذوالمروہ میں جمع ہونے والے مسلمانوں کو آپ مدینہ بلالیں۔ انھیں رہائش دیں۔ ہم یعنی قریش ان کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

محمد ﷺ نے قریش سے تحریری درخواست مانگی، تاکہ ان کے ہاتھ میں کوئی دستاویز ہو۔ اس نئی شق سے معاہدہ کی وہ شرط ساقط یا ختم ہوگئی جس پر مسلمان بہت زیادہ ملول اور دل گرفتہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد دوسری شرائط بھی جو بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہیں تھیں، رفتہ رفتہ بے اثر ہوتی گئیں۔ فقط وہ شرائط باقی رہ گئیں جو مسلمانوں کے لیے سودمند تھیں۔

جماعتِ قریش نے ایک تحریری دستاویز محمد ﷺ کے ہاتھ دے دی، جو اس لیے تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکّہ سے مفرور ہو کر مسلمانوں سے جا ملے تو مسلمان مکلف نہیں ہوں گے کہ اسے قریش کے حوالے کریں۔ بالآخر مسلمانوں کو تھوڑی ہی مدت بعد احساس ہوگیا۔ صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت سودمند معاہدہ تھا۔



جنگِ خیبر

حدیبیہ سے واپس مدینہ پہنچنے کے بعد محمد ﷺ کی کوشش تھی کہ مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہوں۔

قدرتِ حق سے اس سال مکہ میں خشک سالی سے قحط پڑ گیا۔

عرب میں ایک قبیلہ موسوم بہ بنوحنیفہ تھا۔ اس قبیلہ کا علاقہ یمامہ مکہ کی خوراک کی کفایت کیا کرتا تھا۔ بنوحنیفہ کے تمام افراد مسلمان ہو گئے اور اسی وجہ سے انھوں نے مکہ کو خوراک کی ترسیل بند کر دی۔

مکہ کے لوگوں نے محمد ﷺ سے رابطہ قائم کیا اور درخواست کی کہ قبیلہ بنوحنیفہ کو حکم دیں کہ وہ ہمیں سامان خوراک فروخت کرے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ان کی درخواست کو پذیرائی بخشی اور رئیس یمامہ کو حکم دیا کہ سامان خوراک کی فروخت مکہ کے لوگوں پر بند نہ کرے۔ اس کے علاوہ محمد ﷺ نے پانچ سو سکہ طلائی مکہ بھجوایا کہ اس کو شہر کے فقرا میں تقسیم کر دیا جائے۔ ابوسفیان کو جب یہ معلوم ہوا تو کہا: محمد ﷺ مکہ کے لوگوں کو خصوصاً جوانوں کو اس روپے سے ہم نوا بنانا چاہتے ہیں۔

محمد ﷺ نے پانچ سو سکہ طلائی کے بعد بہت سا خرما مدینہ سے مکہ ابوسفیان کے پاس بھجوایا اور کہلا بھیجا: اس خرما کی قیمت چمڑے کی صورت میں بھجوا دیں۔ اس موقع پر ابوسفیان کے پاس کچھ چمڑا تھا جو فروخت نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی قحط کی حالت میں مکہ کے لوگ صرف سامان خوراک کے خریدار تھے اور چمڑے کا کوئی گاہک نہ تھا۔ ابوسفیان نے سوچا خرما واپس کر دے۔ لیکن اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ رہا۔ مکہ والوں کو اس خرما کی اطلاع ہو گئی۔ چونکہ لوگ فاقوں سے تھے، انھوں نے خرما کی واپسی میں مزاحمت کی۔ ابوسفیان نے ناچار خرما رکھ کر چمڑا بھجوا دیا۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ خرما محمد ﷺ نے مدینہ سے بھجوایا ہے تو محمد ﷺ کی نسبت

خوش گمان ہوئے، لیکن جماعتِ قریش جو مکہ کے اشراف پر مشتمل تھی محمد ﷺ کی دشمن ہی رہی۔ محمد ﷺ نے ان کے مخاصمانہ جذبات کے باوجود قریش کو دوست بنانے کا پروگرام بنایا۔ ویسے بھی محمد ﷺ حالت امن کو اسلام کی پیش رفت کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ اس بابت وہ لوگوں کے کہنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

پیغمبر ﷺ دینِ خدا کی پیش رفت کے لیے اِدھر اُدھر کی چہ میگوئیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ خدا سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ اپنی ہر چیز اس کی راہ میں قربان کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتے۔ یہودیوں کی کتاب تلمود میں لکھا ہے: ”خداوندا اپنے پیغمبر سے چاہتا ہے کہ وہ اس سے (خدا سے) اپنی جان و مال سے زیادہ محبت کرے۔ ہر چیز جسم سے لے کر حیثیت و آبرو تک اس کی راہ میں فدا کرے“۔

محمد ﷺ خدا کو جان و دل سے عزیز جانتے تھے اور اس کے دین کی پیش رفت کے لیے کسی قسم کی فداکاری میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے خواہ لوگ تمسخر کیوں نہ اُڑائیں۔

محمد ﷺ ایک ایماندار انسان تھے، ایمان بھی ایسا جو باہوش و با استعداد تھا اور جس کے پاس یہ چیز ہو وہ ہراساں نہیں ہوا کرتا، اس لیے کہ وہ جانتا ہوتا ہے کہ بالآخر ان مشکلات پر غلبہ پا لے گا۔ انسان جو خدا پر ایمان کامل رکھتا ہو، ہر چیز خدا کی راہ میں قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح محمد ﷺ نے بھی عزم کیا کہ دین اسلام کی کامل فتح کے لیے ہر طور پر مکہ پر غلبہ حاصل کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک فداکاری اور کرنا ہوگی۔

محمد ﷺ کو خبر ملی کہ اُمِ حبیبہ دختر ابوسفیان زوجہ عبیداللّٰہ بن جحش بیوہ ہو گئی ہے۔ عبیداللّٰہ بن جحش ایک حنیف تھا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے اپنی زوجہ اُمِ حبیبہؓ کے ساتھ حبشہ ہجرت کی اور پھر وہیں دین اسلام کو ترک کر دیا۔ اب وہ فوت ہو گیا تھا یوں اُمِ حبیبہؓ دختر ابوسفیان بیوہ ہو گئی تھی۔ پس محمد ﷺ نے ارادہ کیا کہ اُمِ حبیبہؓ کو اپنے نکاح میں لے آئیں۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے سوچا کہ اُمِ حبیبہؓ کے نکاح کے بعد وہ ابوسفیان کے داماد ہوں گے اور یہ رشتہ مکہ میں ان کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کی مخالفت میں کمی کا باعث ہوگا۔

ابوسفیان مکہ کی سپاہ کا سپہ سالار تھا۔ اگر اس کی دشمنی کسی وجہ سے دوستی میں تبدیل ہو جاتی تو یہ اسلام کی پیش رفت کے لیے بہت سود مند ہوتا۔ اُم حبیبہؓ بنی امیہ کے ایک معزز خاندان کی فرد تھیں۔ اگر محمد ﷺ اس سے ازدواج کرتے تو تمام قبیلہ بنی امیہ کے لوگ آپ ﷺ کے قرابت دار ہو جاتے اور وہ مثل گزشتہ آپ ﷺ سے دشمنی برقرار نہ رکھ سکتے۔

اُم حبیبہؓ شوہر کی وفات کے بعد حبشہ ہی میں تھیں۔ محمد ﷺ نے سوچا کہ جب یہ بیوہ عورت واپس عرب پہنچے گی تو ابوسفیان اور امیہ خانوادہ کے دوسرے افراد کسی طور اسے محمد ﷺ سے شادی نہیں کرنے دیں گے۔ انھی وجوہ کی بنا پر محمد ﷺ نے ایک شخص کو اپنا وکیل مقرر کر کے حبشہ بھجوایا کہ اُم حبیبہؓ سے خواستگار ہو اور اسے مدینہ لے آئے۔ چونکہ قریش کی مزاحمت کا امکان تھا، اس لیے محمد ﷺ نے اپنے وکیل کو بادشاہ (نجاشی) کے نام خط دیا اور ہدایت کی تم سب سے پہلے اُم حبیبہؓ کی رضامندی حاصل کرنا اور اگر وہ موافقت کریں تو اس وقت یہ خط بادشاہ حبشہ (نجاشی) کے پاس لے جانا۔

اس خط میں محمد ﷺ نے بادشاہ حبشہ سے خواہش کی تھی کہ اُم حبیبہؓ جو کہ آپ کی مملکت میں سکونت پذیر ہے کا مجھ سے عقد کر دیں۔ نجاشی نے پیغمبر اسلام ﷺ کی درخواست قبول کی اور حبشہ ہی میں اُم حبیبہؓ کا عقد محمد ﷺ سے کر دیا۔ عقد کے بعد ابوسفیان کی بیٹی حبشہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئی۔

جماعت قریش کو عقد کی اطلاع ملی۔ مگر اب وہ مجبور تھے اور کسی قسم کی مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اس لیے کہ اُم حبیبہؓ اب پیغمبر اسلام ﷺ کی بیوی تھیں اور عرب اس قدر مہذب تھے کہ ایک بیوی کو اپنے شوہر کے پاس جانے میں مزاحم نہ ہوتے۔

اُم حبیبہؓ سے نکاح اسلام کی پیش رفت کے پروگرام میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا اس شادی نے مکہ والوں کے مسلمان ہونے میں بڑا موثر کردار ادا کیا کیوں کہ اُم حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی قریش کے تمام بڑے بڑے خاندانوں سے دور یا نزدیک کی قربت دار تھیں۔ جب کبھی ابوسفیان، محمد ﷺ کی مخالفت کرتا وہ اسے یاد دلاتے کہ وہ تمھارا

داماد ہے یعنی تمھارے شجرہ نسب کی وہ بھی ایک شاخ ہے۔

صلح حدیبیہ کا ایک فوری اثر ہوا کہ مدینہ جزوی طور پر اقتصادی محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور مسلمان کلی طور پر اس اقتصادی محاصرہ کو ختم کرنے کے لیے آزاد ہو گئے۔

معاہدہ حدیبیہ میں قریش پابند تھے کہ آئندہ مسلمانوں کے ہر اقدام پر غیر جانبدار رہیں گے۔ خیبر مدینہ کے شمال میں واقع ہے۔ خیبر کے یہودیوں نے معاہدہ حدیبیہ طے پا جانے کے باوجود مدینہ سے دشمنی ترک نہ کی اور مدینہ کے قافلوں کی راہ روکتے رہے۔ بدیں وجہ مدینہ کی تجارت شام اور دوسری شمالی مملکتوں سے معطل تھی۔ خیبر کے یہودی خود کو اس قدر قوی تصور کرتے تھے اور اس گھمنڈ میں تھے کہ وہ تنہا ہی مسلمانوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور دوسروں سے مدد کی انھیں قطعاً ضرورت نہیں۔

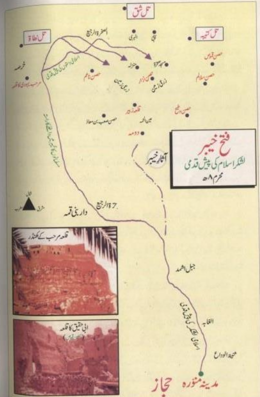
محمد ﷺ نے سوچا کہ معاہدہ حدیبیہ سے مدینہ کے جنوبی سمت محاصرہ تو ختم ہو چکا ہے۔ اب شمالی سمت کا محاصرہ توڑنے کے لیے کوئی اقدام کرنا ہوگا، لیکن خیبر کے یہودی کسی طور بھی محمد ﷺ سے صلح پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ یہودی جو مدینہ سے نقل مکانی کر کے خیبر چلے گئے تھے خیبر کے یہودیوں کو صلح سے روکتے تھے۔

خیبر مدینہ کے شمال میں ۱۸۴ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں پانی کی افراط ہے، اس لیے یہ علاقہ زرخیز شمار ہوتا ہے۔ خیبر شہر کی حدود سے تھوڑی دور ایک وسیع آتش فشاں چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں کسی قسم کا سبزہ پیدا نہیں ہوتا اور اسے عبور کرنا بہت مشکل ہے۔

قلعہ کو عربی زبان میں خیبر[۱] بھی کہتے ہیں۔ اس شہر میں آٹھ جنگی قلعے تھے اور ہنگام جنگ وہ بیس ہزار جنگجو میدانِ جنگ میں لا سکتے تھے۔

خیبر عرب کا ایک قدیم شہر شمار ہوتا ہے۔ ۵۳۰ میلادی میں یہ ایک عربی شہر تھا۔ اسی سال خیبر والوں نے ذونواس (شاہ یمن) کے ساتھ پیمان اتحاد باندھا تو اس شہر میں یہودیوں

۱- یہود کی زبان میں لفظ "خیبر" کے معنی ہیں "قلعہ" [معجم البلدان: ۲/۴۰۹]



نے نفوذ حاصل کیا۔ یہود ایک محنتی اور با ارادہ قوم ہونے کے باعث خیبر میں جلد ہی اکثریت حاصل کر گئے۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں نے خیبر پر لشکر کشی کی تو یہاں کسی ایک عرب کا بھی وجود نہ تھا۔

خیبر کے رہنے والے ثروت مند لوگ تھے۔ یہ شمالی عربستان کے بڑے تجارتی مراکز میں سے ایک تھا۔ خیبر کے زرگر بڑے معروف تھے۔ وہ طلائی زیورات اور ظروف جزیرہ نمائے عرب کے اشراف کو بیچا کرتے یا مناسب ضمانت ملنے پر کرایہ پر دیا کرتے تھے۔

زرگری یہودیوں کے لیے ہی مخصوص تھی۔ جزیرہ نمائے عرب کے شمال اور جنوب میں زرگروں کے چند مراکز تھے لیکن کوئی ایک خیبر کے پایہ کا نہیں تھا۔

وہ نشیبی علاقہ جہاں خیبر شہر واقع تھا مرطوب تھا اور وہاں رہنے والے ایک بیماری میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کھڑے پانی سے جو ہوا اُٹھتی ہے وہ انسان کو بیمار کر دیتی ہے۔ اس مرض کو وہ پانی کی بیماری کہا کرتے تھے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ مرض ملیریا ہے جو پانی سے نہیں بلکہ مچھر کے کاٹنے سے لاحق ہوتا ہے۔

خیبر کی چھوٹی چھوٹی وادیوں میں پانی فراواں تھا جس کی وجہ سے یہ مرض عام تھا۔ اعراب بادیہ حیرت زدہ تھے کہ یہودی کیوں کر اس مرطوب سرزمین میں زندگی گزارنے پر قادر ہیں۔ یہ پانی کے مرض سے بیمار ہو کر کیوں نہیں مر جاتے؟

یہودی ان کی سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے حکایت بیان کرتے کہ خیبر میں اس مرض کے حملہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر گدھے کی سی آوازیں نکالے۔ اس کے بعد اگر وہ شہر میں داخل ہو گا تو اسے کوئی مرض لاحق نہیں ہو گا اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو پھر اس کی موت پانی کی بیماری (ملیریا) سے ہی ہو گی۔

سادہ لوح عربوں نے اس حکایت یا ہدایت کو قبول کر لیا۔ وہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہاتھ پاؤں زمین پر رکھ کر گدھے کی سی آوازیں نکال کر یہ یقین حاصل کر لیتے کہ اب یہ

مرض ان پر حملہ آور نہیں ہو گا۔ اس عمل کو عربی زبان میں تعشیر یعنی دس برابر کرنا کہا گیا۔ اسی مناسبت سے بدوی عرب خیبر کو تعشیر بھی کہا کرتے تھے۔

لیکن خود یہودیوں نے اس مرض سے بچاؤ کے لیے چند قواعد مرتب کر رکھے تھے:

۱- ساکن یعنی ٹھیرے ہوئے پانی کو ہرگز نہیں پیتے تھے۔ جب بہتا ہوا پانی میسر نہ آتا تو شراب پیتے تھے۔

۲- لہسن بہت زیادہ کھاتے تھے، اس کثرت سے کہ آبادی کی ہوا میں ہر وقت لہسن کی بو بسی رہتی تھی۔ آج لہسن کی افادیت ہم پر ظاہر ہو چکی ہے۔ یہ کئی امراض کی پیش بندی کرتا ہے۔

۳- یہودی کم ارتفاع والے مقام پر قیام نہیں کرتے تھے بلکہ قیام کے لیے اونچے مقام کا انتخاب کیا کرتے تھے اور تجربہ نے ان پر ثابت کر دیا تھا کہ مرتفع مقامات پر انسان شاذ ہی اس مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔

۴- یہودی عموماً بہار کے موسم میں خیبر سے باہر چلے جایا کرتے تھے۔ یہ احتیاط وہ یہ جانے بغیر کہ مچھر کی افزائش ٹھیرے پانی کی وجہ سے ہوتی ہے کیا کرتے تھے۔

معاہدہ حدیبیہ کی اطلاع ملنے پر خیبر کے یہودیوں نے پیش بینی کر لی تھی کہ اب مسلمانوں اور ان کے درمیان جنگ ناگزیر ہے۔ معاہدہ حدیبیہ سے پہلے خیبر کے یہودی مکہ والوں کے اتحادی تھے اور مسلمانوں کے لیے ان پر حملہ آور ہونا بہت مشکل تھا۔ لیکن اب جب مسلمانوں اور قریش کے درمیان جنگ بندی کا دس سالہ معاہدہ طے پا گیا تو خیبر اور مکہ کا اتحاد خود بخود ختم ہو گیا تھا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے خیبر پر حملہ کے لیے ایک ہزار پانچ سو افراد کا لشکر تیار کیا اور خود اپنی ہی قیادت میں اس لشکر کو لے کر خیبر کی طرف کوچ کیا جب کہ خیبر کے یہودی بیس ہزار افراد پر مشتمل لشکر مقابلہ پر لا سکتے تھے۔

بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے خیبر کے یہودیوں پر اچانک حملہ کیا تھا،

جب کہ حقیقت ایسے نہیں ہے۔ معاہدہ حدیبیہ کی اطلاع ملتے ہی ان پر واضح ہو گیا تھا کہ اب ممکن ہے محمد ﷺ خیبر پر حملہ آور ہوں۔ اور اسی دن سے وہ دفاع کی تیاری میں مشغول تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب لشکرِ اسلام خیبر پہنچا تو یہودی مکمل طور پر دفاع کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے آٹھ قلعوں میں کافی مقدار میں سامان خوراک جمع کر رکھا تھا اور بیس ہزار سپاہ پورے ساز و سامان سے لیس جنگ کے لیے تیار تھی۔

خیبر پر حملہ سے پہلے پیغمبرِ اسلام ﷺ نے یہودیوں کے دو اتحادی قبیلوں بنی فزارہ اور بنی غطفان کی سرکوبی ضروری خیال کی تا کہ عقب محفوظ رہے۔ وہ دونوں قبائل لشکرِ اسلام کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ انھوں نے محمد ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ اس جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے، اگرچہ انھوں نے یہودیوں سے اپنا معاہدہ ختم نہ کیا۔

دو چیزیں ان دونوں قبیلوں کی وحشت کا باعث تھیں۔ ایک تو جنگ ہائے بدر، اُحد اور خندق کے نتائج اور دوسرے معاہدہ حدیبیہ۔ ان دونوں قبیلوں نے سوچا مکّہ والے محمد ﷺ سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ہم بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ سے باز رہیں۔

محمد ﷺ ان دونوں قبیلوں سے مطمئن ہونے کے بعد خیبر کی طرف بڑھے۔ مؤرخین نے خیبر کے جنگی قلعوں کی مضبوطی اور استحکام کی تصدیق کی ہے۔[۲]

لشکر کی کمان خود محمد ﷺ کے ہاتھوں میں تھی۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا: ہمارے پاس ان قلعوں کو تباہ کرنے کے لیے وسائل نہیں ہیں۔ ہمارا جنگی اسلحہ صرف تیر و کمان اور تلوار پر مشتمل ہے، اور اس نوع کے اسلحہ کے ساتھ ان قلعوں کو تسخیر نہیں کیا جا سکتا۔ ان قلعوں کو ایک ہی طریقہ سے فتح کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ان کا محاصرہ کیا جائے۔ تمام نہریں جو قلعوں کے اندر جاتی ہیں ان کو باہر سے بند کر دیں تا کہ پانی قلعوں کے اندر نہ پہنچ پائے۔ اگر یہودیوں نے قلعوں کے اندر پانی ذخیرہ نہ کیا ہوا اور وہ کنواں کھودنے میں کامیاب نہ

۲- خیبر کے ان آٹھ قلعوں کی تعمیر مٹی اور پتھروں سے کی گئی تھی اور یہ بڑی جنگی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ قلعوں کے اندر سے دشمن پر متقاطع (آر پار) تیر اندازی کی جا سکتی تھی۔ [مترجم]

ہو سکیں تو پھر ممکن ہے پیاس سے نڈھال ہو کر جلد ہی ہتھیار ڈال دیں۔

مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ آٹھوں قلعوں پر باری باری حملہ کیا جائے اور جب ایک قلعہ کے محصورین ہتھیار ڈال دیں تو دوسرے قلعہ پر حملہ کیا جائے۔ خیبر پر حملہ کے آغاز میں مسلمانوں کو یہودیوں کی منجنیقوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہودیوں نے خوب سنگ باری کی۔

یہودیوں نے پتھروں کو مدور تراشا ہوا تھا اور منجنیق سے وہ ان مدور پتھروں کو مسلمانوں پر پھینکتے تھے۔ اس سنگ باری کے سامنے مزاحمت مشکل تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں منجنیقوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ان کا دفاع نہیں جانتا تھا۔

محمد ﷺ نے حکم فرمایا: پہیوں والے لکڑی کے برج بنائے جائیں اور ان برجوں میں بیٹھ کر قلعہ کے نزدیک پہنچیں اور جب ہم ایک بار قلعہ کے نزدیک پہنچ گئے تو سنگ باری بے اثر ہو جائے گی۔ اس لیے کہ منجنیق سے پتھر دور پھینکا جا سکتا تھا نہ کہ نزدیک۔

محمد ﷺ نے فرمایا: جب قلعہ کے نزدیک پہنچو تو ایک خطرے کا خیال رکھنا۔ یہودی قلعے کے سوراخوں سے پتھر نہ پھینکیں۔ سوراخ صرف برجوں میں ہیں دیواروں میں نہیں، لہٰذا اگر تم خود کو دیواروں کے نیچے پہنچا لو گے تو دشمن کی منجنیقیں بیکار ہو جائیں گی۔

مسلمان جب خیبر کی حدود میں داخل ہوئے تو لشکر کی کمان خود آپ ﷺ کے پاس تھی لیکن نا مساعد آب و ہوا کی وجہ سے آپ ﷺ بہت جلد علیل ہو گئے اور لشکر کی کمان ابوبکرؓ نے سنبھالی۔ ابوبکرؓ کو لشکر کی کمان سنبھالے ابھی دو ہی روز ہوئے تھے کہ ان کو بھی بخار نے آلیا۔ لشکر کی کمان عمرؓ بن الخطاب کو منتقل ہو گئی۔

عمرؓ بن الخطاب بھی جلد ہی بیمار پڑ گئے۔ انھوں نے لشکر کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور فرمایا: میرے خیال میں لشکر کی کمان علیؓ بن ابی طالب کے سپرد کی جائے۔ وہ ایک لائق، با استقامت، صابر اور شجاع انسان ہیں۔ اگر انھیں دشمن کی ایک سو فیصد سپاہ کا تنہا مقابلہ بھی کرنا پڑے تو وہ پیٹھ دکھانے والے نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص یہودیوں کے ان قلعوں سے نبٹ سکتا ہے تو میری

نظر میں وہ علیؓ ہے، لہٰذا میں لشکر کی کمان ان کو سونپتا ہوں۔ آپ سب ان کی اطاعت کریں۔

جس وقت علیؓ کو لشکر کی کمان سونپی گئی، ان کو بخار تھا۔ مگر انھوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور اسی دن خیبر کے ایک قلعے نطات کا محاصرہ کر لیا۔ دو مؤرخوں بغوی اور ابنِ ابی الحدید نے علیؓ کے انتخاب کو قدرے مختلف انداز میں بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں جب محمد ﷺ بیمار ہوئے تو کمان ابوبکرؓ کو سونپی گئی۔ انھوں نے قلعے پر حملہ کیا مگر اس چھوٹے سے لشکر کو کافی نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا جس کی وجہ سے ابوبکرؓ نے اس ذمہ داری کی انجام دہی سے معذوری ظاہر کی۔

محمد ﷺ بیمار تھے۔ لشکر کی کمان عمرؓ بن الخطاب کو سونپی۔ انھوں نے بھی کئی حملے کیے، بالآخر معذوری ظاہر کی۔ محمد ﷺ نے فرمایا: لشکر کی کمان علیؓ کے سپرد کی جائے۔

محمد ﷺ نے جب لشکر کی کمان علیؓ کو سونپنے کا حکم فرمایا، علیؓ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ذمہ داری سنبھالنے کا اعلان کیا اور اسی روز قلعہ نطات پر حملہ آور ہوئے۔ بغوی اور ابی الحدید نے ذکر کیا ہے کہ حملہ کے پہلے ہی دن ایک شخص جس نے قیمتی خود پہنا ہوا تھا قلعہ کی دیوار کے اوپر سے آواز لگائی: ''مسلمانو! تمھارا سپہ سالار کون ہے؟

علیؓ نے قلعے کے نیچے سے جواب دیا: میں علیؓ بن ابی طالب اسلامی لشکر کا سپہ سالار ہوں۔ اس شخص نے اونچی آواز میں اپنا تعارف کرایا: اے علیؓ! میں مرحب ہوں۔ ان آٹھ قلعوں میں سے ایک قلعہ میرے نام پر ہے۔ کیا تم خود کو اس قابل پاتے ہو کہ میرے ساتھ تنہا جنگ کرو؟

علیؓ نے کہا: میں نے آج تک دعوت مبارزہ رد نہیں کی اور تیری دعوت بھی رد نہیں کروں گا۔

مرحب نے کہا: اس صورت میں قلعہ سے باہر آ کر تم سے مقابلہ کروں گا۔

مرحب قلعہ سے باہر نکلا اور قلعہ کا دروازہ اس کے پیچھے بند کر دیا گیا۔

علیؓ کی آنکھوں میں درد تھا۔ انھوں نے زرہ بھی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ باوجود اس کے وہ مقابلے پہ آئے اور مرحب کو جس نے خود والی زرہ یعنی (مغفر) پہنی ہوئی تھی، قتل کر دیا۔

مرحب کو قتل کرنے کے بعد علیؓ نے حکم دیا کہ قلعہ نطات کے دروازوں کو توڑنے کے لیے

درختوں کے تنوں کو استعمال کیا جائے۔ درخت کے تنے کو تیس چالیس مجاہد اُٹھا کر سرعت کے ساتھ دوڑتے ہوئے قلعہ کے دروازے سے ٹکراتے تھے۔ چند شدید ضربات کے بعد قلعے کا دروازہ ٹوٹ جایا کرتا تھا۔

مسلمانوں نے درختوں کے تین تنے منتخب کیے۔ ہر تنے کو پچاس مجاہد اُٹھا کر قلعہ کے دروازے سے ٹکراتے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت جس وقت دروازہ توڑنے میں مشغول تھی، اس وقت ایک دوسری جماعت دیواروں کے ساتھ سیڑھیاں لگا کر قلعہ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

مسلمان لکڑی کے پہیہ دار برجوں کی مدد سے قلعہ کی دیواروں کے نیچے پہنچتے اور پھر دیوار کے ساتھ سیڑھیاں لگاتے۔ نطات کا قلعہ دو روز کی شدید مزاحمت کے بعد پامال ہو گیا۔ دروازہ ٹوٹا اور مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے۔ نطات کے قلعے کے سرنگوں ہوتے ہی علیؓ نے دوسرے قلعہ ناعم کے محاصرہ کا حکم دیا۔

اس جنگ میں علیؓ نے دس روز میں چار قلعے فتح کیے اور باقی چار قلعوں کے محصورین نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان دس دنوں میں علیؓ نے سولہ دفعہ دست بہ دست جنگ کی اور ان سولہ حریفوں کو یا تو قتل کر دیا یا اس قدر زخمی کہ وہ مقابلہ جاری نہ رکھ سکے۔ جنگِ خیبر میں علیؓ کی فتح اور ان آٹھ قلعوں کا سرنگوں ہونا بلاشبہ صدر اسلام کی بہت بڑی کامیابیوں میں سے ایک ہے۔ اس لیے کہ لشکرِ اسلام قلعہ شکنی کے وسائل سے محروم تھا اور جنگجو محصورین کی تعداد بیس ہزار تھی۔

جس وقت آخری قلعہ فتح ہوا محمد ﷺ تازہ بستر علالت سے اُٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کی موجودگی میں علیؓ کو پکڑ کر چوم لیا اور فرمایا: اے علیؓ! تم اسد اللہ یعنی اللہ کے شیر ہو۔ علیؓ کا یہ لقب بہت مشہور ہے۔

خیبر کی جنگ میں بہت زیادہ مالِ غنیمت خصوصاً اشیائے خوردنی مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ عائشہؓ اُم المومنین فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں پہلی مرتبہ جنگِ خیبر کے بعد میں نے پیٹ بھر کر کھجوریں کھائیں۔ جنگِ خیبر سے پہلے اشیائے خوردنی جو گھر میں

آتیں ہمیشہ کم ہوتی تھیں اور کھجوریں گن کر ہمیں دی جاتی تھیں۔

فتح خیبر کے بعد محمد ﷺ نے یہودیوں پر سختی نہیں فرمائی۔ یہودیوں کو اجازت دے دی گئی کہ اگر وہ خیبر سے نقل مکانی کرنا چاہتے ہیں تو جو سامان چاہیں اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں بجز کھجوروں، بھیڑ بکریوں اور غلہ کے، اور بعض روایات میں گھر کا سامان مثل قالین و برتن وغیرہ کا ذکر ہے۔

جن یہودیوں نے خیبر ہی میں رہنے کی خواہش ظاہر کی انھیں وہیں رہنے دیا گیا اور اجازت دی گئی کہ مثل سابق اپنے کاموں میں مشغول ہو جائیں۔ علیؓ نے اسلامی لشکر کو باغات اور نخلستانوں میں داخل ہونے یا ان باغات کے درختوں اور پھلوں کو نقصان پہنچانے سے منع کر دیا۔ مسلمانوں اور یہودیوں کی بہبود اور باہمی تعلقات کی استواری کے خیال سے آپ ﷺ نے خیبر کی ایک یہودی عورت صفیہ جو اسلام لے آئیں سے شادی کر لی۔

ایک دن ایک مجاہد خیبر کے قلعوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ علیؓ نے تمام یہودیوں کو جمع کیا اور قاتل کے متعلق استفسار کیا۔ یہودیوں نے قسم کھائی کہ اس کا قاتل کوئی یہودی نہیں اور خیبر کے یہودیوں میں سے کسی نے اسے قتل نہیں کیا۔

علیؓ نے یہ سب حالات محمد ﷺ کے حضور عرض کیے کہ تمام یہودی قسم کھاتے ہیں کہ وہ اس قتل میں ملوث نہیں ہیں۔ پھر اس مقتول کا خون بہا کس سے وصول کیا جائے؟

محمد ﷺ نے فرمایا: چونکہ انھوں نے قسم کھائی ہے میں ان کی قسم قبول کرتا ہوں، اور خون بہا اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ فتح خیبر کے بعد دو اور یہودی قبیلے جو وادی القریٰ میں رہتے تھے مسلمانوں کو جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو گئے اور اطاعت قبول کر لی۔



خالدؓ بن ولید کا اعتراف

جنگِ خیبر کے دوران دو مسلمان افراد حبشہ سے خیبر آئے۔ ان میں سے ایک آپ ﷺ کا برادر رضاعی جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرا عمروؓ بن امیہ تھا۔ ان دونوں مسلمانوں نے حبشہ ہجرت کی تھی اور اب سب سے آخر میں حبشہ کو چھوڑا۔ ان کے واپس آنے کے بعد حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی مکمل ہو گئی۔

فتح خیبر کے بعد یہودیوں نے حسب سابق اپنے کنیسہ میں عبادت شروع کر دی۔ تمام اوراق و مذہبی کتب جو جنگ کے دوران مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھیں، یہودیوں کو واپس کر دی گئیں۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات بہت خوشگوار ہو گئے۔ ایک یہودی عورت زینب نے جو حارث کی بیٹی تھی اور سلام بن مشکم کی بیوی تھی، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے لیے طعام بھجوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک بکری کو بریاں کیا اور چونکہ اس نے سن رکھا تھا پیغمبرِ اسلام ﷺ کو دستی کا گوشت بہت پسند ہے لہٰذا دونوں دستیوں کو زہر آلود کر کے آپ ﷺ کو بھجوا دیا۔ جب یہ طعام لایا گیا آپ ﷺ کے پاس ایک مسلمان بشرؓ بن براءؓ بن معرور بیٹھے تھے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ایک دستی اسے دی اور دوسری سے لقمہ جدا کر کے منہ میں ڈالا۔

بشرؓ بن براءؓ بن معرور نے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے دوسری دستی لے کر اسے دانتوں سے کاٹ کر گوشت علیحدہ کیا اور کھا لیا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جو لقمہ منہ میں ڈالا تھا، فوری منہ سے نکال دیا اور بشرؓ بن براءؓ بن معرور سے کہا: اسے مت کھانا، یہ زہر آلود ہے۔

بشرؓ بن براءؓ بن معرور کچھ گوشت کھا چکا تھا، لہٰذا فوت ہو گیا۔ آپ ﷺ زندہ رہے۔

زینب کو گرفتار کر کے اس سے پوچھا گیا: کیا تم نے جو گوشت (بھنا ہوا) پیغمبرِ اسلام ﷺ کے لیے بھیجا تھا زہر آلود تھا؟ اس عورت نے اعتراف کیا اور کہا: میں نے خود گوشت کو زہر

آلود کیا تھا اور دل میں سوچا کہ اگر محمد ﷺ خدا کا بھیجا ہوا ہے اور اس کا پیغمبر ہے تو اسے گوشت کے زہر آلود ہونے کا علم ہو جائے گا، وہ اسے نہیں کھائے گا۔

جن مورخوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ خاموش ہیں کہ مسلمانوں نے اس عورت سے کیا سلوک کیا؟ آیا سزا دی گئی یا معاف فرما دیا گیا۔ مسعودی، ابنِ ہشام، اسد بیگ، طبری، ابنِ ابی الحدید، زمخشری سب نے اس واقعہ کا ذکر کیا مگر اس بات پر خاموش ہیں کہ یہ جان لینے کے بعد کہ محمد ﷺ سچے پیغمبر ﷺ ہیں وہ عورت ایمان لائی یا نہیں۔

کچھ مؤرخین اسلام نے لکھا ہے کہ جب اس جہان سے کوچ کا وقت قریب تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری موت کا سبب وہی زہر ہے جو خیبر میں مجھے کھلایا گیا تھا۔ اگرچہ میں نے وہ گوشت منہ سے نکال دیا تھا، لیکن منہ میں گوشت چبانے کی وجہ سے کچھ اس کا اثر حلق سے نیچے چلا گیا تھا۔ اسی نے مجھے بیمار کیا اور وہی میری موت کا باعث ہوا ہے۔

اگر ان مورخین کا یہ لکھا صحیح ہے تو پھر محمد ﷺ بن عبداللہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بھی شہادت کا درجہ پایا، اس لیے کہ یہ دشمن کے زہر کا اثر تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ۶۲۸ء مطابق ۶ ہجری محمد ﷺ اور مسلمانوں نے مکّہ جا کر حج عمرہ ادا کرنے کی کوشش کی مگر مکّہ کے بت پرستوں نے حدیبیہ میں مسلمانوں کو روک دیا۔ اسی جگہ بت پرستوں اور مسلمانوں کے درمیان بالآخر ایک دس سالہ معاہدہ ہوا، جس کی رو سے مسلمان آئندہ سال خانہ کعبہ کی زیارت کر سکتے تھے اور یہ کہ مسلمان مکّہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہیں کریں گے۔ اس معاہدہ حدیبیہ کی رو سے آپ ۶۲۹ء مطابق ۷ ہجری دو ہزار افراد کے ساتھ مکّہ کو روانہ ہوئے تا کہ زیارت کعبہ کر سکیں۔ زائر ہونے کی حیثیت سے جز شمشیر کوئی اور اسلحہ ان کے پاس نہیں تھا۔

جس وقت مسلمان مکّہ میں وارد ہوئے، قریش کے لوگ ڈر کر مکّہ سے باہر چلے گئے اور مکّہ کے اردگرد پہاڑوں پر چڑھ گئے، خصوصاً ان پہاڑوں پر جو خانہ کعبہ کے اردگرد سر بلند تھے اور وہاں سے مسلمانوں کو طواف کرتے دیکھتے رہے۔

قریش کے اس خوف کی وجہ یہ تھی کہ انھیں مسلمانوں پر اعتماد نہیں تھا۔ انھیں خدشہ تھا کہ مسلمان کہیں شہر میں داخل ہونے کے بعد ہم پر حملہ نہ کر دیں اور ہم سب کو قتل نہ کر دیں۔

محمد ﷺ نے بھی احتیاط برتی تھی۔ ایک سو سواروں پر مشتمل ایک دستہ کو محمدؓ بن مسلمہ کی سربراہی میں علاقہ مرالظہران کے جسے مقعر میں تعینات کیا۔ اس کے جوار میں پہاڑی علاقہ تھا جہاں سے محمدؓ بن مسلمہ اور اس کے سوار مکّہ پر نگاہ رکھ سکتے تھے۔

محمد ﷺ نے محمدؓ بن مسلمہ کو حکم دیا تھا کہ جب دیکھو کہ اہل مکّہ نے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے تو اپنے دستے کے ساتھ فوری مدد کے لیے پہنچ جانا۔ دوسری صورت میں تمھارا قیام وہیں رہے گا تاوقتیکہ ہم لوٹ آئیں۔

بت پرست جو پہاڑوں کے اوپر سے مسلمانوں کے مکّہ میں ورود کا منظر دیکھ رہے تھے مسلمانوں کے نظم وضبط پر بہت متعجب ہوئے۔

بلال حبشی جنھیں اسلام کے دورِ اوّل میں ابوجہل نے جلتے سورج کے نیچے تپتی زمین پر باندھ کر لٹا دیا تھا، انھوں نے کعبہ کی اونچی چھت پر چڑھ کر اذان کہی۔

جب بلالؓ نے کہا: اَللّٰہُ اَکْبَرُ...... اَللّٰہُ اَکْبَر...... لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

مکّہ کے لوگوں کے دلوں پر وحشت ونفرت کی وجہ سے لرزہ طاری ہو گیا اور وہ منتظر رہے کہ ابھی کعبہ کا بڑا بت مسلمانوں پر آسمان گرا دے گا۔

لیکن کوئی نا مطلوب واقعہ مسلمانوں کے ساتھ پیش نہ آیا حتیٰ کہ ایک سنگریزہ بھی آسمان سے نہ گرا۔ اوّلین بار اللہ اکبر کی صدا مکّہ کی فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جس گھڑی محمد ﷺ اور مسلمان احرام کی حالت میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے فرط شوق اور خلوص نیت سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے حتیٰ کہ عمرؓ بن الخطاب بھی رو رہے تھے، اس لیے کہ مسلمان ایک مدت تک خانہ کعبہ سے دور کر دیے گئے تھے اور وہ تصور نہیں کرتے تھے کہ دوبارہ خانہ کعبہ کو دیکھ سکیں یا اس کا طواف کر سکیں گے۔

حج وعمرہ کی رسومات کی ادائیگی کے بعد نبی ﷺ کی خواہش تھی کہ کسی طرح جماعتِ قریش سے راہ ورسم پیدا ہو، لہٰذا آپ ﷺ نے عرب کی معروف ترین عورتوں میں سے ایک کے ساتھ ازدواج کرنے کا ارادہ کیا۔

پس آپ ﷺ نے میمونہؓ بنت الحارث جو عباسؓ کی بیوی کی بہن تھیں، سے ازدواج کرلیا۔

یہ ازدواج ایک بہت بڑا سیاسی اقدام تھا، اس لیے کہ میمونہؓ کی آٹھ بہنیں تھیں اور سب کی سب مکہ کے بڑے بڑے امرا کے گھروں میں تھیں۔ محمد ﷺ میمونہؓ سے شادی کے بعد آٹھ بڑے افراد کے قرابت دار ہو گئے۔

مکہ کے ورود کے دوسرے ہی دن محمد ﷺ نے دعوت کے انتظامات شروع کر دیے تھے۔ اہل مکہ بدستور پہاڑوں پر بیٹھے تھے۔ انھیں جرات نہ تھی کہ پہاڑوں سے اُتر کر شہر میں داخل ہوں۔ لیکن مسلمانوں کے نظم وضبط، بلالؓ کی اذان اور نمازِ مغرب میں صف بندی کے مناظر نے مشرکین مکہ کو بہت متاثر کیا۔ یہ تاثر اس قدر گہرا تھا کہ خالد بن ولید مشرکین مکہ کا ایک سردار جو پہاڑ سے یہ منظر دیکھ رہا تھا بے ساختہ کہہ اُٹھا: یہ مرد جو ایسا دین لایا ہے اور اس طرح کے پیروکار رکھتا ہے جھوٹا اور فریبی نہیں ہے۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں، جو لوگ اس کے اردگرد جمع ہیں اس پر واقعی ایمان رکھتے ہیں۔ اگر یہ مرد جھوٹا ہوتا تو یہ لوگ اس پر اس خلوص سے ایمان نہ لاتے۔

تیسرے روز علی الصبح محمد ﷺ نے قریش کو دعوت ولیمہ کا پیغام بھجوانے کا ارادہ کیا، لیکن پیشتر اس کے کہ آپ ﷺ کے پیغام بر قریش کو دعوت دینے کے لیے جاتے، قریش کے نمائندوں کی ایک جماعت شہر میں داخل ہوئی اور سیدھی محمد ﷺ کے پاس آئی۔ اس نمائندہ جماعت کی قیادت ابنِ عبدالعزیٰ کے سپرد تھی۔ عزیٰ خانہ کعبہ کے تین بڑے بتوں میں سے ایک تھا۔ مکہ کے بعض لوگ اپنے نام اس نسبت سے عبداللات یا عبدالمنات یا عبدالعزیٰ رکھا کرتے تھے۔

یہ بھی واضح ہو کہ مسلمانوں کا خدا (اللہ) بھی خانہ کعبہ کے خداؤں میں شامل تھا یعنی

بعض افراد اللہ کی بھی مثلِ لات، منات اور عزیٰ پرستش کرتے تھے، جیسے قبل از اسلام محمد ﷺ کے والدِ ماجد کا نام عبداللہ تھا۔

اسی بنا پر محمد ﷺ کے والد ماجد اگر عبداللہ کہلاتے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ اللہ دورِ جاہلیت میں کعبہ کے خداؤں میں سے ایک خدا شمار ہوتا تھا۔

ابنِ عبدالعزیٰ اور اس کے ساتھی رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تو دیکھا کہ مسلمان پذیرائی کے وسائل مہیا کرنے میں مشغول ہیں۔

ابنِ عبدالعزیٰ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سب انتظامات اس لیے کیے جا رہے ہیں کہ محمد ﷺ اپنی شادی پر قریش کو دعوتِ ولیمہ میں بلانا چاہتے ہیں تو محمد ﷺ کو فوری مکہ چھوڑ جانے کو کہا، اس لیے کہ مسلمان معاہدہ کے مطابق فقط تین روز مکہ میں قیام کر سکتے ہیں اور چونکہ یہ مدت گزر چکی ہے لہٰذا شہر سے خارج ہو جائیں۔ نتیجتاً محمد ﷺ اس روز قریش کو دعوت نہ دے سکے اور مجبوراً مسلمانوں کے ہمراہ فوری طور پر مکہ کو ترک کیا۔

لیکن جیسے ہی مسلمان مکہ سے نکلے اور مدینہ کی راہ لی، خالد بن ولید کہ اب پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خویشوں میں سے تھے اور جو مسلمانوں کے نظم وضبط اور خالص ایمان کی وجہ سے بہت متاثر تھے، مکہ سے نکلے اور مسلمانوں کے پاس پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔ خالدؓ بن ولید بعد میں اسلام کے بہت بڑے سرداروں میں سے ہوئے۔ محمد ﷺ کی طرف سے انھیں سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا لقب ملا۔

علیؓ ابنِ ابی طالب کو سب سے پہلے اسد اللہ (اللہ کا شیر) کا لقب عطا ہوا تھا۔ علیؓ کے بعد فقط خالد بن ولیدؓ ہی ایک ایسے سردار گزرے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے سیف اللہ کا لقب دیا۔ ان ہر دو اشخاص کے بعد کوئی بھی سردار پیغمبرِ اسلام ﷺ کے نزدیک اس مرتبہ کو نہ پہنچا۔

جس وقت خالدؓ بن ولید اسلام قبول کرنے کی نیت سے مسلمانوں کے قافلہ کے پیچھے جا رہے تھے تو راستے میں اسے عمرو بن العاص ملے جو مکہ سے آ رہے تھے اور مسلمانوں سے ملحق

ہونا چاہتے تھے۔ وہ بھی خالد بن ولید کے ہمراہ ہو لیے اور مسلمان ہو گئے۔

معاہدہ حدیبیہ کی رُو سے مسلمان مکلف تھے کہ جو شخص قریش کی رضامندی کے بغیر مسلمانوں سے ملحق ہوگا، مسلمان اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن خالدؓ بن ولید کے بارے میں قریش کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے بارے میں ایسا مطالبہ کریں۔ ضمناً انھیں یہ علم تھا کہ مسلمان اب بہت قوی ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کے مدینہ واپس پہنچنے پر ایک واقعہ پیش آیا جس نے تمام مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وہ یہ کہ ابوسفیان مکی لشکر کا سردار محمد ﷺ سے ملاقات کے لیے بذاتِ خود مدینہ آیا۔ ابوسفیان بغیر کسی لشکر کے مدینہ آیا تھا۔

لیکن مدینہ میں داخل ہونے پر اس نے کچھ خوف محسوس نہ کیا، اس لیے کہ اب مسلمانوں اور مکہ والوں کے درمیان صلح کا معاہدہ موجود تھا۔ ابوسفیان جانتا تھا کہ جب تک معاہدہ موجود ہے، مسلمان اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے، خصوصاً جب کہ وہ بغیر لشکر کے آیا ہے۔ علاوہ ازیں اسے معلوم تھا کہ محمد ﷺ امین اور راست بازی میں معروف ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب ابوسفیان بغیر لشکر کے آیا تھا تو یہ ایک نوع کی پناہ طلبی تھی۔ اور عرب پناہ گزین کے جان و مال کا احترام کیا کرتے تھے اور اپنی طاقت و ہمت کے مطابق اس کی پذیرائی کیا کرتے تھے۔

ابوسفیان کے اس طرح مدینہ آنے کی مندرجہ ذیل وجوہ تھیں:

صلح حدیبیہ کے مطابق اہلِ مکہ اور مسلمان مجاز تھے کہ جس کسی سے چاہیں متحد ہوں یا جنگ کریں۔ ان دونوں حالتوں میں فریقِ ثانی غیر جانبدار رہے گا۔

قبیلہ خزاعہ پر جو مسلمانوں کا اتحادی تھا، قبیلہ بنوبکر نے حملہ کر دیا اور یہ مشہور ہوا کہ قریش نے قبیلہ بنوبکر کی اسلحے اور افراد سے مدد کی ہے اور یہ باور کرنے کے لیے وجوہ بھی موجود تھیں کہ اس حملہ میں مکہ والوں کا ہاتھ ہے۔ قبیلہ بنوبکر نے قبیلہ خزاعہ پر جو حملہ کیا، اس میں مکہ

والوں کا ملوث ہونا صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی تھی لیکن اشراف مکہ نے اسے اس وقت تک کوئی اہمیت نہ دی جب تک کہ خیبر مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نہ ہو گیا۔

جب خیبر کا سقوط ہوا اور شمالی عربستان کے وسیع علاقوں پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو گیا تو اشرافِ مکہ کو معاہدہ کی خلاف ورزی کا احساس ہوا اور وہ خوفزدہ ہوئے۔ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ ابوسفیان مدینہ آیا کہ اس اختلاف کو کسی طرح دور کرے۔ مدینہ میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھا اُمِ حبیبہؓ کے گھر گیا جو محمد ﷺ کی بیوی اور خود اس کی اپنی بیٹی تھی۔ جس وقت ابوسفیان ان کے کمرے میں داخل ہوا، اُمِ حبیبہؓ نے چٹائی جو کمرہ میں بچھی ہوئی تھی، لپیٹ دی۔

ابوسفیان نے اپنی بیٹی کی اس حرکت پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا: تم نے چٹائی کو کیوں لپیٹ دیا ہے؟ اُمِ حبیبہؓ نے باپ سے کہا: اس چٹائی پر محمد ﷺ بیٹھتے اور سوتے ہیں۔ میں کیسے چٹائی پر ایک مشرک کو بیٹھنے دوں؟

ابوسفیان نے کھڑے کھڑے ہی اپنی بیٹی سے درخواست کی کہ محمد ﷺ کے نزدیک وہ واسطہ بنے، تاکہ یہ اختلاف جو دو قبیلوں خزاعہ اور بنوبکر کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ختم ہو جائے۔

اُمِ حبیبہؓ نے کہا: میں اس میں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ آپ مسجد میں محمد ﷺ کے پاس چلے جائیں اور رسول اللہ ﷺ سے مذاکرات کریں۔

ابوسفیان مسجد میں گیا۔ محمد ﷺ نے اس سے کہا: بیٹھو۔ جب ابوسفیان بیٹھ گیا تو اس سے پوچھا: کس کام سے آئے ہو؟ ابوسفیان نے کہا! اے محمد ﷺ، میں آیا ہوں کہ دونوں قبیلوں بنوبکر اور خزاعہ کی بابت تم سے بات کروں۔ محمد ﷺ نے فرمایا: کیا کہنا چاہتے ہو؟

ابوسفیان نے کہا: میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دونوں قبیلوں بنوبکر اور خزاعہ کی لڑائی میں مکہ والوں نے بنوبکر کی کوئی مدد نہیں کی۔ ہاں اگر تم خیال کرتے ہو کہ مکہ والوں نے قبیلہ بنوبکر کی مدد کی ہے اور اس مدد کی وجہ سے قبیلہ خزاعہ کو نقصان پہنچا ہے تو مکہ والے ہر قسم کا تاوان ادا کرنے کو تیار ہیں۔

محمد ﷺ نے جواب میں فرمایا: اگر تم نے قبیلہ بنوبکر کی مدد نہیں کی ہے تو تمھیں متفکر نہیں ہونا چاہیے اور ہم تم سے کوئی تاوان نہیں لیں گے۔

ابوسفیان اس سے زیادہ محمد ﷺ سے کچھ نہ کہلوا سکا۔ لہٰذا مضطرب ہی مدینہ سے واپس ہوا اور مکہ کی راہ لی۔



رُوم سے جنگ

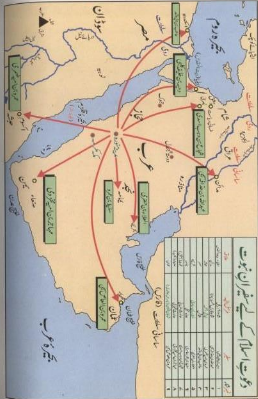
خیبر پر تصرف کے بعد مسلمان طاقت ور ہو گئے تھے۔ محمد ﷺ نے اطراف کے بادشاہوں اور حاکموں کو خطوط بھجوائے، جن میں ان کو دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ایک خط شہنشاہِ رومۃ الصغریٰ (قسطنطنیہ) کے نام اور دوسرا ایران کے بادشاہ کے نام بھجوایا۔ تیسرا خط حبشہ کے بادشاہ (نجاشی) کے نام اور چوتھا بادشاہِ مصر کے نام بھجوایا۔

سلاطین میں سے ایک حارث بن ابی شمر غسانی نامی عربستان[1] کا بادشاہ تھا۔ اس کو شہنشاہ رُومۃ الصغریٰ کی حمایت حاصل تھی۔ محمد ﷺ نے حارث بن ابی شمر کے نام جو خط لکھوایا، وہ خط ایک مسلمان حارث رضی اللہ عنہ بن عمیر ازدی کے سپرد کیا اور فرمایا: یہ خط حارث بن ابی شمر کو دینا اور اس کا جواب لے کر آنا۔

جیسے ہی پیغمبرِ اسلام ﷺ کا نمائندہ حارث بن ابی شمر کی مملکت کی حدود میں داخل ہوا، اس مملکت کے ایک سرحدی حاکم شرحبیل بن عمرو نے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں نے بہت زیادہ اثر لیا اس لیے کہ ایلچی کو تمام قبائل اور قومیں امان دیتی تھیں اور ایک ایلچی کو کوئی بھی قتل نہیں کرتا تھا۔

پس محمد ﷺ نے حارث بن ابی شمر کو پیغام بھجوایا کہ تمھارے ایک حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے ہمارے ایک بے گناہ آدمی کو قتل کیا ہے، حالانکہ وہ ایک قاصد تھا اور ہمارا ایک خط تمھارے لیے لے جا رہا تھا۔ وہ آدمی تنہا تمھاری مملکت کی حدود میں داخل ہوا۔ ظاہر ہے کہ

۱۔ یہاں عربستان سے مراد جزیرہ نمائے عرب کے شمالی علاقے ہیں جن میں بلقاء (اردن)، حوران (شام) اور بصری الشام وغیرہ شامل تھے۔ (م ف)



اس کا یہ سفر دشمنی پر مبنی نہیں تھا۔ اگر وہ تمھارے ملک میں ایک دشمن کی حیثیت سے داخل ہوتا تو یقیناً ایک لشکر اس کے ساتھ ہوتا۔ ایک ایلچی کا قتل کسی قوم، ملت اور مذہب میں روا نہیں۔ تیرے اس حاکم شرحبیل بن عمرو نے قتل عمد کیا ہے، لہٰذا ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے یہ جرم اپنے طور پر کیا ہے یا تمھارے حکم سے ایسا ہوا ہے۔ اگر تمھارے حکم کے بغیر ہی ایک بے گناہ ایلچی کو قتل کیا گیا ہے تو تم اس مجرم کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ اسے اس کے جرم کی سزا دی جا سکے اور اگر ایلچی تمھارے حکم سے قتل ہوا ہے تو اس قتل کے تم ذمہ دار ہو۔ اور تمھیں اس قتل کی سزا دی جائے گی۔

حارث بن ابی شمر نے محمد ﷺ کو جواب دیا: میں اپنی مملکت میں بادشاہ ہوں۔ صاحب اختیار ہوں۔ جس کسی کو چاہوں قتل کر سکتا ہوں اور تمھیں مجھ سے باز پرس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تمھارا ایلچی میرے ہی حکم سے قتل کیا گیا ہے۔

جب پیغمبرِ اسلام ﷺ کو حارث بن ابی شمر کا تیز و تند جواب موصول ہوا تو آپ ﷺ نے اس پر لشکر کشی کا ارادہ کیا اور تین ہزار مسلمانوں کا لشکر اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا۔ حارث بن ابی شمر چونکہ رومۃ الصغریٰ کا حمایت یافتہ تھا، لہٰذا اس سے کمک کا خواست گار ہوا۔

اتفاقاً شہنشاہِ رومۃ الصغریٰ (ہرقل) ان دنوں شاہ ایران سے جنگ کی تیاری کر رہا تھا اور ایک لاکھ کا لشکر اس مقصد کے لیے تیار کر چکا تھا۔ حارث بن ابی شمر کی درخواست پر اس نے وہی ایک لاکھ کا لشکر اس کی مدد کے لیے بھجوا دیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خود حارث بن ابی شمر کے پاس کتنی سپاہ تھی۔ بعض مؤرخوں نے اس کی تعداد دس ہزار اور بعض نے ایک لاکھ لکھی ہے۔ مؤخر الذکر تعداد حقائق سے دُور معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ حارث بن ابی شمر ایک چھوٹی سی مملکت کا بادشاہ تھا۔ وہ ایک لاکھ کے لشکر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔[۲]

۲- خود رسول اللہ ﷺ نے جو تین ہزار کا لشکر بھجوایا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حارث بن ابی شمر کے پاس بہت بڑا لشکر نہیں تھا۔ یہ رومی لشکر کی مدد تھی جس کی وجہ سے عددی تناسب قائم نہ رہ سکا۔ (مترجم)

بہرحال اگر حارث بن ابی شمر کے پاس کوئی لشکر بھی نہ ہوتا تب بھی اس کے پاس ایک لاکھ کا رُومی لشکر آ چکا تھا جس کے مقابل مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس چھوٹے سے تین ہزار کے لشکر کا ایک لاکھ کے رُومی لشکر سے موتہ کے مقام پر آمنا سامنا ہوا۔ موتہ، حارث بن ابی شمر کی مملکت غسان میں واقع تھا۔

اسلامی تاریخوں میں مدینہ سے کوچ کے وقت اس اسلامی لشکر کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے والوں کے دو نام پائے جاتے ہیں۔ ایک زیدؓ بن حارثہ، رسول اللہ ﷺ کے متبنّیٰ اور آزاد کردہ غلام، دوسرے جعفرؓ بن ابی طالب۔

ایک اور روایت میں میدانِ جنگ کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسلامی مؤرخین نے لکھا ہے کہ موتہ کے مقام پر مسلمانوں نے یہ دوسری جنگ لڑی تھی۔ اس سے پہلے ایک اور جنگ میں مسلمان شکست کھا چکے تھے۔

ایک لاکھ کا لشکر جو شاہِ روم نے حارث بن ابی شمر کی مدد کے لیے بھیجا رُومی طرزِ جنگ کے ساز و سامان سے پوری طرح لیس تھا۔ ہر چھ ہزار افراد سے ایک ڈویژن تشکیل پاتا تھا۔ ہر ڈویژن کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر تیسواں حصہ (جو کہ دو سو افراد ہوتا ہے) کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی لشکر کا چھوٹے سے چھوٹا کالم یا کمپنی سو افراد پر مشتمل تھی۔ رُومی سپاہ خود، زرہ، بڑی بڑی ڈھالوں، لمبے نیزوں اور تلواروں سے لیس تھی۔ صف بندی کے فن سے آگاہ اور فنونِ جنگ میں ماہر تھی۔

جب یہ چھوٹا سا اسلامی لشکر ایک لاکھ کے لشکر کے سامنے آیا تو کچھ مسلمانوں نے کہا کہ باہم مشورہ کر لیں کہ آیا ہمیں اس حالت میں جنگ لڑنی چاہیے یا نہیں۔ بلاشبہ ہم سابقہ جنگوں میں ہمیشہ اپنے سے کئی گنا زیادہ دشمن سے لڑے ہیں، مگر یہاں تو دشمن کی تعداد ہم سے چالیس گنا زیادہ ہے اور دشمن کی سپاہ بھی برتر ساز و سامان سے لیس ہے جب کہ ہماری سپاہ میں سے کچھ کے پاس خود اور زرہیں بھی نہیں ہیں۔

زیدؓ بن حارثہ یا جعفرؓ بن ابی طالب نے جس کسی کے ہاتھ میں بھی لشکر کی کمان تھی کہا:

ہم تو خدا کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اگر دشمن کو قتل کر کے غلبہ حاصل کریں تو بھی ہمارا مقام جنت ہے اور اگر قتل اور مغلوب ہوئے تب بھی ہم جنت کے امیدوار ہیں۔ دشمن کی کثرتِ تعداد سے وہ لوگ خوفزدہ ہوتے ہیں جو اپنے انجام سے مطمئن نہیں ہوتے اور ہم جو جانتے ہیں کہ بہشت میں جائیں گے، دشمن کی کثیر تعداد سے کیوں مرعوب ہوں؟

مسلمانوں نے اپنی سابقہ تکنیک (صف بندی) پر عمل کیا یعنی جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنی صفیں درست کیں۔ مگر اس جنگ میں یہ چال مفید ثابت نہ ہوئی، اس لیے کہ رُومی اس طرزِ جنگ سے آگاہ اور بہتر ساز وسامان سے لیس تھے۔ زیدؓ بن حارثہ سپہ سالارِ لشکرِ اسلام جنگ کی پہلی ساعتوں ہی میں شہید ہو گئے۔ ان کے بعد جعفرؓ بن ابی طالب نے کمان سنبھالی اور لشکر کو عقب نشینی کا حکم دیا۔ لشکر پیچھے ہٹتا ہٹتا موتہ کی آبادی کے نزدیک پہنچ گیا۔

جیسا کہ کتابوں میں مذکور ہے، وہاں پہنچنے تک جعفرؓ بن ابی طالب کے دو ہاتھ کٹ چکے تھے۔ وہ ٹانگوں سے اپنا دفاع کر رہے تھے اور اسی حالت میں شہید ہو گئے۔ جعفرؓ بن ابی طالب کی شہادت کے بعد لشکر کی کمان عبداللہؓ بن رواحہ نے سنبھالی۔ وہ انصاری تھے۔ عبداللہؓ بن رواحہ نے مسلمانوں کی قلبی تقویت کے لیے اونچی اور دل نشیں آواز میں قرآن کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ آیات جہاد سے متعلق تھیں۔ اللہ کی راہ میں فداکاری، شہادت کا درجہ اور شہادت کے بعد بہشت میں جانا۔

اسی حالت میں شمشیر زنی کرتے، کبھی کبھی نعرے لگاتے، لشکر کی صف بندی کی حفاظت کرتے۔ اگر مسلمان جنگِ موتہ میں اپنی صف بندی قائم نہ رکھتے تو سب کے سب شہید ہو گئے ہوتے۔ صرف اپنی صفیں قائم رکھنے ہی کے باعث اس روز مسلمان عصر تک اتنے بڑے لشکر کے سامنے مقاومت دکھاتے رہے۔ عصر کے بعد عبداللہؓ بن رواحہ بھی شہید ہو گئے اور اس وقت لشکر کی کمان خالدؓ بن ولید نے سنبھالی۔

مؤرخوں میں دورانِ جنگ کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ جنگِ موتہ ایک ہی دن میں ختم ہو گئی تھی اور بعض کہتے ہیں کہ جنگ دوسرے دن بھی جاری رہی تھی۔

میرا خیال ہے جنگ پہلے دن ہی جب خالدؓ بن ولید نے لشکر کی کمان سنبھالی ختم ہو گئی تھی۔ اگر جنگ پہلے ہی دن ختم نہ ہو گئی ہوتی اور دوسرے دن بھی جاری رہی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ایک مسلمان فرد بھی زندہ بچ نکلتا۔ اس دن دو چیزیں مسلمانوں کی کامیاب پسپائی کا باعث ہوئیں: ایک خالدؓ بن ولید کی جنگی قابلیت اور دوسرے تاریکی۔

خالدؓ بن ولید تمام لشکر کی کمان سنبھالنے سے پہلے پانچ سو افراد کے کماندار تھے اور جنگ کے آغاز سے اختتام تک نو تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ چکی تھیں۔ پورے لشکر کی کمان سنبھالنے کے بعد خالدؓ نے صف بندی میں تبدیلی کی اور حملے کا حکم صادر فرمایا۔ مسلمانوں کی چھ صفوں میں سے اس وقت تک تین ختم ہو چکی تھیں، یعنی تین ہزار میں سے ڈیڑھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے تھے۔

خالدؓ بن ولید کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ حارث بن ابی شمر کے رُومی لشکر کی پیش قدمی رُک گئی اور وہ سمجھے کہ مسلمانوں کو تازہ کمک آ گئی ہے، جو انھوں نے اس شدت سے ازسرِ نو حملہ کیا ہے۔ اس کے بعد اندھیرا چھانے لگا۔ خالدؓ نے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور لشکرِ اسلام رات کے اندھیرے میں پچھلی پوزیشن پر چلا گیا۔

جنگِ موتہ میں دو ہزار مسلمان شہید ہوئے جن میں محمد ﷺ کے بچپن کے ساتھی اور برادرِ رضاعی جعفرؓ بن ابی طالب بھی شہید ہوئے۔ زیدؓ بن حارثہ بھی جو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور محمد ﷺ نے انھیں اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا اس جنگ میں شہید ہوئے۔ زیدؓ بن حارثہ ان چار مسلمانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔

موتہ میں پسپائی کے باوجود سارے حجاز میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ خالدؓ بن ولید بڑی قابلیت اور شجاعت سے ایک ہزار افراد کو بچا کر مدینہ واپس پہنچ گئے تھے۔ اسی شجاعت کی بنا پر جو خالدؓ نے جنگِ موتہ میں دکھائی سیف اللہ کا لقب پایا۔

حجاز جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، جزیرہ نمائے عرب کی اس پہاڑی پٹی کا نام ہے جو بحیرہ احمر کے ساتھ ساتھ ایک ہزار کلومیٹر تک شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہے۔ گزشتہ ادوار میں جو

شخص حجاز کو تاراج کر لیتا تھا وہ تمام جزیرہ نمائے عرب کا فرمانروا ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے یہ کامیابی حاصل کر لی تھی اور ماسوائے مکّہ کے تمام حجاز کے قبائل اسلام قبول کر چکے تھے۔

اب محمد ﷺ نے مکّہ کو تسخیر کرنے کا ارادہ کیا۔ قریش قبیلہ بنوخزاعہ کے خلاف قبیلہ بنوبکر کی مدد کر کے معاہدہ حدیبیہ کو توڑ چکے تھے۔ لہٰذا اب مکّہ پر حملہ کرنے اور اسے تسخیر کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ قریش کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی ثابت ہو چکی تھی۔ ابوسفیان مدینہ آ کر قبیلہ بنوخزاعہ کے نقصانات کی تلافی کرنے کی پیشکش کر چکا تھا۔ ابوسفیان کی یہ پیش کش ثابت کرتی تھی کہ قریش نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔

دونوں قبائل کے درمیان جنگ کے واقعات کی شرح بالاختصار حسبِ ذیل ہے:

بنوخزاعہ مسلمان نہ تھے بلکہ اس قبیلہ کے چند افراد اسلام لائے ہوئے تھے۔ یہ قبیلہ علاقہ وتیر میں رہتا تھا جو مکّہ کے نزدیک اور مدینہ سے دور تھا۔ قبیلہ مسلمانوں کا اتحادی تھا۔

قبیلہ بنوخزاعہ اور قبیلہ بنوبکر کے درمیان زمانہ جاہلیت سے ہی کینہ چلا آ رہا تھا۔ نوفل بن معاویہ قبیلہ بنوبکر کے رئیس نے اپنے قبیلہ کو اُکسایا اور وہ سب قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کے لیے تیار ہو گئے۔ قبیلہ بنوخزاعہ مسلمانوں سے مدد مانگ سکتا تھا لیکن وتیر سے مدینہ بہت مسافت تھی۔ قبل اس کے کہ مسلمان مدد کو پہنچتے تمام قبیلہ قتل ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا وہ جان کے خوف سے مکّہ گئے اور خانہ کعبہ میں پناہ لی، اس امید پر کہ خانہ کعبہ حرم ہے اور حرم میں کوئی قتل و غارت نہیں کر سکتا، پس ہم قبیلہ بنوبکر سے محفوظ رہیں گے۔

جماعتِ قریش نے نہ صرف قبیلہ بنوبکر کو اس غارتگری کے لیے اسلحہ دیا بلکہ افرادی قوت بھی مہیا کی۔ حتیٰ کہ قریش کے چند بزرگ مثلاً سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابوجہل علی الاعلان تلواریں سونت کر بنوبکر کی مدد کو نکل پڑے۔ قبیلہ بنوخزاعہ کے افراد حرم میں پناہ لینے کے بعد خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ لیکن نوفل بن معاویہ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو بھڑکایا اور کہا کہ حرم میں داخل ہو جاؤ اور اعلان کیا کہ حرم میں بنوخزاعہ کا خون مباح ہے۔ لہٰذا تمام افراد کو قتل کر دیا جائے۔

قبیلہ بنوخزاعہ کے چند افراد نے نوفل بن معاویہ کو پکار کر کہا: یہ خانہ کعبہ ہے۔ تم خداوند کعبہ سے شرم کرو اور خانہ کعبہ میں قتل کے ارادہ سے مت داخل ہو۔ لیکن نوفل نے کہا: آج نوفل خانہ کعبہ کے خدا کو نہیں پہچانتا۔

قبیلہ بنوبکر کے افراد بنوخزاعہ کے قتل کے لیے خانہ کعبہ میں ہجوم کر آئے۔ قبیلہ بنوخزاعہ کے لوگ اس خوف سے کہ خانہ کعبہ میں خون گرے گا، خانہ کعبہ سے فرار کر گئے۔

البتہ فرار کے دوران ان کے چند افراد قتل ہوئے اور ان کے اموال پر بنوبکر نے قبضہ کر لیا۔ بدیل بن ورقا قبیلہ بنوخزاعہ کے اس واقعہ کے بعد مدینہ گیا اور تمام واقعہ جس طرح پیش آیا تھا پیغمبرِ اسلام ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ محمد ﷺ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اس لیے کہ ایک تو بنوبکر نے قریش کی مدد سے یہ حملہ کیا تھا۔ دوسرے بنوبکر نے احترامِ کعبہ کو پامال کیا تھا اور مقدس حرم میں قبیلہ بنوخزاعہ کے افراد پر حملہ آور ہوئے تھے۔

ابوسفیان جب اس موضوع پر مذاکرات کرنے مدینہ جا رہا تھا، بدیل بن ورقا مدینہ سے واپس آ رہا تھا۔ دونوں کی ملاقات عسفان کے مقام پر ہوئی۔ ابوسفیان نے بدیل بن ورقا سے پوچھا: تو مدینہ کیسے گیا تھا؟

بدیل بن ورقا نے کہا: میں ساحلی علاقہ میں گیا ہوا تھا اور اب اپنے قبیلہ میں واپس جا رہا ہوں۔

ابوسفیان نے اپنے دو آدمیوں کو مامور کیا کہ جب بدیل بن ورقا یہاں سے آگے چلے تو تم چوری چھپے اس کے اونٹوں کا تعاقب کرنا اور جب اس کے اونٹ لید کریں تو دیکھنا اس لید میں مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں موجود ہیں کہ نہیں؟ اس لیے کہ اگر بدیل بن ورقا مدینہ گیا ہوگا تو اس کے اونٹوں نے مدینہ کی کھجوریں کھائی ہوں گی۔

ابوسفیان کے آدمیوں نے بدیل کا تعاقب کیا۔ لید میں سے مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں مل گئیں۔ ابوسفیان کو یقین ہو گیا کہ قبیلہ بنوخزاعہ کے رئیس نے محمد ﷺ سے مدینہ میں ملاقات کی ہے اور یقیناً تمام واقعہ بتا دیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ محمد ﷺ سے ملاقات کے دوران ابوسفیان نے قبیلہ بنوخزاعہ کے تمام نقصانات کا ازالہ کرنے کی پیشکش کی۔



فتح مکہ اور ۸ھ کے دیگر غزوات وسرایا



بحیرۂ روم
بیت المقدس
موتہ
زید بن حارثہ
جعفر بن ابی طالب
عبداللہ بن رواحہ
کعب بن عمیر الغفاری
معان
دومۃ الجندل
ایلہ
سینا
بنو قضاعہ
بنو کلب
مدین
تبوک
عمرو بن عاص
تیماء
بنو جذام
بنو طے
ابوقتادہ ابن ربعی انصاری
غالب بن عبداللہ لیثی
الحجر
(مدائن صالح)
بنو عذرہ
فدک
بنو اسد
خیبر
مصر
بنو محارب (بنو غطفان)
املج
بنو جہینہ
ابو عبیدہ عامر بن جراح
مدینہ منورہ
بدر
بنو خزاعہ
شجاع بن وہب اسدی
حجاز
بحیرہ احمر
بنو سلیم
عمرو بن عاص
رابغ
بنو ہذیل
(بحیرہ قلزم)
غالب بن عبداللہ لیثی
سوڈان
جدہ
غزوہ حنین
مکہ مکرمہ
فتح مکہ
بنو ہوازن
طائف
غزوہ طائف
بنو ثقیف
پیمانہ

محمد ﷺ جب مکّہ میں فاتحانہ داخل ہوئے

ہم یہ تو ذکر کر چکے ہیں کہ محمد ﷺ نے مدینہ میں ابوسفیانؓ کو کیا جواب دیا تھا۔ ابوسفیان جب مدینہ سے مکّہ واپس پہنچا تو اس نے مکّہ والوں کو بتا دیا: بعید نہیں کہ محمد ﷺ مکّہ پر حملہ آور ہوں۔

ابوسفیان کا گمان بالکل صحیح تھا۔ محمد ﷺ نے جلد ہی مکّہ پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا اور مسلمانوں کو ایک جنگی سفر کے لیے تیاری کا حکم دیا، لیکن یہ وضاحت نہ کی کہ یہ سفر کس سمت اور کہاں کے لیے ہوگا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پختہ کار اور انتہائی قریبی رفیقوں ابوبکرؓ اور عمرؓ بن الخطاب کو بھی علم نہیں تھا کہ آپ ﷺ کا ارادہ کہاں کا ہے۔

لشکر کی تیاری کے احکامات سے قبل نبی کریم ﷺ نے مدینہ شہر کا رابطہ باہر سے قطع کرنے کا حکم دیا۔ کوئی شخص باہر سے مدینہ میں داخل ہونے کا مجاز نہیں، خصوصاً شہر سے باہر کوئی نہیں جا سکتا۔ محمد ﷺ جانتے تھے کہ افراد کی آمد ورفت جاری رہی تو لشکر کی تیاری کی خبر پھیل کر قریش تک پہنچ جائے گی یا خود کوئی مکّہ جا کر قریش کو خبردار کر سکتا ہے کہ مسلمان مدینہ میں جنگ کی تیاری کر رہے ہیں، حالانکہ جنگ کی تیاری کے مقاصد سے کوئی آگاہ نہیں تھا۔ لیکن جماعتِ قریش کو اس لشکر کشی کا ہدف جاننے کے لیے نبی ﷺ کے مقاصد کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔

مدینہ کا رابطہ کلی طور پر باہر سے منقطع ہو گیا۔ نہ کوئی مسافر شہر میں داخل ہو سکتا تھا اور نہ ہی کوئی شہر سے باہر جا سکتا تھا۔ کاروان جو مدینہ آتے شہر سے باہر ہی توقف کرتے۔ وہیں پر اپنی اشیا فروخت کرتے۔ بعدازاں وہ اشیا اندرونِ شہر منتقل کر لی جاتیں۔

مدینہ میں ایک شخص حاطبؓ بن ابی بلتعہ تھا۔ آدمی عقلمند تھا، سمجھ گیا کہ محمد ﷺ کا ہدف یقیناً مکّہ ہے۔ چونکہ اس کے خانوادہ کے لوگ مکّہ میں تھے اس لیے اس نے ایک خط اپنے خاندان والوں کے نام لکھا اور ایک عورت بنام سارہ کے سپرد کیا کہ مکّہ پہنچنے پر وہ اس کے خاندان

والوں کو دے دے۔ سارہ مدینہ کے ایک تاجر کی کنیز تھی۔ اس تاجر کا نام صیفی بن عمرو تھا۔ ایک تاجر کی حیثیت سے اسے شہر سے باہر آنے جانے کی اجازت تھی تاکہ اشیا جو باہر سے آتی ہیں شہر کے اندر لے آئے۔ اسی لیے سارہ کے شہر سے باہر آنے پر کسی نے پرسش نہ کی۔ وہ مدینہ سے نکلی اور مکّہ کی راہ لی۔

علیؓ ابنِ ابی طالب محمد ﷺ کے حکم کے مطابق مدینہ کے اطراف میں تمام راستوں کو کنٹرول کرنے پر مامور تھے۔ ان کو خبر ہوگئی کہ سارہ مکّہ کے لیے روانہ ہوچکی ہے۔[1] اسی وقت اس کے تعاقب پر آدمی مامور کیے کہ اسے واپس مدینہ لائیں۔ ان آدمیوں کو متنبہ کیا کہ وہ عورت کوئی چیز ضائع نہ کرنے پائے۔ علیؓ کے آدمی اس عورت کو اور خط جو اس کی تحویل میں تھا، لے کر علیؓ کے پاس واپس آگئے۔ علیؓ نے خط پڑھا تو سمجھ گئے کہ یہ خط حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے اپنے خاندان والوں کے نام، جو مکّہ میں ہیں، بھجوایا ہے۔

بعدازاں سارہ سے پوچھ گچھ کی تاکہ معلوم ہو وہ اس خط کے متن سے آگاہ ہے یا نہیں؟ لیکن سارہ خط کے متن سے آگاہ نہ تھی۔ پس علیؓ نے اس واقعہ کی اطلاع محمد ﷺ کی خدمت میں بھجوادی۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے حاطبؓ کو طلب کیا۔ اس کا خط اسے دکھایا اور پوچھا: آیا تم نے یہ خط صیفی بن عمرو کی کنیز کے ہاتھ مکّہ بھجوایا تھا۔ حاطبؓ نے اعتراف کیا کہ خط اسی کا ہے۔

محمد ﷺ نے مزید پوچھا: آیا صیفی کو اس کی اطلاع ہے کہ تو نے یہ خط اس کی کنیز کے ہاتھ مکّہ بھجوایا تھا۔

حاطبؓ نے عرض کی: نہیں یارسول اللہ ﷺ! صیفی بن عمرو کو اس کی اطلاع نہیں۔

محمد ﷺ چونکہ جانتے تھے کہ حاطبؓ کا مقصد کوئی سازش نہیں تھا بلکہ اپنے خانوادہ کو مطلع

۱۔ سیرت ابن ہشام (عربی) میں لکھا ہے: حاطبؓ نے جو کام کیا تھا اس کے متعلق آسمان سے نبی ﷺ کے پاس وحی آگئی، چنانچہ آپ ﷺ نے علیؓ اور زبیرؓ سے فرمایا: ''جاؤ، تمھیں ایک عورت ملے گی جس کے پاس حاطبؓ ابن بلتعہ کا قریش کے نام لکھا ہوا خط ملے گا جس میں ان کے خلاف ہماری تیاری سے انھیں خبردار کیا گیا ہے۔ (جلد ۴ص ۴۷)

کرنا تھا کہ وہ مکہ کو ترک کر دیں تا کہ جنگ کے خطرات سے محفوظ رہیں لہٰذا اسے معاف کر دیا۔

مدینہ میں ہدف کے متعلق دو خبریں مشہور تھیں:

اوّل یہ کہ محمد ﷺ موتہ کی شکست کی تلافی کے لیے رُوم پر حملہ کریں گے۔

دوم یہ کہ محمد ﷺ کا ہدف قبیلہ بنو سُلیم ہے۔ وہ قبیلہ مسلمانوں کے لیے بہت مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ بہر حال کسی ایک کے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ کا ہدف مکہ ہے۔

مسلمان جب مدینہ میں جنگ کی تیاری کر رہے تھے، محمد ﷺ نے اپنے تمام اتحادی قبائل کو پیغام بھجوایا کہ جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ جس وقت مسلمانوں کا لشکر مدینہ سے نکلا تو اتحادی قبائل جن کو مطلع کیا گیا تھا، راستہ میں اس سے ملحق ہوتے گئے۔

مسلمان مؤرخوں نے محمد ﷺ کے ورودِ مکہ کی تاریخ ۱۰ رمضان ۸ ہجری مرقوم کی ہے لیکن مدینہ سے روانگی کی تاریخ کا تعین نہیں کیا، تاہم یہ طے شدہ ہے کہ اسلامی لشکر کے مدینہ سے روانہ ہونے کے بعد ماہِ رمضان شروع ہوا تھا۔ عین ممکن ہے لشکر ماہ رمضان کی یکم کو ہی مدینہ سے چلا ہو۔

ماہِ رمضان کے دوران تمام مسلمان روزہ سے ہوتے تھے اور فجر تا شام کوئی چیز نہ کھاتے اور نہ پیتے تھے حتیٰ کہ یہ لشکر قدید کے مقام پر پہنچا۔ اس مقام پر پیغمبرِ اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا: اگلے دن روزہ نہ رکھیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مسافرت میں روزہ قضا کر لیا کرو۔

اس دن کے بعد مسلمانوں نے روزہ نہیں رکھا حتیٰ کہ وہ مُرالظہر ان پہنچ گئے۔ یہ مقام مکہ سے ایک منزل پر ہے۔ رات کو محمد ﷺ نے فرمایا: تمام مسلمان سپاہ آگ جلائے تا کہ مکہ والوں کو معلوم ہو کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا لشکر آ پہنچا ہے۔ عباس جو کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچا اور تاجر تھے، انھوں نے سوچا اس لشکر کا مقابلہ اہلِ مکہ کے بس کی بات نہیں، لہٰذا مکہ کو ترک کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی تمام جائیداد کو پیش بندی کے طور پر فروخت کر دیا۔ عباس جائیداد فروخت کرنے کے بعد محمد ﷺ کے پاس مُرالظہر ان پہنچے اور مسلمان ہو گئے۔

ابوسفیان نے بھی پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچا عباس کی طرح صورتِ حال کا جائزہ لیا اور خود سکت نہ پاتے ہوئے مُرالظہر ان کی راہ لی۔ عباس، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچا کہتے ہیں: اس رات میں اسلامی لشکرگاہ کی حدود کے باہر سے گزر رہا تھا کہ میں نے دو افراد کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔

ایک کہہ رہا تھا: یہ آگ جو تم دیکھ رہے ہو قبیلہ بنوخزاعہ نے جلائی ہے؟

دوسرا کہہ رہا تھا: قبیلہ بنوخزاعہ اس قدر بڑا نہیں کہ اس قدر آگ جلا سکے۔

میں نے دوسرے آدمی کی آواز پہچان لی، وہ ابوسفیان تھا۔

میں نے آواز دی: یا اباحنظلہ! (ابوحنظلہ ابوسفیان کی کنیت تھی) کیا تم ہو؟

ابوسفیان نے میری آواز پہچان لی اور کہا: یا ابا الفضل! یہ تم ہی ہو؟ (ابوالفضل عباسؓ کی کنیت تھی)۔ میں نے کہا میں ہی ہوں اور پھر اس کی طرف بڑھا۔ ابوسفیان نے مجھ سے پوچھا: یا ابا الفضل! کیا خبر ہے؟

میں نے کہا: محمد ﷺ دس ہزار سپاہ کے ساتھ آ گیا ہے کہ مکہ پر قبضہ کرے، اس لیے کہ قریش نے صلح حدیبیہ کو پامال کیا ہے۔ قبیلہ بنوخزاعہ مسلمانوں کا اتحادی تھا، قریش اس پر حملہ آور ہوئے اور کچھ افراد کو قتل کیا۔ ان کے اموال کو تاراج کیا۔ جب مسلمان مکہ پر حملہ کر کے اسے تسخیر کریں گے تو سب سے پہلے تمھیں قتل کریں گے اس لیے کہ تم مکہ کی فوج کے سپہ سالار تھے اور اب بھی ہو اور تم ہی صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کے ذمہ دار ہو۔

ابوسفیان نے پوچھا: پھر میں کیا کروں؟

میں نے اس سے کہا: اگر زندہ رہنا چاہتے ہو اور اپنے اموال کو لٹنے سے بچانا چاہتے ہو تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ محمد ﷺ کے پاس جا کر مسلمان ہو جاؤ۔ فقط یہی ایک راستہ ہے جس سے تم اور تمھاری جائیداد بچ سکتی ہے۔

میں نے مزید کہا: اگر تم چاہو تو میں تمھیں محمد ﷺ کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ تم یہیں

ٹھیرو، میں جا کر آپ ﷺ کا ذاتی اونٹ لے آؤں اور تمھیں اس پر بٹھا کر لشکرِ اسلامی کے درمیان میں سے گزار لے جاؤں (بعض مؤرخین نے اونٹ کی بجائے خچر لکھا ہے)۔

ابوسفیان نے کہا: مجھے محمد ﷺ کے اونٹ پر کس لیے سوار کرنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا: اس لیے کہ تمام مسلمان تمھیں پہچانتے ہیں اور تمھارے دشمن ہیں۔ جب اور جہاں بھی تمھیں دیکھیں گے قتل کر دیں گے، لیکن جب تمھارے نیچے محمد ﷺ کی ذاتی سواری ہوگی تو تم سے پرسش نہیں کریں گے اور کوئی تمھیں قتل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکے گا۔ یوں اس پروگرام پر عمل کر کے ابوسفیان، پیغمبر ﷺ کی اونٹنی پر سوار ہو کر لشکرگاہ سے گزرا اور محمد ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔

عباسؓ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچا کہتے ہیں: جیسے ہی ہم محمد ﷺ کے خیمے میں داخل ہوئے، فوری بعد عمرؓ بن الخطاب بھی واردِ خیمہ ہوئے اور پیغمبر ﷺ سے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ اجازت دیں کہ میں ابوسفیان کی گردن مار دوں۔

میں نے عمرؓ بن الخطاب سے مخاطب ہو کر کہا: یہ شخص ابوسفیان، عبدمناف کی اولاد سے ہے، اسی لیے تم اس کی گردن مارنا چاہتے ہو۔ اگر یہی آدمی بنی عدی سے ہوتا تو کیا پھر بھی تم ایسا کرتے؟

عمرؓ نے کہا: اگر میرے قبیلے کے آدمی بھی رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھیں گے تو میں ان کی گردن مارنے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔ میں تو اس کا دوست ہوں جو رسول اللہ ﷺ کا دوست ہے اور اس کا دشمن ہوں جو پیغمبرِ اسلام ﷺ سے دشمنی رکھتا ہے۔

عباسؓ آگے کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اسے رات اپنے خیمے میں رکھو اور صبح میرے پاس لاؤ۔

میں نے اطاعت کی۔ ابوسفیان نے رات میرے خیمے میں گزاری۔ دوسرے دن صبح میں ابوسفیان کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

محمد ﷺ نے ابوسفیان سے کہا: یا اباحنظلہ! تو عہد شکن آدمی ہے اور شریعت کے مطابق

تمھیں قتل کیا جانا چاہیے۔ اگر تم نے دینِ اسلام کو قبول نہ کیا تو قتل کر دیے جاؤ گے۔[۲]

ابوسفیانؓ نے دینِ اسلام کو قبول کر لیا۔ اس وقت محمد ﷺ نے چند اور مسلمان افراد کی موجودگی میں مکّہ کو تسخیر کرنے کے متعلق ابوسفیانؓ سے مشورہ کیا، اس لیے کہ وہ اہلِ مکّہ میں رسوخ واحترام کا حامل تھا۔ دو احکامات محمد ﷺ کی طرف سے صادر ہوئے:

اوّل: لشکرِ اسلام مسلح ہو کر ابوسفیانؓ کے سامنے سے گزرے گا۔

دوم: مکّہ میں جو کوئی بھی ابوسفیانؓ کے گھر پناہ لے گا امان میں ہوگا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اس روز خود ابوسفیانؓ کو مامور فرمایا کہ (لشکر کی سلامی کے بعد) وہ مکّہ جا کر حسبِ ذیل اعلان کروا دے:

اہلِ مکّہ نے چونکہ معاہدہ حدیبیہ کو توڑا ہے، وہ شریعت کے مطابق مستوجب قتل ہیں اور ان کا مال مسلمانوں پر حلال ہے لیکن ہر وہ شخص جو خانہ کعبہ میں پناہ لے گا، قتل نہیں کیا جائے گا اور کوئی اس کی جائیداد پر تصرف نہیں کرے گا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، اس کی جان و مال کو امان ہوگی۔ اور اسی طرح ہر وہ شخص جو اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے گا اسلام کی پناہ میں ہوگا، اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔

ابوسفیانؓ سوار ہو کر مکّہ چلے گئے۔

اس کے مکّہ چلے جانے کے بعد اسلامی لشکر نے آگے بڑھ کر مکّہ کے اطراف پر بغیر خون ریزی کے قبضہ کر لیا۔

ابوسفیانؓ نے مکّہ پہنچنے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کیا: لشکرِ اسلام مکّہ

۲- مورخ ابن ہشام کے مطابق نبی ﷺ نے ابوسفیان سے کہا: کیا وقت نہیں آیا کہ تو جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں...... اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ابوسفیان نے جواب دیا: آپ سے زیادہ حلیم، آپ سے زیادہ کریم اور آپ سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا کوئی نہیں۔ اس پر عباسؓ بولے: تیرا برا ہو، اس سے پہلے کہ تیری گردن مار دی جائے، اسلام قبول کر اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لے۔ تب اس نے کلمہ پڑھا اور اسلام قبول کر لیا۔ [سیرت ابن ہشام (عربی) جلد۴ ص۵۱]

میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور ہم میں اتنی سکت نہیں کہ اس کی راہ روک سکیں۔ محمد ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص خانہ کعبہ یا میرے (ابوسفیانؓ) گھر میں پناہ لے گا، اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور جو اشخاص ان دونوں جگہوں پر پناہ نہیں لے سکتے وہ اپنے اپنے گھروں میں بند رہیں، باہر نہ نکلیں اور مطمئن رہیں کہ ان کی جان و مال امان میں ہوگی۔

ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسلامی لشکر کے منادی کرنے والے پہنچ گئے اور ابوسفیانؓ کے اعلان کی تکرار کی۔ لوگ جو گلی کوچوں میں تھے جلدی جلدی خانہ کعبہ یا ابوسفیانؓ کے گھر پناہ لینے دوڑے اور جو اپنے گھروں کو پہنچ سکے انھوں نے گھروں میں داخل ہو کر کواڑ بند کر لیے۔ جلد ہی مکّہ کے گلی کوچے خالی ہو گئے۔

اسلامی لشکر کا پہلا دستہ جو مکّہ میں داخل ہوا، علیؓ ابنِ ابی طالب کی کمان میں تھا۔ علیؓ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے پرچم کو اُٹھائے ہوئے تھے۔ علیؓ مکّہ میں داخل ہونے کے بعد اپنے دستہ کے ساتھ خانہ کعبہ کی طرف بڑھ گئے۔

مکّہ کا سب سے بڑا دروازہ وہی تھا جس سے علیؓ مکّہ میں داخل ہوئے۔

دوسرا دستہ زبیرؓ بن عوام کی قیادت میں مغرب کی طرف سے مکّہ میں وارد ہوا۔

سعدؓ بن عبادہ انصاری کی قیادت میں اسلامی لشکر کا تیسرا دستہ مشرق سے مکّہ میں داخل ہوا۔

لشکرِ اسلام کا چوتھا دستہ خالدؓ بن ولید کی کمان میں تھا اور خالدؓ کو جنوب کی طرف سے مکّہ میں داخل ہونا تھا۔

محمد ﷺ نے ان چاروں سرداروں سے فرمایا: جب تم مکّہ میں داخل ہو گے تو اپنی تلواروں کو نیاموں سے باہر مت نکالنا۔ کسی سے جنگ نہ کرنا، الا یہ کہ تم پر کوئی حملہ آور ہو۔ اور یہ مت بھولنا کہ لوگ جو خانہ کعبہ، ابوسفیان کے گھر یا اپنے گھروں میں ہوں وہ امان میں ہیں۔

لیکن سعدؓ بن عبادہ انصاری جونہی مکّہ میں داخل ہوئے تو پکارے: "الیوم یوم الملحمه الیوم تستحل الحرمه" یعنی "آج کا دن جنگ کا دن ہے اور آج کے دن کے لیے حرمت اُٹھ گئی ہے"۔ یہ خبر محمد ﷺ کو ملی۔ بلا تاخیر سعدؓ بن عبادہ انصاری کو شہر میں مشرقی سمت سے داخل ہونے والے دستہ کی سربراہی سے معزول کر دیا اور اس دستے کو بھی علیؓ بن ابی

طالب کی کمان میں دے دیا، تا کہ سعدؓ بن عبادہ انصاری اپنے جنگی عزائم کو پورا نہ کر سکے۔

کسی بھی دستہ کو مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔ البتہ خالدؓ کے دستہ پر جو جنوبی سمت سے مکّہ میں داخل ہوا، جنوبی محلہ کے کچھ افراد، قریش اور ان کے اتحادی قبیلہ احابیش کے کچھ افراد نے مل کر حملہ کر دیا۔ خالدؓ سیف اللہ نے اونچی آواز میں پکارا: اپنا خون فضول مت بہاؤ، اس لیے کہ تمھارا حملہ مکّہ کے سقوط کو نہیں روک سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے آج مکّہ کو تسخیر کرنے کا ارادہ کیا ہے اس لیے آج مکّہ حتمی طور پر مسخر ہوگا۔

لیکن خالدؓ کی پکار کا ان افراد نے کوئی اثر نہ لیا اور حملہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پندرہ افراد قتل ہو گئے جن میں دو مسلمان اور تیرہ مشرکین میں سے تھے۔ وہ جو باقی بچے انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں سے جدال ممکن نہیں، لہٰذا بھاگ گئے۔

اسلامی لشکر کے چاروں کالم مکّہ میں چاروں اطراف سے داخل ہو کر خانہ کعبہ کے سامنے باہم مل گئے۔ جب لشکرِ اسلام کے چاروں کالم خانہ کعبہ کے سامنے جمع ہو گئے تو محمد ﷺ جو سفید اونٹنی پر سوار تھے وہاں پہنچے اور کعبہ کا سات بار طواف کیا۔ طواف کے بعد آپ ﷺ خانہ کعبہ کے دروازہ کی طرف گئے اور خانہ کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے فرمایا: خانہ کعبہ کا دروازہ کھولو۔

عثمان بن طلحہ کی والدہ نے کہا: ہم تمھارے لیے کعبہ کا دروازہ نہیں کھولیں گے۔ لیکن عثمان بن طلحہ نے والدہ کو سمجھایا اور کعبہ کا دروازہ کھول دیا۔ اس دن پانچ تن مسلمان خانہ خدا میں داخل ہوئے:

(۱) محمد ﷺ بن عبداللہ	پیغمبرِ اسلام ﷺ
(۲) علیؓ بن ابی طالب	پیغمبرِ اسلام ﷺ کے داماد
(۳) عثمانؓ	ایک معروف مسلمان
(۴) بلالؓ	مؤذن
(۵) عثمانؓ بن طلحہ	کلید بردار کعبہ

جس وقت محمد ﷺ ان چار افراد کے ہمراہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو جن لوگوں نے

وہاں پناہ لی ہوئی تھی وہ بہت خوفزدہ ہوئے اور خیال کیا کہ محمد ﷺ ان کو قتل کرنے، ان کے اموال پر قبضہ کرنے اور ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنانے آئے ہیں۔ واضح رہے کہ اہلِ مکہ اس وقت تک کافر تھے اور مسلمانوں سے معاہدہ حدیبیہ کرنے کے بعد انھوں نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی۔ نتیجتاً کافر حربی قرار پائے یعنی وہ کافر جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی۔

محمد ﷺ نے مکہ کو جنگ کر کے فتح کیا، اس لیے کہ تسخیر مکہ کے لیے لشکر سے چڑھائی کی اور پھر مکہ میں کچھ لوگوں نے خالدؓ بن ولید کے دستہ کی مزاحمت بھی کی تھی اور مسلمانوں کے دو افراد بھی شہید ہو گئے تھے۔ لہٰذا قانون کے مطابق محمد ﷺ کو حق پہنچتا تھا کہ تمام اہلِ مکہ کو قتل کر دیں یا غلام بنالیں اور عورتوں کو کنیزیں بنالیں۔ لیکن پیغمبرِ اسلام ﷺ نے سب کو معافی دے دی۔ خانہ کعبہ کی زیارت کے بعد پیغمبر ﷺ اسلام خانہ کعبہ سے باہر آئے اور اہلِ مکہ سے، جو حرم کعبہ میں موجود تھے، خطاب فرمایا:

تم جنگی قوانین سے پوری طرح آگاہ ہو اور تمھیں یہ بھی علم ہے کہ تم نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اب جب کہ تم مغلوب ہو چکے ہو، مسلمانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ تمھیں قتل کر دیں یا غلام بنالیں اور تمھاری عورتوں کو بھی کنیزیں بنالیں۔ لیکن میں جس طرح یوسفؑ نے اقتدار میں آنے کے بعد اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج میں بھی تم سے کہتا ہوں کہ خداوند تمھیں معاف فرمائے۔ تم آزاد ہو اور کوئی تمھاری جان سے تعرض نہیں کرے گا، نہ کوئی تمھاری عورتوں کو کنیزیں بنائے گا۔

اسی بنا پر اہلِ مکہ کو عربی میں طلقاء کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں یعنی آزاد کیے گئے غلام۔ قانون کے مطابق اہلِ مکہ مسلمانوں کے بردے تھے اور محمد ﷺ نے انھیں غلامی سے آزاد کیا، لہٰذا وہ طلقاء شمار ہوئے۔

اعلان کے بعد محمد ﷺ نے اہلِ مکہ کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ [الحجرات ۴۹: ۱۳] اس آیت کی شرح پہلے ابواب میں بیان کی جا چکی ہے۔ محمد ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا:

خداوند نے تمام افراد بشر کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ افراد کے درمیان کسی قسم کی برتری وجود نہیں رکھتی۔ مگر یہ کہ کوئی پرہیزگار (متقی) ہو۔ تمام افراد بشر خداوند کے نزدیک برابر ہیں، لہٰذا زمانہ جاہلیت کا افتخار حسب ونسب، اور امتیازِ قبائل سب ختم کیے جاتے ہیں۔ حسب ونسب کی برتری کوئی برتری نہیں۔ ایک منصب ہے وہ سقایہ کا منصب ہے۔ میرے چچا عباس نے آج تک یہ منصب بڑی خوبی سے نبھایا اور یہ امر بھی تحقیق شدہ ہے کہ انھوں نے پانی کی تقسیم میں کبھی کسی خصوصی نظریہ کو جگہ نہیں دی اور ہمیشہ لوگوں میں پانی منصفانہ طور پر تقسیم کیا ہے۔

بعدازاں جب اہلِ مکہ نے اسلام قبول کر لیا (جیسا کہ آگے ذکر آئے گا)، عثمانؓ بن طلحہ خانہ کعبہ کی کلید برداری کے منصب پر ہی رہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اس منصب پر فائز ہوئے۔ آج بھی خانہ کعبہ کا کلید بردار عثمانؓ بن طلحہ کی اولاد میں سے ہے۔

محمد ﷺ جب اس اعلان سے فارغ ہوئے تو خانہ کعبہ کے ایک بت کو اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا کر توڑا اور پھر علیؓ بن ابی طالب سے فرمایا: تمام بتوں کو توڑ دو اور ہر نوع کی صورت جو خانہ کعبہ میں موجود ہے، تباہ و معدوم کر دو۔

روایت کے مطابق ہر نوع کی تصویروں اور بتوں کو تباہ و معدوم کر دیا گیا۔[۹]

جس وقت مسلمان پتھر کے بتوں کو گرا کر توڑتے اور لکڑی کے بتوں کو کلہاڑوں سے پھاڑتے تھے، مکہ کے وہاں موجود بت پرستوں نے اپنے چہروں کو چادروں سے ڈھانپ لیا، اس لیے کہ ان میں تابِ نظارہ نہ تھی۔ بعض مشرکین سوچ رہے تھے یہ جہان اب ویران ہو جائے گا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ تمام بتوں کو یکے بعد دیگرے توڑ دیا گیا اور کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔

تمام بتوں کو توڑنے کے بعد محمد ﷺ نے عام معافی کا اعلان فرمایا۔

اہلِ مکہ جو خانہ کعبہ میں موجود تھے ان سے کہا گیا کہ وہ آزاد ہیں۔ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں کسی کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔ ابوسفیان کے گھر میں جمع افراد کو بھی اجازت دے دی گئی کہ وہ آزاد ہیں۔ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی مشغولیت شروع کر سکتے ہیں۔

سب لوگ چلے گئے مگر آپ ﷺ حرم کعبہ ہی میں رُکے رہے کیوں کہ آپ ﷺ کا کوئی مکان نہیں تھا جہاں جا کر سکونت پذیر ہوتے۔ گزشتہ دنوں محمد ﷺ کے پاس خدیجہؓ والا بہت خوبصورت دومنزلہ مکان تھا۔ یہ مکان مکّہ کے خوبصورت مکانوں میں سے ایک تھا۔

خدیجہؓ کی وفات کے بعد وہ مکان علیؓ کے بھائی عقیلؓ کو ملا اور انھوں نے کسی اور کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ چند مسلمانوں نے محمد ﷺ سے عرض کی: آپ ﷺ نے مکّہ فتح کیا ہے لہٰذا آپ ﷺ کو حق حاصل ہے جس مکان کو چاہیں اپنے تصرف میں لے آئیں۔

لیکن محمد ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ مکّہ کی جان و مال امان میں ہیں اور میں کسی مکان کو اپنے تصرف میں نہیں لے سکتا۔ چونکہ آپ ﷺ رات خانہ کعبہ میں نہیں رہ سکتے تھے اس لیے خانہ کعبہ سے نکل کر خیف کے مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔

تسخیر مکّہ سے پہلے وہاں کا حاکم عتاب بن اسید تھا۔

۱۵ رمضان بوقتِ ظہر بلالؓ اذان دینے کے لیے باہر نکلے اور کسی اونچی جگہ کی تلاش میں خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے تا کہ اذان کی آواز دور دور تک سنی جا سکے۔

جب اذان کی آواز خانہ کعبہ کی چھت سے بلند ہوئی تو حاکمِ مکّہ عتاب بن اسید فوری طور پر خانہ کعبہ پہنچا اور بلالؓ سے کہا: "اس جگہ سے نیچے اترو"۔

لیکن بلالؓ نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اذان جاری رکھی۔ عتاب بن اسید نازیبا کلمات بکتا رہا۔ بلالؓ نے اذان ختم کرنے کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عتاب بن اسید کی شکایت کی۔

عتاب بن اسید ایک مشرک تھا۔ اس کا ایک مسلمان کے ساتھ بدکلامی کرنا جب کہ وہ اذان دے رہا تھا، ایک بہت بڑا جرم تھا۔ لیکن محمد ﷺ نے اسے کچھ نہ کہا اور نہ کوئی سزا دی۔ عتابؓ بن اسید چند روز بعد خود ہی محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اس کا منصب بحال رکھا اور مسلمانوں کی طرف سے مکّہ کا حاکم مقرر ہوا۔

فتح مکّہ کے بعد محمد ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کو عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف فرما دیا۔ ان بڑے دشمنوں میں ایک عکرمہ بن ابوجہل تھا جو جان کے خوف سے مکّہ چھوڑ

کر مفرور ہو گیا تھا۔ عکرمہ کی بیوی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے شوہر کے لیے امان مانگی۔ محمد ﷺ نے عکرمہ کو امان بخشی اور وہ واپس اپنے گھر آ گیا۔

دوسری ہند زوجہ ابوسفیانؓ تھی۔ روایت ہے کہ اس عورت نے حمزہؓ کا جگر چبایا تھا۔ اسی مناسبت سے اسے ہند جگر خور کہا جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سنگ دل عورت کو بھی معافی دے دی اور تا حیات اسے کسی مسلمان نے آزار نہیں پہنچایا۔

تیسرا صفوان بن امیہ تھا جو ایک وقت میں پیغمبر ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس کام کے لیے قاتل معاوضہ پر حاصل کیا تھا۔ اسے بھی معافی دے دی گئی۔ مگر اس نے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے کہا: میں اسلام قبول نہیں کروں گا۔ معافی کے پانچ دن بعد صفوان بن امیہ نے اسلامی لشکر کو ایک سو زرہیں اور پانچ ہزار درہم نقد پیش کیے اور پھر چند ماہ بعد جنگِ حنین کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گیا۔

جب مکّہ فتح ہوا، چار لاکھ بیس ہزار مثقال سونا خانہ کعبہ کے خزانہ میں موجود تھا۔ محمد ﷺ نے حکم دیا کہ یہ تمام سونا حسبِ سابق خانہ کعبہ کے تصرف میں رہے گا اور کوئی شخص اس کو ہاتھ نہ لگائے۔

فتح مکّہ کے پہلے دس دنوں میں دو ہزار افراد نے اسلام قبول کیا۔ اس کے لیے طریقہ یہ اپنایا گیا کہ کفار یکے بعد دیگرے عمرؓ بن الخطاب کے سامنے سے گزرتے، شہادتین کو زبان پر لاتے اور عمرؓ انھیں نصیحت فرماتے: زنا سے پرہیز کرو اور نیک بننے کی کوشش کرو۔

اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ محمد ﷺ جب مدینہ سے فتح مکّہ کے لیے عازمِ سفر ہوئے تو وہ جانتے تھے کہ حتمی طور پر مکّہ فتح کر لیا جائے گا۔ اس پر دلیل سورۃ النصر کا مدینہ میں نزول ہے کہ آج وہ قرآن کی ایک سو دسویں سورۃ قرآن ہے۔ اس سورۃ کی دوسری آیت میں اگر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو پہلی آیت شمار کیا جائے، خداوند نے فرمایا ہے:

﴿إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ (جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی)

اس آیت میں خداوند نے اپنے پیغمبر ﷺ کو بشارت دی کہ تم مکّہ کو فتح کرو گے۔

اور تیسری آیت میں خداوند نے فرمایا:

﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ یعنی "اور تم دیکھو گے کہ لوگ

دستہ دستہ، فوج فوج دینِ خدا میں شامل ہوں گے"۔

منظور اس سے یہ ہے کہ فتح مکّہ کے بعد لوگ اجتماعی صورت میں دینِ اسلام میں شامل ہوں گے اور ایسے ہی ہوا۔

چوتھی آیت میں خداوند نے فرمایا:

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾ "اس بڑی فتح کی مناسبت سے خداوند کے حضور حمد وثنا کرو اور استغفار کرو۔ بے شک خداوند توبہ و استغفار کرنے والوں کی پذیرائی کرتا ہے"۔

مکّہ کے امیر لوگ فتح مکّہ کے دن تک شراب پیتے تھے، سور کا گوشت کھاتے تھے، مسلمان ہونے کے بعد ان پر یہ دونوں چیزیں حرام ہوگئیں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے پندرہ روز مکّہ میں قیام فرمایا۔ اور ان دو ہفتوں میں تقریباً پورا مکّہ مسلمان ہوگیا۔ مدینہ کے لوگ پیغمبر ﷺ کے قیام مکّہ کی طوالت سے پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ چونکہ آپ ﷺ کی جائے پیدائش مکّہ ہے، آپ ﷺ اس شہر سے اب مدینہ واپس نہیں جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں یقین دلایا کہ جب تک میں زندہ ہوں تمھارے ساتھ رہوں گا۔ میں اسی جگہ مروں گا جہاں تم مرو گے۔ پندرہ روزہ قیام کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ حنین روانہ ہوئے تو اہلِ مدینہ کے دل کا خوف دور ہوا اور وہ مطمئن ہوگئے۔



غزوۂ حنین (شوال ۸ھ)

ایران
عراق
مصر
مکہ
طائف
سوڈان
بحیرہ عرب
حبشہ

طائف کا راستہ
جعرانہ
وادیِ حنین
الشرائع
جیش ہوازن
مال غنیمت کی منتقلی
اسلامی لشکر کی پیش قدمی
جبل سعد
مکہ مکرمہ
عرفات

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ

"یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی ہے، اور حنین کے دن بھی جبکہ تمہاری کثرت نے تمہیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا، تو وہ (کثرت) تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر تسکین نازل کی اور اس نے اپنے لشکر بھیجے جو تم نے نہیں دیکھے اور جن لوگوں نے کفر کیا، اللہ نے انھیں عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے۔"

(سورۃ توبہ : ۲۵۔۲۶)

درۂ حنین میں

مکّہ کے فتح ہونے اور تمام اہلِ مکّہ کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کی کامیابی جزیرہ نمائے عرب میں قطعی ہو گئی۔ مکّہ ایک سیاسی، مذہبی اور تجارتی مرکز تھا جو ان کے زیرِ تصرف آ گیا۔

مکّہ کے جنوب میں بنو ہوازن سکونت پذیر تھے جو متعدد قبائل پر مشتمل تھے اور یہ قبائل مکّہ کے جنوب سے لے کر یمن کی حدود تک پھیلے ہوئے تھے۔ قبائل ہوازن اور اہلِ مکّہ کے درمیان بھی کئی مرتبہ جنگیں ہوئیں اور چند مرتبہ تو ہوازن نے ماہ ہائے حرام میں مکّہ والوں سے جنگ کی۔ عرب اس نوع کی حرام جنگ کو جنگِ فجار کا نام دیتے ہیں۔

بنو ہوازن اور اہلِ مکّہ ایک دوسرے کے جدی پشتی دشمن تھے۔ بی بی خدیجہؓ کے والد ماجد ہوازن اور مکّہ کی ایک جنگ میں قتل ہوئے تھے۔ خود محمد ﷺ نے بھی لڑکپن میں چچا ابو طالب کے ہمراہ ہوازن کے خلاف ایک جنگ میں شرکت فرمائی تھی۔

ہوازن کا ایک حصہ بحیرہ احمر اور صحرائے عرب کے درمیانی علاقہ حجاز میں آباد تھا۔ ہوازن کا ایک اور حصہ قبیلہ ثقیف شہر طائف میں آباد تھا اور شہر نشین شمار ہوتا تھا۔ پیغمبر ﷺ کی ایک دایہ جس نے محمد ﷺ کو دودھ پلایا تھا، قبیلہ بنو سعد سے تھی اور یہ قبیلہ جزو ہوازن شمار ہوتا تھا۔ قبیلہ بنو سعد، قبیلہ بنو بکر، قبیلہ بنو سُلیم اور ہوازن کے دوسرے قبائل اسلام اور محمد ﷺ کے دشمن تھے۔ لات کا مجسمہ شہر طائف میں تھا۔ طائف وہی شہر ہے جہاں محمد ﷺ مکّہ سے طرد ہونے کے بعد گئے تھے اور اس شہر کے لوگ آپ ﷺ کو قتل کرنے کے درپے ہوئے تھے۔

فتح مکّہ کے تین دن بعد محمد ﷺ نے کچھ مسلمانوں کو مامور کیا کہ مکّہ کے اطراف جو بت ہیں ان کو جا کر توڑ دیں۔ خالدؓ بن ولید کو حکم ہوا کہ نخلہ جا کر وہاں کے بتوں کو توڑ دیں۔ عزّیٰ کا بہت بڑا مجسمہ اسی مقام پر نصب تھا۔[1]

۱۔ عزّیٰ دیوی کو وہ لوگ عزیز یعنی اللہ کی بیوی خیال کرتے تھے۔ (لسان العرب)

جب ہوازن نے دیکھا کہ مسلمان ان کے بتوں کو توڑنے کے درپے ہیں تو انھوں نے مسلمانوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اور اپنے قبائل کو فوری طور پر جنگ کی تیاری کے لیے کہا۔ جلد ہی بیس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر مسلمانوں سے جنگ کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ لشکر کے ساتھ عورتوں، بچوں اور چارپایوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ ہوازن عورتوں اور بچوں کو جنگ میں اس لیے لے آئے کہ وہ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میدانِ جنگ میں ہر چیز داؤ پر لگا کر پامردی سے لڑیں، مکّہ کو زیرِ تصرف لے آئیں اور ہمیشہ کے لیے مکّہ والوں کی مزاحمت ختم کر دیں تاکہ اُن کی طرف سے آئندہ کسی حملے کا خطرہ نہ رہے۔

ماضی میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ ہوازن بیس ہزار افراد جنگجو اکٹھے کر سکے ہوں۔ جب قریش کو اطلاع ہوئی کہ ہوازن مکّہ پر حملہ کے لیے لشکر اکٹھا کر رہے ہیں تو ان کے دلوں سے مسلمانوں کے خلاف آخری کدورت بھی زائل ہو گئی اور وہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ ہوازن سے جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے حتیٰ کہ صفوان بن امیہ بھی تیار ہو گیا اور دوسری بار اس نے اسلحہ اور نقدی مسلمانوں کو دی تاکہ لشکر کو تقویت حاصل ہو۔

محمد ﷺ ہوازن سے مقابلے کے لیے بارہ ہزار کا لشکر لے کر آگے بڑھے۔ ان میں دو ہزار افراد قریش سے تھے جو اپنے جدی پشتی دشمن سے مقابلے کے لیے ساتھ آئے تھے۔ لشکرِ اسلام ۳۰ جنوری ۶۳۱ء کو وادیٔ حنین میں اترا۔ حنین کی وادی مکّہ اور طائف کے درمیان کوہستانی سلسلہ میں واقع ہے، جس میں کئی درّے ہیں۔ اسلامی لشکر کو ان درّوں سے گزرنا تھا۔ اسلامی لشکر طلوعِ آفتاب کے ساتھ ان درّوں میں داخل ہوا۔

لشکرِ اسلام کے ہراول دستے بغیر کسی خطرہ کے اس درّہ سے گزر گئے۔ ان کے کماندار نے بڑی غفلت یہ کی کہ دیدبانوں کو پہاڑ کے اوپر سے عبور کا حکم نہ دیا۔

اگر ہراول فوج کا کماندار کچھ افراد کو پہاڑوں کے اوپر نگہبانی کے لیے مقرر کر دیتا تو وہ یقیناً پہاڑوں کے پیچھے دشمن کو چھپا دیکھ لیتے۔ کہتے ہیں یہ غفلت اس لیے ہوئی کہ مسلمان جنگ حنین میں اپنی طاقت پر مغرور تھے اور عام تاثر تھا کہ ہوازن ہمیں شکست نہیں دے

سکتے۔ ہراول دستہ کو درّہ سے گزرتے ہوئے دشمن کے متعلق کوئی شک نہ گزرا اور نہ دشمن کے متعلق تحقیق کرنے کی کوشش کی گئی۔

ہوازن کی فوج کا سپہ سالار مالک بن عوف نصری تھا۔ اس نے جنگ میں ثابت کیا کہ وہ ایک لائق کماندار ہے۔ مالک بن عوف نصری نے اپنی سپاہ کو اس طرح پہاڑوں کے پیچھے چھپائے رکھا کہ اسلامی لشکر کے ہراول دستہ کو خبر ہی نہ ہوئی کہ دشمن گھات میں ہے۔

اسلامی لشکر کے ہراول دستے جب درّہ سے گزر رہے تھے، مالک بن عوف نصری نے انھیں گزرتے دیکھا مگر حملہ کا حکم نہ دیا۔ اپنے سپاہیوں سے کہا صبر کرو تاکہ محمد ﷺ کا اصلی لشکر درّہ میں داخل ہو جائے۔

محمد ﷺ اس دن لشکر کے عقب میں تھے اور سفید خچر پر سوار تھے۔ یہ خچر شاہِ حبشہ نے آپ ﷺ کے لیے بھجوایا تھا اور اس کا نام شہبا تھا۔ ابوسفیان بن حارث پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچازاد اور آپ ﷺ کے نقیب تھے۔ وہ اس خچر کے آگے آگے چل رہے تھے۔

مالک بن عوف نصری اس قدر ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک تھا کہ اسلامی لشکر کے اصلی حصہ کے درّہ میں داخل ہونے پر بھی حملہ کا حکم نہ دیا، تاوقتیکہ پورا لشکرِ اسلام درّہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مالک بن عوف نصری نے حملہ کا حکم دیا۔ ہوازن کے لشکر نے کمین گاہوں سے نکل کر اسلامی لشکر پر پتھروں اور تیروں کی بارش شروع کر دی۔

مسلمان راہ پیمائی کی حالت میں تھے۔ اس ناگہانی حملہ سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ فرار میں امان سمجھی۔ سوار دستوں نے واپسی کا قصد کیا کہ جس راستہ سے درّہ میں داخل ہوئے ہیں اسی راستہ سے نکل جائیں۔

سوار دستوں کے فرار سے مسلمان سپاہ متزلزل ہو گئی۔ سبھی بھاگنے لگے۔ خداوند نے اس واقعہ کے متعلق سورۃ توبہ کی آیت ۲۵ اور ۲۶ میں اس طرح فرمایا:

﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْــٴًـا وَّ ضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ﴾

"اللہ تم کو بہت سے میدانوں میں مدد دے چکا ہے اور حنین کے روز بھی۔ جب تم اپنی بہتات پر اترائے۔ پھر (یہ تمھارا اترانا) تمھارے کچھ کام نہ آیا اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی تو پھر ہٹے تم پیٹھ پھیر کر"۔

مؤرخین اسلام کا کہنا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے چھوٹی بڑی اسی جنگیں لڑیں۔ ان تمام جنگوں میں آیت کے مطابق خداوند کی مدد سے فتح یاب ہوتے رہے نہ کہ کثرتِ سپاہ کے سبب۔ لیکن جنگِ حنین میں مسلمان اپنی کثرتِ تعداد پر مغرور ہوئے اور خود کو حتمی فاتح سمجھ بیٹھے تھے اور غفلت برتی اس حقیقت سے کہ خداوند کی مدد سے مسلمان فتحیاب ہوتے ہیں نہ کہ کثرتِ تعداد کے باعث، لہٰذا باوجودیکہ مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی بری طرح بھاگے۔

اسی سورت کی چھبیسویں آیت میں خداوند نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ "پھر اللہ نے اپنے رسول اور ایمان لانے والوں کو تسکین دی اور (ان کی مدد کو) فوجیں اُتاریں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ماردی کافروں کو۔ یہی سزا ہے کافروں کی"۔

محمد ﷺ نے جب دیکھا کہ سپاہ بھاگ رہی ہے تو اپنے خچر سے نیچے اتر آئے۔ خچر کی لگام ابوسفیان بن حارث کو تھمائی اور ایک چوڑے پتھر پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو آواز دی:

کہاں جا رہے ہو؟ آیا مجھے نہیں دیکھ رہے ہو؟ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں...... میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں...... اے جماعتِ مہاجرین...... اے جماعت انصار۔ اے وہ لوگو جو حدیبیہ میں میرے ساتھ تھے، فرار نہ کرو اور ادھر آؤ۔

بعض وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ عباس، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چچا بلند آواز تھے، وہ اس کی تکرار کرتے جاتے تھے۔ محمد ﷺ کی استقامت، شہامت اور اللہ پر یقین رنگ لایا اور بھاگتی ہوئی سپاہ ٹھیر گئی اور آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہونے لگی۔ محمد ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمان مسلح ہو کر اور درّہ کا چکر کاٹ کر درّہ کے دوسری طرف وادیِ اوطاس میں پہنچیں۔

مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ ہوازن کا پڑاؤ اس وادیِ اوطاس میں تھا۔ مسلمانوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کر کے تمام عورتوں، بچوں اور چوپایوں اور اموال پر قبضہ کر لیا۔

ہوازن مسلمانوں کی راہ روکنا چاہتے تھے مگر اب مسلمان مسلح ہو کر پیش قدمی کر رہے تھے، اس لیے کچھ ہوازن قتل ہوئے اور بقیہ کو مجبوراً ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ محمد ﷺ نے ہوازن کے مال و اسباب، عورتوں، بچوں اور چارپایوں کو جعرانہ میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ یہ مقام مکہ کے شمال میں ۱۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا اور مزید فرمایا کہ ان کے لیے لباس اور غذا ساتھ لے جائیں۔ جنگ حنین کے مسلمانوں کے حق میں ختم ہونے کے بعد محمد ﷺ نے طائف پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

طائف میں دو قلعے تھے۔ اہلِ طائف نے جب اسلامی لشکر دیکھا تو شہر کے دروازے بند کر کے محصور ہو گئے۔ مسلمانوں نے طائف کا حصار توڑنے کے لیے منجنیق استعمال کی اور اس کے علاوہ سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے دبابے تیار کیے گئے۔ دبابے جو سلمانؓ فارسی کے مشورہ سے تیار ہوئے، وہ اس طرح بنائے گئے تھے کہ ان کی آڑ میں مسلمان سپاہ شہر کے دروازوں کے نزدیک پہنچ جاتی تھی اور محصورین کے تیر اور پتھر بے اثر ثابت ہوتے تھے۔

جنگِ حنین کی فتح کے بعد مسلمان بلند حوصلہ تھے۔ بڑی شہامت سے لڑ رہے تھے، حتیٰ کہ مالک بن عوف نصری کا گھر جو کہ طائف شہر کے جنوب میں تھا ویران کر دیا گیا، مگر طائف سرنگوں نہ ہوا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے طائف والوں کو وعدہ دیا۔ اگر وہ تسلیم ہو جائیں تو ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا لیکن اس یقین دہانی کے باوجود صرف اسی افراد تسلیم ہوئے جو بعدازاں مسلمان ہو گئے۔ طائف کا محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا مگر طائف سرنگوں نہ ہوا۔ لہٰذا محمد ﷺ لشکر کی کمان دوسروں کو سپرد کر کے خود جعرانہ تشریف لے گئے تا کہ مالِ غنیمت کو مسلمانوں میں تقسیم کریں۔

مالِ غنیمت کے علاوہ چھ ہزار جنگی اسیر بھی مسلمانوں میں تقسیم ہوئے۔ اسیروں میں سے ایک عورت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: میرا نام شیما ہے۔ میں آپ ﷺ

کی رضاعی بہن ہوں۔ جب حلیمہ آپ ﷺ کو دودھ پلایا کرتی تھی میں بھی دودھ پیا کرتی تھی۔ اس نے ایک زخم کا نشان جو کہ اس کے ہاتھ پر تھا دکھاتے ہوئے عرض کی: جب میں اور آپ ﷺ چھوٹے تھے اور اکٹھے کھیلا کرتے تھے آپ ﷺ نے سہواً مجھے مجروح کر دیا تھا۔ یہ نشان اسی زخم کا ہے، لہٰذا آپ ﷺ مجھے مسلمانوں کی کنیزی میں نہ دیں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: اے شیما! تم مائل ہو کہ مسلمان ہو کر آزاد زندگی بسر کرو؟

اس عورت نے کہا: نہیں، محمد ﷺ، میری آزادی یہی ہے کہ میں صحرا میں واپس چلی جاؤں اور صحرائی زندگی بسر کروں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں آزاد نہیں کر سکتا۔ مگر ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ غنائم کی تقسیم کے وقت تو میرے حصے میں آ جائے۔ اس صورت میں تو میری کنیز ہوگی، میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔

اسی طریقہ پر عمل کیا گیا۔ شیما، محمد ﷺ کے حصے میں شامل ہوئی اور آزاد کر دی گئی۔ اپنی آزادی کے بعد شیما نے درخواست کہ کہ میرا شوہر بھی اسیر ہے۔ قانون کے مطابق اسے بھی غلام بنا لیا جائے گا۔ اسے بھی آزاد کیا جائے۔

محمد ﷺ نے ایک بار پھر درخواست کی کہ اسے میرے حصے میں شامل کیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا اور پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اسے بھی آزاد کر دیا۔

جب ہوازن قیدیوں نے دیکھا کہ شیما اور اس کا شوہر آزاد ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنا نمائندہ محمد ﷺ کی خدمت میں بھجوایا کہ ہم حلیمہ کے قبیلہ سے ہیں۔ اس نسبت سے آپ ﷺ کے رضاعی بہن بھائی ہیں، پس ہمیں بھی فدیہ کی ادائگی کے بغیر آزاد کیا جائے، تاکہ ہم اپنے قبیلہ میں واپس جا سکیں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: اب میں ایسا نہیں کر سکتا، اس لیے کہ تم اب مسلمانوں میں تقسیم ہو چکے ہو۔

ہوازن کے نمائندہ نے کہا: آپ ﷺ کس طرح برداشت کریں گے کہ آپ ﷺ کے رضاعی بہن بھائی غلام و کنیز بنیں۔

محمد ﷺ نے فرمایا: میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ غلام اور کنیزیں جو میرے حصے میں آئے ہیں انھیں آزاد کر دوں۔ اس کے علاوہ میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔ دوسرے تمام غلام اور کنیزیں دوسروں کی ملکیت ہیں۔ انھیں آزاد کرنے یا نہ کرنے کا اختیار فقط انھی کو ہے۔ محمد ﷺ نے اپنے تمام غلاموں اور کنیزوں کو جو آپ ﷺ کے حصہ میں آئے تھے آزاد کر دیا۔

آپ ﷺ کی تقلید میں علیؓ ابنِ ابی طالب نے بھی اپنے حصہ کے غلام اور کنیزیں آزاد کر دیں۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ نے بھی تقلید کی اور اپنے اپنے حصہ کو آزاد کر دیا۔ باقی تمام مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ بزرگانِ اسلام نے اپنے اپنے حصہ کے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر دیا ہے تو انھوں نے بھی اپنے حصہ کے غلام اور کنیزیں آزاد کر دیں مگر مالِ غنیمت واپس نہ کیا۔

آزاد ہونے والوں میں مالک بن عوف بھی تھا۔ اس کو اس کا مال بھی واپس مل گیا۔ اس کا مال محمد ﷺ کے حصے میں آیا تھا۔ وہ آپ ﷺ نے واپس کر دیا۔ مالک بن عوف ہوازن کا سپہ سالار اسی جگہ مسلمان ہو گیا۔

اس طرح مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ نپٹ گیا اور محمد ﷺ واپس طائف تشریف لے گئے۔ محاصرہ کی وضع میں کچھ تغیر نہیں آیا تھا۔ اسلامی لشکر کے وہ لوگ جو طائف میں مصروفِ جنگ تھے، طائف کو سرنگوں نہ کر سکے۔ لیکن ہوازن قبائل کے اسلام قبول کر لینے کے بعد طائف مسلمانوں کے نزدیک ایک خطرناک شہر نہیں رہا تھا، بلکہ ایک جزیرہ کی شکل اختیار کر گیا تھا جس کے چاروں طرف اسلام نے احاطہ کر لیا تھا۔

محمد ﷺ نے دیکھا کہ طائف کے محاصرہ کے لیے اگر ایک چھوٹا سا لشکر چھوڑ دیا جائے تو یہ شہر بغیر جنگ کیے بھوک اور پیاس کی وجہ سے سرنگوں ہو جائے گا۔ لہٰذا ابوسفیان کو ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ محاصرہ جاری رکھنے کی ہدایت فرما کر نبی ﷺ مسلمانوں کے ساتھ مکہ تشریف لے آئے۔

وفود کی پذیرائی کا سال

محمد ﷺ کے مکّہ تشریف لے جانے کے بعد انصار نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ہوازن کے مالِ غنیمت میں سے قریشی مسلمانوں کو زیادہ حصہ دیا ہے۔

یہ شکایت صحیح تھی۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت آپ ﷺ نے انصار سے زیادہ قریش کا خیال کیا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ انصار کا حصہ قریش کو دے دیا ہو۔

قانون کے مطابق مالِ غنیمت کا ایک پنجم پیغمبرِ اسلام ﷺ اور ان کے اقربا کے لیے تھا۔ محمد ﷺ ہمیشہ اپنا حصہ دوسروں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس سفر میں اپنے حصے کے مالِ غنیمت کو قریش میں تقسیم فرمایا تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے قریش کے ساتھ محبت بھرا برتاؤ ضروری خیال کیا کہ یہ تازہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس طرح اسلام سے ان کا تعلق پختہ ہو جائے گا۔

انصار کو شکایت کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ پھر بھی محمد ﷺ نے ان کی دل جوئی کے لیے فرمایا: تمھیں صرف اس وجہ سے دل گیر نہیں ہونا چاہیے کہ اس سفر میں قریش کو آپ سے زیادہ حصہ ملا۔ آخر وہ مکّہ ہی میں رہیں گے اور میں تم لوگوں کے ساتھ مدینہ میں رہوں گا اور وہاں ہم باہم مل کر زندگی بسر کریں گے۔ آیا تمھارے لیے ایک شتر اور چند بکریاں بطورِ حصہ زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یا یہ کہ تم اپنے ساتھ پیغمبرِ اسلام ﷺ کو زندگی بھر کے لیے لے جاؤ۔ آیا تمھیں علم ہے کہ پیغمبرِ خدا ﷺ کے ساتھ زندگی بسر کرنا تمھارے لیے کتنا بڑا اشرف ہے۔ خداوند اس مناسبت سے نہ صرف تمھیں بلکہ تمھاری اولاد کو بھی اپنی رحمت کا مستحق کرے گا۔

مکّہ واپس آنے کے چند روز بعد محمد ﷺ وعدہ کے مطابق انصار کے ساتھ مدینہ روانہ

ہو گئے۔ انصار، محمد ﷺ کے مدینہ روانہ ہونے پر اس قدر خوش تھے کہ غلغلہ کرتے اور شعر پڑھتے روانہ ہوئے۔

محمد ﷺ نے مدینہ روانہ ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ایک جوان مرد کو کہ ہنوز اس کی عمر تیس سال بھی نہ تھی، مکّہ میں بطور خلیفہ مقرر فرمایا۔ یہ جوان قبیلہ بنو امیہ یعنی ابوسفیانؓ کے قبیلہ سے تھا۔ مکّہ میں مسلمانوں کے تمام اُمور مصالحت اس کے سپرد کیے۔

اب ہم پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زندگی کے اس حصہ کا ذکر کرتے ہیں جسے "عام الوفود" کہا گیا ہے: سال ۹ ہجری کو مسلمان عام الوفود کہتے ہیں۔ یعنی وہ سال جس میں سفرا اور نمائندے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ اس تاریخ سے ۹ سال قبل محمد ﷺ نے اس لیے کہ قتل نہ کر دیے جائیں، مجبور ہو کر مکّہ کو خیرباد کہا تھا اور ابوبکرؓ صدیق کے ہمراہ مدینہ روانہ ہوئے تھے۔ اس غار میں پناہ لی تھی جہاں سانپوں کے ڈسنے کا بھی خطرہ تھا۔

اس سفر میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے سر کی قیمت بھی مقرر ہوئی۔ اعلان ہوا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ کو زندہ یا مردہ لائے گا اسے ایک سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔ آج نو سال بعد محمد ﷺ مکّہ تسخیر کر چکے تھے اور وہ تمام لوگ جو ماضی میں آپ ﷺ کے دشمن تھے اور آپ ﷺ کے قتل کے درپے تھے آج اسلام کے فدائی تھے۔ حتیٰ کہ عکرمہ بن ابوجہل جو آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا، مسلمان ہوا اور بعدازاں ایک جنگ میں شہادت پائی۔

ابوسفیانؓ جو کہ جنگ اُحد و خندق میں مکّہ کی فوج کا سپہ سالار تھے، مسلمان ہوئے۔ آپ ﷺ نے انھیں حاکم نجران مقرر فرمایا۔

خالدؓ بن ولید مشرکین کے بڑے سرداروں میں سے تھے۔ اسلام کا ایک بہت بڑا مجاہد اور سپہ سالار ثابت ہوئے اور سیف اللہ کا لقب پایا۔

محمد ﷺ نے ۸ ہجری میں نہ صرف مکّہ کو فتح کیا بلکہ اب پورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یعنی تمام جزیرہ نمائے عرب مسلمان ہو چکا تھا یا اسلام سے موافقت کر چکا تھا۔ جب جزیرہ نمائے عرب کی وسعت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ

پیغمبرِ اسلام ﷺ اوّل ہجری سے ۹ ہجری تک روزانہ اوسطاً ۸۲۲ مربع کلومیٹر اراضی کو سلطنت اسلام کے تحت لائے۔

مسلمان ابتدا میں اس قدر مفلس تھے کہ پہلی تین جنگوں میں جو مشرکین سے لڑی گئیں، ہر دو مجاہدین کے پاس سواری کے لیے ایک اونٹ ہوتا تھا۔ جنگِ بدر میں جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، مجاہدوں کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی اور گھوڑوں کی تعداد صرف دو تھی۔ لیکن بعد میں مسلمان اس قدر قوی اور ثروت مند ہو گئے کہ جنگِ حنین میں مسلمانوں کے پاس ایک ہزار گھوڑے تھے اور جنگِ تبوک جس کا ذکر بعد میں آئے گا اسلامی لشکر میں دس ہزار گھوڑے دیکھے جا سکتے تھے۔

مسلمانوں نے پہلی بار نخلہ میں صرف چار مجاہدوں کے ساتھ جنگ کی۔

دوسری جنگ، جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ جنگِ اُحد میں سات سو لیکن جنگِ تبوک میں مسلمانوں کا لشکر تیس (۳۰) ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

جنگی نقصانات زیادہ تر جنگوں میں برائے نام تھے اور بعض میں نسبتاً زیادہ۔

مگر جس عظیم رقبہ پر مسلمانوں نے تصرف حاصل کیا اس کے تناسب سے یہ نقصانات قطعی زیادہ نہیں ہیں۔

وہ لوگ جو ۹ ہجری تک مسلمان ہو چکے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں:

۱۔ تشہد یعنی خدا ایک ہے، محمد ﷺ اس کے بھیجے ہوئے رسول ﷺ ہیں۔

۲۔ صلوٰۃ یعنی نماز پنجگانہ ہر روز معین اوقات میں پڑھنا۔

۳۔ صوم یعنی سال کے ایک مخصوص مہینہ میں روزے رکھنا۔

۴۔ زکوٰۃ یعنی سالانہ مالیاتی محصول جو کہ ہر مسلمان اپنے اموال کے تناسب سے اسلامی حکومت کو ادا کرے۔

۵۔ حج یعنی زیارت خانہ کعبہ۔ اس صورت میں کہ مسلمان مرد یا عورت میں اتنی مالی استطاعت ہو۔

سن نہم ہجری کے سال پیغمبرِ اسلام ﷺ نے سفیروں اور مختلف وفود کو جو ان قبائل کی

طرف سے آتے رہے جواب اسلامی قلمرو میں شامل تھے، پذیرائی بخشی۔ چونکہ اس سال رسول اللہ ﷺ نے وفود کو پذیرائی بخشی، اس سال کو "عام الوفود" کے نام سے یاد کیا گیا۔

محمد ﷺ کی حیثیت پورے جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت ایک مذہبی، سیاسی اور فوجی سربراہ کی تھی۔ لیکن جب سفرا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو مشاہدہ کرتے کہ آپ ﷺ ایک کھجور کی چٹائی پر تشریف فرما ہیں اور گھر کا سامان ویسا ہی ہے جیسے پہلے ہوتا تھا۔

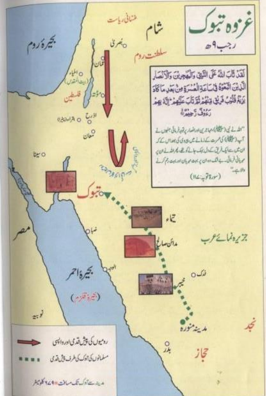
جب سفیر آتے تو بلالؓ ان کی راہنمائی فرماتے اور آپ ﷺ کی خدمت میں لے جاتے۔ عربستان کے قبیلوں کے سفیر جب مدینہ میں داخل ہوتے تو انھیں محلہ نجاریہ میں رملہ بنت حارث کے گھر ٹھیرایا جاتا، اس لیے کہ اس گھر کو سرکاری مہمانوں کی سکونت کے لے مخصوص کردیا گیا تھا۔ جب کبھی سفرا کی تعداد زیادہ ہوجاتی اور وہ گھر نا کافی ہوتا تو محمد ﷺ کے حکم کے مطابق مسجد نبوی میں خیمے لگادیے جاتے اور وہاں سفرا کو ٹھیرایا جاتا۔

باوجود اس کے کہ اسلام پورے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل چکا تھا، محمد ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا تھا، اس لیے کہ ہر دو اہلِ کتاب تھے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ابوالحارث، اسقف نجران کو جو خط لکھا اس کا متن حسبِ ذیل ہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی طرف سے نجران کے اسقفِ اعظم اور دوسرے پادریوں کے نام، اما بعد۔ اسقفِ اعظم، اساقفہ اور پادریوں پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ کلیساؤں، نماز خانوں اور صومعہ ہا کی نگرانی و انتظام حسبِ سابق ان کے پاس ہی رہے گا۔ خداوند اور اس کا رسول ﷺ اس کی حمایت کرتے ہیں۔ (اس خط میں پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں) کوئی اسقفِ اعظم، اسقف، پادری، اپنے مقام سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ ان کے حقوق و اختیارات کا خیال رکھا جائے گا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی اور کسی بھی مذہبی رسم کو تبدیل نہیں کیا جائے گا اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جائے گی اور ان سے بھی ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کریں گے"۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے عیسائی اور اسی طرح یہودی بھی اپنے مذہبی وظائف کی ادائگی



کے لیے جزیرہ نمائے عرب میں کاملاً آزاد تھے اور کوئی مسلمان ان کے مذہبی اُمور کی ادائیگی میں مزاحم نہیں ہوتا تھا۔

سن ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد پیغمبرِ اسلام ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا۔ یہ وفد اسقفِ اعظم ابوالحارث واسقف عبدالمسیح اور الایہم رئیس کاروان پر مشتمل تھا۔ نجران کے اساقفہ مدینہ میں ورود کے بعد جب محمد ﷺ کی ملاقات کے لیے جانے لگے اور اپنا روایتی مذہبی لباس پہنا تو اہلِ مدینہ ان کے لباس کو حیرت سے دیکھتے تھے۔

یہ وفد جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اپنے مذہبی وظائف کی ادائیگی کی اجازت چاہی۔ محمد ﷺ نے ان سے فرمایا کہ مدینہ کی مسجد میں اپنی عبادات انجام دیں۔ وہ مسجد میں چلے گئے اور شمال یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے اپنے مذہبی وظائف انجام دیے۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ عیسائیوں کے لیے خصوصی احترام کے قائل تھے، اس لیے کہ قرآن عیسائیوں کو عزیز ومحترم شمار کرتا ہے۔ خداوند نے سورۃ مائدہ کی آیات بیاسی تا پچاسی میں عیسائیوں کو موردِ عزت وقدردانی قرار دیا ہے۔

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ ”تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے، آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پائیں گے اور ان میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پائیے گا جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان میں بہت سے علم دوست عالم ہیں اور بہت سے تارک الدنیا درویش ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہ لوگ متکبر نہیں ہیں“۔ [مائدہ ۵:۸۲]

﴿وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ ”اور جب وہ اس کو سنتے ہیں، جو کہ رسول کی طرف بھیجا گیا ہے، تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی

دیکھتے ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا، وہ یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم مسلمان ہو گئے۔ ہم کو بھی تصدیق کرنے والوں کے ساتھ لکھ لیجیے“۔ [مائدہ ۵:۸۳]

وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ﴾ ”اور ہمارے پاس کون سا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور جو حق ہم کو پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لائیں، اور اس بات کی امید نہ رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں کی معیت میں داخل کر دے گا“۔ [مائدہ ۵:۸۴]

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ”سو ان کو اللہ تعالیٰ ان کے قول کے صلہ میں، ایسے باغ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور نیکوکاروں کا یہی صلہ ہے“۔ [مائدہ ۵:۸۵]

یہ موضوع بھی قابلِ توجہ ہے کہ کچھ آیات سچے عیسائیوں کی تعریف میں شاہ حبشہ کے مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی مناسبت سے نازل ہوئیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد ﷺ زندگی کے آخری دن تک عیسائیوں کے متعلق نیک خواہ رہے۔

سن ۹ ہجری مطابق ۶۳۱ عیسوی میں حج کے موقع پر بت پرستوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ہی خانۂ خدا کی زیارت کی۔ یہ سال بہرحال آخری سال تھا کہ بت پرستوں نے حج ادا کیا۔ خداوند نے ۹ ہجری کے بعد زیارتِ خانہ کعبہ بت پرستوں کے لیے ممنوع قرار دے دی اور یہ حکم قرآن کی نویں سورت کی اٹھائیسویں آیت میں وارد ہوا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ ...... الخ﴾ ”اے ایمان والو! جان لو کہ مشرکین نجس ہیں۔ اس سال (یعنی ۹ ہجری) کے بعد یہ مسجدِ حرام میں داخل نہ ہوں......“

چنانچہ ۱۰ ہجری سے بت پرستوں کے لیے زیارتِ خانہ کعبہ ممنوع قرار دے دی گئی۔ محمد ﷺ چودہ ہزار مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے زیارتِ کعبہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ اس

سال پیغمبرِ اسلام ﷺ نے تمام مناسک حج مکمل طور پر انجام دیے۔ اسی مناسبت سے وہ طریقہ جس پر آپ ﷺ نے حج ادا کیا، سنت قرار پایا اور آج تک مسلمان حج میں یہی مراسم ادا کرتے ہیں۔

ہمارے کہنے کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اس سے پہلے پیغمبرِ اسلام ﷺ مناسکِ حج ادا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ سالِ قبل پیغمبرِ اسلام ﷺ خود زیارتِ کعبہ کو نہیں گئے تھے اور سن آٹھ ہجری میں وہ جنگ کر کے مکہ میں داخل ہوئے اور اس سے قبل ایک بار جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ زیارتِ خانہ کعبہ کے لیے گئے، مگر تمام مناسکِ حج ادا نہ کر سکے تھے۔ اس سے قبل سات سال تک آپ ﷺ نے مدینہ میں زندگی بسر کی اور خانہ کعبہ کی زیارت کو مکہ نہیں جا سکتے تھے۔

بہر حال محمد ﷺ نے اس سال مکمل مناسکِ حج ادا فرمائے۔ احرام باندھا، سات بار طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ یہ سعی حاجرہؑ والدہ ماجدہ اسمٰعیلؑ کی یاد میں انجام دی جاتی ہے۔ وہ ان دو ٹیلوں کے درمیان پانی کی تلاش میں سرگرداں ہوئی تھیں۔

محمد ﷺ نے ذوالحج کی ۹ تاریخ کو ان تمام مسلمانوں کو جو حج کی ادائگی کے لیے آئے ہوئے تھے عرفات میں جبل الرحمۃ پر جمع کیا تا کہ ان سے خطاب کر سکیں۔ اس موقع پر مسلمانوں کے علاوہ کسی غیر مذہب کے فرد کا وجود نہیں تھا۔

محمد ﷺ مسلمانوں کو خطبہ دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ان ﷺ کی آواز تمام مسلمانوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ چنانچہ اس مقصد سے کہ سب مسلمان خطبہ سن سکیں انھوں نے کچھ افراد کو جو بلند آواز تھے، کچھ کچھ فاصلے پر مسلمانوں کے اجتماع میں کھڑے کیا، تا کہ جو کچھ محمد ﷺ فرمائیں وہ تکرار کرتے جائیں۔ بعد میں مسلمانوں نے اس خطبہ کو خطبہ وداع کا نام دیا:

تکرار کرنے والے افراد میں سے ایک بلالؓ مؤذن تھے، دوسرے ربیعؓ بن امیہ۔

پیغمبر خدا ﷺ نے خطبہ شروع کیا۔ خطبہ کی ابتدا خدا کے نام سے کی۔ خدا کی حمد کے بعد شہادتین پڑھیں اور فرمایا:

اے اللہ کے بندو! میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہنا۔ اس کی

اطاعت کرنا اور جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں اس پر عمل کرنا۔ شاید یہ آخری موقع ہو کہ میں یہاں مسلمانوں کے اس بڑے اجتماع میں شرکت کر رہا ہوں اور نہیں جانتا کہ آئندہ سال مجھے یہاں آنے کا اور تم سے خطاب کرنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔

اے لوگو! اگر تم خدا سے ڈرتے رہو گے، اس کی اطاعت کرو گے تو تمھاری جان و مال اور حیثیت ہر نوع کے گزند سے جب تک خدا کو منظور ہوگا محفوظ رہے گی۔ وہ تمھیں اپنے پاس بلا لے گا اور اس روز تمھاری پہچان اس سے ہوگی"۔

اس موقع پر پیغمبرِ اسلام ﷺ نے موضوع خطبہ بدلا اور فرمایا:

کیا میں نے وظیفۂ پیغمبری بخوبی انجام دیا ہے یا نہیں؟ خدایا! تو گواہ رہنا کہ آیا تو نے جو وظیفہ میرے سپرد کیا وہ انجام کو پہنچا ہے یا نہیں؟"

لوگوں نے بلند آواز سے کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے وظیفۂ پیغمبری بخوبی انجام دیا ہے۔ پھر خدا کے پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرنا اور اسی طرح انجام دینا۔ میری وصیت یہ ہے: ہر وہ شخص جس کے پاس دوسرے کی امانت ہو وہ اس امانت کو اسی حالت میں دوسرے کو واپس کرے اور امانت میں خیانت نہ کرے۔

اے لوگو! سود سے پرہیز کرنا۔ دورِ جاہلیت والی سود خوری اسلام میں ممنوع ہو چکی ہے۔ لیکن تمھارا اصل سرمایہ تم پر حلال ہے۔ خدا نے فرمایا: "سود خوری مت کرو"۔ اور پہلا شخص جس کا سودی لین دین میں ختم کرتا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبدالمطلب ہیں۔

اے لوگو! اگر کوئی قتل کرے تو اس کو اسی طرح قتل کیا جائے گا۔ اگر سہواً قتل ہو جائے اور عمداً نہ ہو اور مقتول پتھر یا لکڑی کی ضرب سے مرا ہو تو قاتل ایک سو اونٹ دِیَت ادا کرے اور کسی صورت قاتل سے ایک سو اونٹ سے زیادہ مت مانگنا اور اگر اس سے زیادہ مطالبہ کیا تو گویا تم نے دورِ جاہلیت کی رسم کی پیروی کی"۔

اس موقع پر پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کیا میں اپنا وظیفہ انجام دینے میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں؟ اے خدا! تو گواہ رہنا کہ آیا

وظیفہ جو تو نے میرے ذمہ لگایا کیا وہ انجام کو پہنچا ہے یا نہیں؟ لوگ بلند آواز سے پکارے: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اپنا وظیفہ بخوبی انجام دیا ہے۔

اس کے بعد پھر محمد ﷺ نے فرمایا:

اے لوگو: "ابلیس خشمگین ہے، اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ تمھاری سرزمین یعنی سرزمینِ اسلام میں کوئی اس کی پرستش نہیں کرے گا لیکن وہ کوشش کرے گا کہ دوسرے مقامات پر اس کی پرستش ہو۔

اسے معلوم ہے کہ تمھارے مذہبی اُمور میں اسے مداخلت کی قدرت نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کوشش کرے گا کہ تمھارے غیر مذہبی اُمور اور تمھاری زندگی کے فروعی مسائل میں مداخلت کرے۔ اس سے حذر کرنا۔ اس کے چھوٹے اور بے اہمیت کاموں میں بھی ملوث نہ ہونا تا کہ اس کے لیے نفوذ کرنے کی جگہ نہ رہے ورنہ ایک دن وہ تمھارے مذہب کو نقصان پہنچائے گا۔

اے لوگو! ماہ ہائے حرام کا کسی دوسرے مہینے سے تبادلہ کرنا بدعت ہے۔ بے ایمان لوگوں نے یہ روایت قائم کی ہے۔ چونکہ وہ ایمان نہیں رکھتے تھے اس لیے یہ بدعت قائم کی اور گمراہ ہوئے۔ وہ ایک سال جس مہینہ کو عام ماہ شمار کرتے اگلے سال اسے ماہِ حرام قرار دے لیتے۔

اسلام میں تمام مہینے اسی طور ہیں جس طور خداوند انھیں وجود میں لایا اور کتابِ الٰہی میں ان کا ذکر کیا، یعنی بارہ مہینے ہیں۔ اس روز سے جب خداوند نے زمین و آسمان بنائے بارہ مہینے ہی تھے۔ ان بارہ مہینوں میں سے چار ماہ حرام ہیں۔ ان چار مہینوں میں سے تین تو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور وہ عبادت کے مہینے ہیں: ماہِ ذیقعد، ذی الحج، محرم، اور چوتھا مہینہ رجب ہے جو جمادی الآخرہ اور شعبان کے درمیان آتا ہے۔

اے لوگو! اب میں تمھاری مستورات کی بابت گفتگو کرتا ہوں۔ تمھاری عورتیں تم پر حق رکھتی ہیں اور تم اپنی عورتوں پر حق رکھتے ہو۔ ان کا وظیفہ یہ ہے کہ تمھارے بستر پر کسی

غیر مرد کو آنے کی اجازت نہ دیں اور وہ لوگ جنھیں تم پسند نہیں کرتے انھیں اپنے گھروں میں داخل نہ ہونے دیں۔ اور اگر انھوں نے ان وظائف پر عمل نہ کیا تو خداوند کی طرف سے تمھیں اجازت ہے کہ ان سے علیحدہ بستر میں استراحت کرو۔ انھیں تھپڑ لگاؤ مگر شدت سے نہیں اور اگر وہ تمھاری اطاعت کریں اور اپنا وظیفہ بخوبی انجام دیں تو انھیں مناسب غذا فراہم کرو اور مناسب لباس پہناؤ۔ تمھیں چاہیے کہ اپنی عورتوں سے بہترین سلوک کرو، اس لیے کہ وہ تمھارے گھروں میں محبوس ہیں اور خود سے اختیار نہیں رکھتیں۔ اور وہ جو گھر میں محبوس ہو اور مختار نہ ہو اس سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ تمھاری عورتیں خداوند کی طرف سے تمھارے پاس امانتیں ہیں۔ اس نے تمھیں اجازت دی ہے کہ اس کے کلام کے وسیلہ سے ان کے نزدیک آؤ (یعنی اسلامی قانون کے مطابق ان سے ازدواج کرو)۔ خدا سے ڈرو اور اپنی عورتوں سے بہترین برتاؤ کرو۔

ایک مرتبہ پھر پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

آیا میں اپنا وظیفہ صحیح طور پر انجام دے سکا ہوں یا نہیں؟ خدایا! تو گواہ رہنا کہ آیا جو وظیفہ تو نے میرے سپرد کیا میں نے صحیح طور انجام دیا ہے یا نہیں؟

لوگوں نے بلند آواز سے جواب دیا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنا وظیفہ احسن طریقہ سے انجام دیا ہے۔

محمد ﷺ نے فرمایا:

اے لوگو! جو دین اسلام پر ایمان لائے ہو، تم آپس میں بھائی بھائی ہو۔ ایک بھائی کا مال دوسرے بھائیوں پر جائز نہیں اور مسلمان کو اجازت نہیں کہ ایک مسلمان کے مال میں تصرف کرے مگر یہ کہ اس کی رضامندی سے...... اے لوگو! میرے مرنے کے بعد ایک دوسرے کی جان و مال کے درپے نہ ہو جانا اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔ اسلامی اخوت کو قائم رکھنا۔ میں چلا جاؤں گا، تمھارے درمیان موجود نہیں ہوں گا۔ لیکن میری موت کے بعد خدا کی کتاب اور میری سنت تمھاری راہنمائی کرے گی اور تمھیں گمراہ ہونے سے بچائے گی۔

آیا میں اپنا وظیفہ انجام دینے میں کامیاب ہوا ہوں کہ نہیں؟ خداوندا تو گواہ رہنا کہ آیا جو وظیفہ تو نے میرے ذمہ لگایا میں نے باحسن انجام دیا ہے یا نہیں؟"

لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا:

ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنا وظیفہ بخوبی انجام دیا ہے"۔

محمد ﷺ نے فرمایا:

اے لوگو! تمھارا خدا ایک ہے اور تمھارا جدامجد بھی ایک تھا۔ تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو اور آدمؑ خاک سے پیدا کیے گئے تھے، لہٰذا تمھارا خمیر خاک سے ہے۔ تم میں سے کوئی کسی سے برتر نہیں۔ خدا کے زیادہ نزدیک وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرتا ہو اور جان لو کہ کوئی عرب یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ کسی غیر عرب سے برتر ہے۔ برتری فقط تقویٰ میں ہے۔

ایک مرتبہ پھر محمد ﷺ نے فرمایا:

آیا میں اپنا وظیفہ بخوبی انجام دے سکا ہوں یا نہیں؟

لوگوں نے بلند آواز میں شہادت دی کہ آپ ﷺ نے اپنا وظیفہ بخوبی انجام دیا ہے۔

محمد ﷺ نے فرمایا:

اے لوگو! تم جو یہاں جمع ہو، میرا یہ پیغام ان لوگوں کو پہنچا دینا جو یہاں موجود نہیں ہیں تاکہ وہ بھی میرے پیغام سے مطلع ہو جائیں۔

خداوند نے ہر وارث کے لیے میراث میں حصہ مقرر فرما دیا ہے۔ تم اپنا حصہ وراثت کے مطابق وصول کرنا اور کبھی ایسی وصیت نہ کرنا کہ وارث کو مقررہ حصہ سے زیادہ موصول ہو۔ اور اگر تم کسی غیر کے لیے وصیت کرو تو تمھیں معلوم ہو کہ وصیت اس طرح کرنا کہ اس غیر کو جو وارث نہیں ہے میراث کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں پہنچنا چاہیے۔

اے لوگو! چھوٹے بچے ماں سے متعلق ہیں اور وہ شخص جو محصنہ (شادی شدہ عورت) سے زنا کرے اسے سنگسار کیا جائے۔ اور وہ شخص جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کو اپنا والد بتائے اور وہ غلام جو اپنے آقا کے علاوہ کسی دوسرے سے اپنی پہچان کرائے، اس

پر خدا کی لعنت ہوگی۔ تمام فرشتے اور افرادِ بشر اس پر لعنت بھیجیں گے اور روزِ جزا اس شخص سے دیت اور فدیہ قبول نہیں ہوگا"۔

محمد ﷺ نے اپنا خطبہ والسلام علیکم (یعنی تم پر سلامتی ہو) پر ختم کیا۔

اس خطبہ کو سن کر حاضرین بہت متاثر ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق اس روز جبل الرحمۃ پر ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمانوں کا مجمع تھا، جنھوں نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کا خطبہ سنا۔

جب محمد ﷺ کلمات ادا فرماتے، لوگ اس کی تکرار کرتے۔ خصوصاً اس وقت جب محمد ﷺ اپنے وظیفہ کی بخوبی انجام دہی کے متعلق پوچھتے: لوگ بلند آواز میں جو شہادت دیتے وہ دلوں کو بہت زیادہ متاثر کرتی تھی۔

جب لوگ یک آواز ہو کر محمد ﷺ کے جواب میں گواہی دیتے تو کوہ و دمن لرز اُٹھتے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس روز خطبہ سنا زندگی کے آخری لمحہ تک انھوں نے اسے فراموش نہ کیا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دن خطبہ سننے والے مسلمانوں کے وجود کے ہر ذرہ میں وہ الفاظ جو محمد ﷺ نے ادا فرمائے راسخ ہو گئے۔

ہم جب اس خطبہ کو پڑھتے ہیں، حالانکہ ہم یورپین ہیں اور ہم نے پیغمبر ﷺ کی آواز نہیں سنی اور اس روز اس اجتماع میں شامل نہیں تھے، پھر بھی بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ کجا وہ لوگ جنھوں نے اس دن جبل الرحمۃ میں یہ خطبہ اپنے کانوں سنا اور ان کی صورت بھی دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی نگاہ میں رہنا چاہیے کہ عربستان میں کلام کی ایک اپنی وقعت اور تاثیر تھی۔ عرب بادیہ کی رُوح کلام سے اس طرح اثر پذیر ہوتی تھی کہ شاید آج ہماری عقل وفہم سے باہر ہے۔

اس خطبہ کو خطبہ حج البلاغ بھی کہتے ہیں۔

لیکن اکثریت نے اس دن کے خطبہ کو خطبہ حج الوداع کا نام دیا ہے اور آج بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ خطبہ اسلام میں بہت مؤثر رہا ہے اور آج بھی مؤثر ہے اور تمام مسلمان جو لکھ پڑھ سکتے ہیں اس خطبہ کو حفظ کرتے ہیں۔



رسول اللہ ﷺ مرض الموت میں

مدینہ مراجعت کے ایک ماہ بعد تک آپ ﷺ کی طبیعت اچھی رہی۔ اس کے بعد آپ بیمار ہوگئے۔ لیکن بیماری اس طرح کی تھی کہ آپ ﷺ گاہے گاہے گھر سے باہر تشریف لے آیا کرتے تھے اور مسجد میں جا کر نماز ادا کیا کرتے۔

جن دنوں آپ ﷺ خود گھر سے باہر تشریف لانے کی حالت میں نہ ہوتے تو آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں ابوبکرؓ امامت فرماتے۔ ہر موقع کہ ابوبکرؓ مسجد میں قرآن پڑھاتے، پیغمبر ﷺ اپنے گھر میں ہی سنتے رہتے اور کسی وقت اُٹھ کر بیٹھ جایا کرتے اور جو کچھ کہ مسجد میں پڑھا جاتا اس کی تکرار فرماتے۔

جب تک محمد ﷺ میں مسجد تک جانے کی سکت تھی حتیٰ کہ دوسروں کی مدد سے، آپ ﷺ نے مسجد جانے سے گریز نہیں کیا۔ بعض اوقات آپ ﷺ دو آدمیوں کے کندھوں کا سہارا لے کر مسجد جاتے تاکہ نماز پڑھائیں اور وعظ و نصیحت فرمائیں۔ ایک دن جب کہ آپ ﷺ مسجد میں وعظ و نصیحت فرما رہے تھے، کہا: ”اے بھائیو! جلد ہی تم میں سے ایک شخص جو تمھیں بہت عزیز رکھتا تھا، تمھارے درمیان سے چلا جائے گا“۔ سامعین جو مسجد میں جمع تھے یہ سن کر رو پڑے۔

اس لیے کہ وہ اس کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ جو انھیں دوست رکھتے تھے وہ محمد ﷺ تھے اور وہ اب وفات پا جائیں گے۔ محمد ﷺ نے ان کی دلداری فرمائی اور فرمایا: ”گریہ مت کرو“۔

بیماری کے دوران جب بھی آپ ﷺ کی طبیعت قدرے بحال ہوتی آپ ﷺ گھر سے نکل کر قبرستانِ بقیع کی طرف جاتے جہاں جنگِ اُحد کے شہدا کی قبریں ہیں اور خاصی دیر آپ وہاں توقف فرمایا کرتے تھے۔

یہ صرف خدا کو معلوم ہے کہ محمد ﷺ جنگِ اُحد کے شہدا کی قبروں پر کس بابت سوچا کرتے

تھے۔ ان دنوں جب بھی مسجد تشریف لے جاتے تو فرماتے:

اے بھائیو اور بہنو! اگر کسی کے ساتھ مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو پیشتر اس کے کہ میں اس جہان سے رخصت ہو جاؤں، مجھ سے قصاص لے لو۔ اگر میں نے کسی کو مارا ہے تو آؤ مجھے مار لو، میری پیٹھ حاضر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا گھر مدینہ میں (جہاں آپ ﷺ نے اس دنیا سے کوچ فرمایا) مسجد کے نزدیک تھا۔ آپ ﷺ کا گھر ایک منزلہ اور بغیر تہہ خانہ کے تھا، جس کی وجہ سے گرمیوں میں بہت گرم ہو جاتا تھا۔ گھر صحن کے درمیان میں بنا ہوا تھا یعنی صحن رہائشی حصہ کے چاروں اطراف تھا اور ہر وقت چند بھیڑیں صحن میں پھرتی رہتی تھیں۔

ایک صبح آپ ﷺ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو آپ ﷺ نے وہاں جمع شدہ افراد سے فرمایا کہ جائیں اور میرے لیے مدینہ کے سات کنوؤں سے سات پیالے پانی لائیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ ایک کنویں سے دو پیالے پانی نہ لیا جائے۔ لوگ گئے اور سات کنوؤں سے سات پیالے پانی لے آئے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے ہر پیالے میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پیا اور فرمایا: اب میری طبیعت قدرے بہتر ہوگئی ہے۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ محمد ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ اور کیوں سات کنوؤں کا پانی پینے سے طبیعت بحال ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی ایک بدوی عرب کے لیے دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانی کی قدر بدوی عرب ہی جانتا ہے جو تمام عمر تشنگی سے دوچار رہتا ہے۔ ہم اس کی قدر نہیں جان سکتے کیوں کہ ہماری دسترس میں پانی کی افراط ہے۔ بدوی عرب کی نظر میں پانی نہ صرف مقوی روح و جسم ہے بلکہ تمام دردوں کی دوا ہے۔ عربستان کے بیابانوں میں جو شخص بھی بیمار ہو، اس کا پانی سے علاج کیا جاتا ہے۔

جس دن محمد ﷺ نے سات کنوؤں کا پانی پیا، فرمایا کہ میری طبیعت بہتر ہوگئی ہے۔ چند افراد کے سہارے مسجد میں تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ پھر لوگوں سے خطاب کیا اور مومنین سے خواہش کی۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

اے لوگو! اگر میں نے تمھیں ضرب لگائی ہے اور اہانت کی ہے تو مجھے ضرب لگاؤ اور

اہانت کرو اور مت ڈرو کہ آپ کا مجھے ضرب لگانا یا اہانت کرنا میری رسوائی ہوگی، اس لیے کہ اس جہان کی رسوائی اگلے جہان کی رسوائی کے مقابل بے اہمیت ہے۔ بعدازاں آپ ﷺ نے پھر فرمایا: اپنے ذہنوں پر زور دو، شاید کچھ ادائگی میرے ذمہ ہو۔ جتنی تمھاری طلب ہے مجھ سے وصول کرو۔

ایک شخص اُٹھا۔ اس نے عرض کی: یا محمد ﷺ! آپ میرے تین درہم کے قرض دار ہیں۔ آپ ﷺ نے فوری اس کا قرض چکا دیا۔ اس کے بعد رشتۂ سخن کو بدلا اور اُسامہؓ کی بابت فرمایا: اُسامہ، زیدؓ بن حارثہ کا لڑکا تھا۔ زیدؓ بن حارثہ قبیلہ بنوکلب سے تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ ایک جنگ میں اسیر ہوا۔ ایک شخص حکیم بن حزام نے اسے بعنوان غلام اپنی پھوپھی زاد بہن خدیجہؓ دختر خویلد کے لیے خرید لیا۔ اور یہ وہی خدیجہؓ ہیں جو بعد میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زوجیت میں آئیں۔ جب حضرت خدیجہؓ کی شادی آپ ﷺ سے ہوئی تو خدیجہؓ نے یہ غلام آپ ﷺ کی خدمت میں دے دیا۔ محمد ﷺ نے اسے آزاد کر کے اپنی فرزندی میں لے لیا۔ اسی وجہ سے مکّہ میں بعض لوگ زیدؓ بن حارثہ کے بجائے زید بن محمد ﷺ کہنے لگے تھے۔

پھر زیدؓ بن حارثہ کی بابت خداوند کی طرف سے آیات نازل ہوئیں جو آج قرآن کی سورۃ احزاب کی چوتھی پانچویں آیات ہیں، ان میں خداوند نے مسلمانوں سے فرمایا: زید بن حارثہ کو زید بن محمد کے نام سے مت مخاطب کرو۔ اگرچہ پیغمبر ﷺ نے اسے فرزندی میں لے لیا ہے مگر وہ حقیقی فرزندِ رسول ﷺ نہیں۔ آیات مذکورہ میں زیدؓ کا نام نہیں لیکن آیت کا ایک حصہ انھی سے متعلق ہے۔ زیدؓ بن حارثہ بعدازیں جنگ موتہ میں شہید ہو گئے۔ ان کا ایک فرزند اُسامہؓ تھا جس نے آپ ﷺ کی بیماری کے دوران ایک لشکر تیار کیا۔ اُسامہ بن زیدؓ کی عمر اس وقت اکیس سال تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اُسامہ کو رُوم پر حملہ کرنے کے لیے لشکر کا کماندار مقرر کیا گیا تھا۔

اس پر کچھ مسلمان جنگجوؤں نے برا مانا۔ گرچہ رسول اللہ ﷺ کے احترام کی وجہ سے ان کی خدمت میں تو کچھ نہ کہہ سکے۔ مگر اس پر کھلے عام تنقید کی کہ ایک اکیس سالہ جوان کو

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے لشکر کا سپہ سالار بنا کر شام پر حملہ کے لیے بھجوا دیا ہے۔ اس کے پاس وہ لیاقت اور تجربہ نہیں ہے۔ بالآخر خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی۔ اس روز آپ ﷺ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میں نے اُسامہ بن زید کا انتخاب اس مناسبت سے کیا ہے کہ وہ علاوہ اس کے کہ زید بن حارثہ کا لڑکا ہے، ایک شجاع و عاقل جوان ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ اس عہدے کی ذمہ داریاں سنبھال سکتا ہے۔

اُسامہ بن زیدؓ پیغمبر ﷺ کی رحلت کی وجہ سے فوری اس جنگی مہم پر نہ جا سکے۔ لیکن بعد میں جب ابوبکرؓ خلیفۂ مسلمین ہوئے تو انھوں نے پیغمبر ﷺ کے ارادہ کی تائید میں اُسامہؓ کو دوبارہ لشکر دے کر رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے بھجوایا۔ اُسامہؓ شام گئے جنگ ہوئی۔ اسلامی لشکر فتح یاب ہوا اور یہ ثابت ہو گیا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کا اُسامہؓ پر اعتماد بے بنیاد نہیں تھا۔ رومیوں کے خلاف جنگ میں اُسامہؓ کی اس فتح نے اسلام پر شام کے دروازے کھول دیے اور عمرؓ بن الخطاب کے دورِ خلافت میں شام کی تمام مملکت اسلام کے زیرِ تصرف آگئی۔

اس دن کہ پیغمبر ﷺ اسلام نے مسجد میں اُسامہؓ کی بابت نصیحت فرمائی، رشتۂ کلام انصار تک پہنچایا اور مہاجرین سے فرمایا:

اے مہاجرین! تم نے مکّہ سے ہجرت کی اور مدینہ پہنچے۔ میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ انصار میرے موردِ اعتماد تھے اور ہمیں مکّہ سے ہجرت کے بعد مدینہ میں ان کی وجہ سے امن نصیب ہوا۔ اگر تم دیکھو انصار سے تمھاری بابت کوئی زیادتی سرزد ہو گئی ہے تو ان سے درگزر کرنا۔ انصار میرے لیے میرے لباس کی طرح تھے اور انھوں نے آج تک اپنے وظائف بڑی خوبی سے انجام دیے ہیں۔ اس کے بعد ان کا یہ وظیفہ نہیں بلکہ وہ حق دار ہیں۔ اے لوگو! میں جب فوت ہو جاؤں تو مجھے سپردِ خاک کرنا اور میری قبر کے سامنے رکوع و سجود نہ کرنا۔ رکوع و سجود فقط خدائے واحد کے لیے ہے"۔

اس کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ مسجد سے تشریف لے گئے۔

❀....❀❀....❀

ارتحال

پیش تر اس کے کہ ہم محمد ﷺ کی زندگی کے آخری ایام کی بابت گفتگو کریں، ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم مختصراً جنگِ تبوک پر جو محمد ﷺ کی زندگی کی آخری جنگ تھی روشنی ڈالیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، مکہ سے مراجعت کے بعد محمد ﷺ بیمار ہو گئے، لیکن گاہ بہ گاہ آپ ﷺ کا حال بہتر ہو جایا کرتا تھا۔

شام میں بعض سلاطین و امرا قیصرِ روم کے تحت حمایت تھے۔ وہاں افواہ مشہور ہو گئی کہ محمد ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ اس افواہ کی وجہ سے رومیوں نے پروگرام بنایا کہ شام کے راستے جزیرہ نمائے عرب پر حملہ آور ہو کر مسلمانوں کی سرکوبی کریں۔ یہ خبر جب خود محمد ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے ارادہ کیا کہ دشمن کے استقبال کے لیے آگے بڑھیں۔ باوجودیکہ آپ ﷺ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، لشکر کی تیاری کا حکم صادر فرما دیا۔

اس وقت بیت المال کی وضع اتنی اچھی نہیں تھی اور مدینہ میں کھانے پینے کی اشیا کی کمی تھی۔ مزید یہ کہ اس سال گرمیوں کے موسم میں شدت کی گرمی کی وجہ سے حالت مزید خراب ہو گئی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے خواہش ظاہر کی کہ ہر مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق لشکر کی تیاری میں مدد دے۔ اور ہر وہ مسلمان جس میں مالی سکت ہے وہ اپنے لیے اور خویش کے لیے جنگی ساز و سامان مہیا کرے۔

عبدالرحمٰنؓ بن عوف اس اپیل پر چار ہزار درہم لائے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ میں چہار ہزار درہم گھر کے لیے چھوڑ آیا ہوں اور بقیہ نصف آپ ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ محمد ﷺ نے فرمایا: تم جو مال و دولت اسلامی لشکر کے لیے لائے ہو اور جو گھر کے لیے چھوڑ آئے ہو اس میں خداوند اضافہ کرے گا۔ عبدالرحمٰنؓ

بن عوف اس قدر مالدار ہوئے کہ جب اس جہان سے کوچ کیا تو میراث کا آٹھواں حصہ جو ان کی ایک بیوی کو ملا وہ اسی ہزار مثقال سونا تھا۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی چار بیویاں تھیں۔

ابوبکرؓ جو کچھ گھر میں رکھتے تھے، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ عمرؓ بن الخطاب اپنے اموال کا آدھا حصہ محمد ﷺ کی خدمت میں لائے۔ ایک شخص عاصمؓ بن عدی کہ ان کے پاس نقدی نہیں تھی، ایک سو وسق کھجوریں لائے۔ ابوعقیلؓ کہ ایک انصاری تھے، ایک صاع کھجوریں لائے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس دو صاع کھجوریں تھیں، ایک صاع لشکرِ اسلام کے لیے لے آیا ہوں۔ صاع ایک من سے تھوڑا زیادہ ہوتا ہے۔ اور وسق عربستان میں چھ صاع کے برابر ہوتا ہے۔

مسلمانوں نے واقعی فداکاری کی اور تمام اموال (تھوڑا بہت اپنے گھروں کی کفالت کے لیے چھوڑ کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیے۔ یوں تیس ہزار کا طاقت ور لشکر باایمان افراد پر مشتمل تیار ہو گیا جس میں دس ہزار سوار تھے۔

مدینہ سے لشکر کی روانگی کا منظر بڑا باشکوہ تھا۔ تمام لشکر منظم صفوں میں شام کی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسلام کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی مثال نہیں ملتی۔ جس وقت لشکرِ اسلام شام کی سرحد پر پہنچا، مقامی امرا و رؤسا جو لشکرِ روم کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا قصد کر رہے تھے، بھاگ گئے اور شام کی سرحدوں کے اندر چلے گئے، حتیٰ کہ لشکر رُوم جو مقامی امرا و رؤسا کی مدد سے بڑھ کر حملہ کرنے کی سوچ رہا تھا، پسپا ہو گیا۔

پیغمبر ﷺ نے کچھ دیر شام کی سرحد پر توقف کیا اور مقامی قبائل کے امرا و رؤسا اور مذہبی پیشواؤں کو جو زیادہ تر عیسائی تھے، مطیع اسلام کیا یعنی وہ اس عہد کے پابند ہوئے کہ اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں گے۔ اس وقت محمد ﷺ اپنے طاقت ور لشکر کے ساتھ مدینہ واپس ہوئے۔ لشکرِ اسلام نے شام کی سرحد پر ایک قلعہ بنام تبوک کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ اسی مناسبت سے اس لشکر کشی کو جنگ تبوک کا نام دیا گیا۔ محمد ﷺ نے تبوک میں جنگ نہیں کی تھی۔ لیکن مقامی قبائلی رؤسا، لشکرِ اسلام سے خوفزدہ ہو گئے اور مسلمانوں سے غیر جانبدار رہنے کا معاہدہ

کرلیا یا اتحادی ہوگئے۔ انھوں نے بچشمِ خود دیکھا کہ اسلامی لشکر کی آمد پر ایسی ہیبت پھیلی کہ رومی لشکر بھی پسپائی اختیار کر گیا تھا۔

تبوک کی جنگ کے لیے لشکر کے کوچ کے وقت چند مسلمانوں نے راحت طلبی کی وجہ سے یا موت کے خوف سے میدانِ جنگ میں ساتھ ہوجانے سے گریز کیا۔ وہ تھے کعبؓ بن مالک، مرارہؓ بن ربیع اور ہلالؓ بن امیہ یہ تینوں افراد اپنے عمل پر پشیمان ہوئے اور ابھی محمد ﷺ تبوک سے مدینہ واپس تشریف نہیں لائے تھے کہ انھوں نے خود کو مسجد مدینہ کے ستونوں کے ساتھ باندھ لیا اور کہا کہ جب تک محمد ﷺ ہمیں معاف نہیں فرمائیں گے، ہم اسی طرح بندھے رہیں گے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی عادت تھی کہ جب بھی سفر سے مدینہ واپس پہنچتے، سیدھے مسجد جاتے اور دو رکعت نماز ادا کرتے۔ پس تبوک سے مراجعت پر آپ ﷺ جب واردِ مسجد ہوئے تو ان تینوں کو ستونوں سے بندھا دیکھا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے پوچھا: کیوں ستونوں سے بندھے ہوئے ہو؟

انھوں نے عرض کی: ہم گنہگار ہیں کیوں کہ میدانِ جنگ میں نہیں گئے۔ جب تک آپ ﷺ ہمیں ہماری کوتاہی پر معاف نہیں فرمائیں گے، ہم اسی طرح خود کو بندھے رکھیں گے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: بندوں کے گناہ تو خدا ہی بخشتا ہے۔ میں بخشنے والا نہیں ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سورۃ توبہ کی آیت ۱۰۲ نازل ہوئی:

﴿وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ ”(جنگ سے) گریز کرنے والے دیگر افراد نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا، انھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے۔ کچھ بھلے اور کچھ برے۔ خداوند ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ بخشش کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے“۔

اس آیت کے بموجب خداوند نے ان تینوں کا گناہ معاف فرمادیا۔ شکرانہ کے طور پر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ہم اپنا تمام مال و دولت بیت المال میں دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اسی سورۃ توبہ میں دوسری آیت نازل ہوئی جس میں خداوند نے فرمایا: ان تینوں افراد کے اموال میں سے فقط صدقہ لے کر بقایا مال واپس کردو۔

تبوک پر لشکر کشی کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ نے کسی جنگ میں شرکت نہیں کی۔ لیکن آپ ﷺ تقویت اسلام کی فکر سے غافل نہیں تھے اور بیماری کی حالت میں بھی آپ ﷺ نے ایک لشکر اُسامہ کی قیادت میں شام پر حملہ کے لیے تیار کیا، لیکن رحلت پیغمبر ﷺ اس لشکر کشی کی روانگی میں مانع ہوئی۔

مسجد میں خطاب کے دوسرے دن پیغمبرِ اسلام ﷺ کی حالت نازک تر ہوگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری بیماری کا سبب وہی زہر ہے جو اس یہودی عورت نے خیبر میں مجھے کھلایا تھا۔ وہ زہر گاہے گاہے میرے لیے تکلیف کا باعث بنتا رہا، مگر نہ اس طرح کہ میں بستر سے لگ جاؤں۔ اب اس زہر کا حملہ سنگین تر ہے“۔

جن دنوں پیغمبر ﷺ اسلام سخت بیمار تھے، گھر سے مسجد جانے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ ابوبکرؓ مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ ایک روز آپ ﷺ کی طبیعت قدرے سنبھلی تو آپ ﷺ اپنے چچا عباسؓ کے دو بیٹوں کے سہارے مسجد تشریف لے گئے۔ اس وقت ابوبکرؓ مسلمانوں کو خطبہ دے رہے تھے۔ ابوبکرؓ آپ ﷺ کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور اپنی جگہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے لیے خالی کرنا چاہی، مگر پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اشارہ سے بیٹھنے کا اذن دیا۔ اور چونکہ طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے عباسؓ کے دونوں بیٹوں کا سہارا لیے ہوئے واپس گھر آگئے۔

سن ۱۱ ہجری ماہ ربیع الاول میں محمد ﷺ کی حالت ایک بار پھر نازک تر ہوگئی۔ آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ اب اس جہان سے رخصت کا وقت آگیا ہے۔ آپ ﷺ کو یاد آیا کہ عائشہؓ کے پاس سات دینار نقد پڑے ہوئے ہیں۔ محمد ﷺ کے پاس ان سات دیناروں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ لہٰذا عائشہؓ کو بلا کر فرمایا: آیا وہ سات دینار ابھی تک تمھارے پاس ہیں؟

انھوں نے عرض کی: ”ہاں یا رسول اللہ ﷺ“۔

محمد ﷺ نے فرمایا: ساتوں دینار غریبوں میں تقسیم کردو۔ میں ان سات دیناروں کے ساتھ خداوند کے ہاں جاتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔

بروز سوموار بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری کو محمد ﷺ بہت زیادہ بیمار ہوگئے۔

تواریخ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن تک پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بیماری کے دوران کوئی دوا نہیں کھائی تھی۔ لیکن بعض مؤرخین اسلامی کے مطابق بروز سوموار ۱۲ ربیع الاول کو دو روز قبل تھوڑی سی دوا محمد ﷺ کو دی گئی لیکن آپ ﷺ نے دوا کھانے سے کراہت محسوس کی۔

آخری خواہش جو محمد ﷺ نے وہاں جمع شدہ لوگوں سے کی، وہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے دانتوں پر مسواک کریں تاکہ دانت صاف ہو جائیں۔ آپ ﷺ نظافت سے بہت شائق تھے اور کئی مرتبہ فرمایا: نظافت نصفِ ایمان ہے۔

بروز سوموار بتاریخ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری بمطابق ۸ جون ۶۳۲ عیسوی علیؓ ابن ابی طالب، چچا عباسؓ کا لڑکا فضلؓ، اُسامہؓ بن زید، شُقران آپ ﷺ کا ایک اور آزاد کردہ غلام جس کا ذکر ابھی تک نہیں آیا تھا، اوسؓ بن خولی اور تمام ازواجِ مطہرات آپ ﷺ کی خدمت میں موجود تھیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ان دنوں میں جوان تھی اور نہ سمجھ سکی کہ میرے شوہر اس جہان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ میں نے دونوں بازوؤں سے گردن کے اردگرد حلقہ کیا ہوا تھا اور اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ نے رحلت فرمائی۔ میں نہ سمجھ سکی کہ آپ رخصت ہو چکے ہیں۔ جب عورتوں نے آہ و شیون شروع کی اور مرد رونے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اس جہان سے تشریف لے جا چکے ہیں۔

جس لحظہ آپ ﷺ کی موت واقع ہوئی، ایک روایت کے مطابق مہر نبوت جو پشت پر دونوں شانوں کے درمیان تھی، معدوم ہوگئی۔ ویسے بھی رحلت پیغمبر ﷺ سے رسالت کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ جب محمد ﷺ نے اس دنیا سے کوچ فرمایا، جز ایک سفید خچر جو شاہ حبشہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں بھجوایا تھا اور چند تلواروں کے کوئی چیز ترکے میں نہیں چھوڑی۔

عربوں کی ایک یہ رسم بھی تھی کہ جس وقت ایک رئیس قبیلہ وفات پاتا تو اسے اسی جگہ دفن کرتے جس جگہ اس نے جان، جان آفریں کے سپرد کی ہوتی، لہٰذا فیصلہ ہوا کہ محمد ﷺ کو اسی جگہ دفن کیا جائے گا جس جگہ آپ ﷺ نے رحلت فرمائی تھی۔

محمد ﷺ اہلِ مکہ تھے مگر وفات مدینہ میں پائی۔ اب عزیز و اقربا حیران تھے کہ قبر کی کھدائی

مکہ کی رسم کے مطابق ہو یا مدینہ کی طرز پر کھودی جائے۔ مکہ میں قبر عمودی رکھتے اور مردہ کو اس میں رکھ کر قبر کو ڈھانپ دیتے تھے مگر مدینہ میں قبر عمودی کھود کر پھر بغل میں کھدائی کی جاتی تھی اور جسدِ متوفی کو اس بغلی کھدائی میں رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا جاتا تھا۔ بعد ازیں قبر کو مٹی سے پر کر دیا جاتا تھا۔

بالآخر سب نے یہ فیصلہ کیا کہ دو گورکن مکی اور مدنی بلائے جائیں کہ آ کر قبر کھودیں۔ جو گورکن پہلے آ گیا اسی طرز پر قبر کھودی جائے گی۔ مدنی گورکن پہلے پہنچا، لہٰذا قبر مدنی طرز پر کھودی گئی۔

قبر تیار ہو جانے کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ کے جسدِ مبارک کو غسل دیا گیا۔ عربوں میں غسل دینے کی رسم تھی مگر ان علاقوں میں جہاں پانی میسر آتا۔ آپ ﷺ کے جسدِ مبارک سے بوقت غسل احتراماً لباس نہ اُتارا گیا اور جسدِ مبارک کو لباس کے ساتھ ہی غسل دیا گیا۔ اس کے بعد ایک سرخ رنگ کا کپڑا اور بعض روایات کے مطابق سرخ رنگ کے قالین کو جسم اطہر کے اردگرد لپیٹ دیا گیا اور جسدِ مبارک کو قبر کی بغلی کھدائی میں رکھ دیا گیا۔ جسدِ مبارک ایک پہلو پر رکھا گیا اور قبر اس طرح کھودی گئی تھی کہ چہرہ مبارک کعبہ رُخ رہے۔

اس وقت بغلی کھدائی کا منہ بند کر دیا گیا اور قبر کو خاک سے پر کر کے اس پر ایک چھوٹا سا پودا لگا کر پانی دیا گیا تاکہ بڑا ہو کر سایہ کرے۔

عرب مُردوں کو بغیر تابوت کے دفن کیا کرتے تھے۔ وہ جسدِ مردہ کو تابوت میں بند کر کے زیرِ خاک محفوظ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان سے کوئی چیز باقی نہیں رہتی، بجز اُن اعمال کے جو وہ زندگی میں اپنی رُوح کے وسیلہ سے وجود میں لایا تھا۔ دوسری تمام چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔

مسجد میں جب مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ پیغمبر ﷺ اسلام اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں تو وہ آہ و شیون کرنے لگے۔ عمرؓ بن الخطاب مسجد میں گئے اور پکارے: کس لیے آہ و شیون کرتے ہو؟ پھر تلوار نیام سے باہر نکالی اور کہا: جو کوئی یہ کہے گا کہ محمد ﷺ وفات پا گئے ہیں، میں اس کی گردن مار دوں گا۔ ہمارے پیغمبر ﷺ فوت نہیں ہوئے بلکہ آسمانوں میں خداوند کے

پاس گئے ہیں اور جلد ہی واپس آجائیں گے۔

اسی وقت ابوبکرؓ مسجد میں داخل ہوئے اور کہا: اے عمرؓ! رک جاؤ اور اپنی شمشیر کو نیام میں کرلو۔ پھر ابوبکرؓ نے لوگوں سے خطاب فرمایا:

اے مسلمانو! محمد ﷺ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں تمھاری طرح کا ایک انسان ہوں اور ہر انسان کو مرنا ہے خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے پہلے بھی پیغمبر فوت ہوئے ہیں اور ہمارے پیغمبر ﷺ نے بھی رحلت فرمائی ہے۔ ہر وہ شخص جو مسلمان ہے اور محمد ﷺ بن عبداللہ کے پیغمبرِ اسلام ﷺ ہونے پر ایمان رکھتا ہے، جان لے کہ آپ ﷺ فوت ہو چکے ہیں۔ پیغمبر فوت ہو جاتا ہے، اس کے برعکس خداوند ہمیشہ رہنے والا ہے اور ہرگز نہیں مرے گا۔

عمرؓ بن الخطاب نے جب یہ سنا تو زمین پر بیٹھ گئے۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور رونے لگے۔ مسلمان جو چند لحظہ قبل خاموش ہو گئے تھے، پھر رونے لگے۔

اس دارِ فانی سے عظیم ترین مردِ جہاں، محمد ﷺ پیغمبرِ اسلام اس طرح رخصت ہو گئے۔

